دُنیا کے بہترین افسانے

منصور احمد

دنیا کے بہترین افسانے

ترجمہ از

منصور احمد

اسلامک لٹریچر کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۳۱ الاہور

جنوری ۱۹۳۰ء

بلا جلد دو روپے
دم واپسیں دو روپے بارہ آنے
گم گشتہ
خوفناک

مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں طبع ہوئی

فہرست

ہندوستان

لکسر کا مندر

"سُستی کے مارو ذرا سُرعت سے کام کرو" یہ الفاظ عبداللہ نے خالص عربی لہجے میں پُکار کر ان مزدوروں سے کہے۔ جو نشیب میں کھدائی کا کام کر رہے تھے۔ اور پھر موعودہ کہانی سُنانے کے لئے سفید رنگ سیاح کے قریب ٹیلے کی ڈھلوان سطح پر بیٹھ گیا۔ ٹیلے کے دامن سے جہاں مزدور کام کر رہے تھے۔ گرد و غبار کا بادل آگے سے زیادہ گہرا ہو کر اُٹھا۔ اور مصری آفتاب کی روشن شعاعوں نے اس کے کناروں پر سنہری کور ٹانک دی۔ کدالوں اور پھاوڑوں کی آوازیں جلد جلد آنے لگیں۔ مزدوروں نے ایک ساتھ مل کر یہ عربی گیت گانا شروع کیا:۔

"دن کی گرمی نے میرے دل کی آگ کو اور بھڑکا دیا"

"میرا محبوب! آہ اُس نے مجھے چھوڑ دیا"

"مشقت کے بارِ گراں نے میرے دل کو پیس ڈالا"

نیل [illegible]! میرے محبوب نے مجھے چھوڑ دیا"

عبداللہ نے ابھی کہانی شروع نہ کی تھی۔ کہ مزدوروں کی آواز سُن کر اس کی تیز عقاب کی سی آنکھوں میں ایک خواب آلود کیف اور ایک عمیق تخیل کا رنگ جھلکنے لگا۔ جوایر برطانیہ کا سیاح سر چارلس فلکین نہایت دلچسپی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ عبداللہ وہ شخص تھا جس

نے کم وبیش پندرہ سال مصر کی کھدائی کے کام میں گزارے تھے۔ وہ یہاں مزدوروں کے جماعت دار کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ سر چارلس اپنے دل میں سوچ رہا تھا۔ کہ ایسا شخص کسی سیاح کو تحقیق وتفتیش کے سلسلے میں بیسیوں دلچسپ کہانیاں سُنا سکتا ہے۔ لیکن ایسا موقع بہت ہی کم ہوتا تھا کہ عبداللہ اِن لوگوں کے تجسس کے جواب میں، جو آئے دِن لکسر کو دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ کُھل کر باتیں کرے۔ لوگ اکثر اس سے واقفیت پیدا کرنے کے خواہشمند رہتے تھے۔ وہ قدیم بادشاہوں کی ممیوں اور پتھر کی مورتوں کو زمین کی تہ سے نکالنے کے متعلق اس کے سالہا سال کے تجربات معلوم کرنے کے بے حد شائق ہوتے تھے۔ مگر صرف کبھی کبھی کوئی اجنبی اس کے دِل تک رسائی کر کے اسے آزادی سے باتیں کرنے پر آمادہ کر سکتا تھا۔ سر چارلس کے دِل میں یہ وہم بھی جاگزیں تھا کہ قدیم مصر کے دیوتا مختلف طاقتوں کے مظہر تھے۔ اِس کے عِلاوہ اسے ہر مصری چیز سے ایک طرح کی ہمدردی تھی۔ یہی وہ باتیں تھیں جنہوں نے عبداللہ کو یہ وعدہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ کہ وہ سر چارلس کو ایک کہانی سنائے گا۔ جو یقیناً اس کے لئے دلچسپی کا مُوجب ہو گی۔

(۳)

عبداللہ نے ایک بڑا سا سیگار سُلگاتے ہوئے سلسلۂ گفتگو کو یوں شروع کیا:۔

کوئی بارہ سال کا واقعہ ہے کہ ایک اور جماعت دار جو مزدوروں کی ایک دوسری ٹولی پر متعین تھا۔ میرے ساتھ یہاں کام کیا کرتا تھا۔ اِس کا نام تو مٹ ہی چکا ہے، لیکن اگر تم پسند کرو۔ تو گفتگو میں آسانی پیدا کرنے کے لئے میں اِسے حسین کہہ لوں گا۔ وہ کُھدائی کے کام اور اس ترقیات کی نسبت کماحقہٗ واقف تھا۔ اور اُسے زمین کے اندر دبے ہوئے مندروں، اور اِن سے دستیاب شدہ اشیا، کے متعلق کافی عِلم حاصِل تھا۔ وہ ہم جیسا ہی ایک شخص تھا۔ اس کا قد بلند اور اس کا جِسم مضبوط تھا۔ وہ ان عورتوں سے اکثر راہ و رسم پیدا کر لیتا تھا۔ جو اس مقام کو دیکھنے

کی غرض سے آتی تھیں۔ اور لکسر ہوٹل میں جہاں آج کل تم مقیم ہو ٹھہرا کرتی تھیں۔

اسی زمانے میں ایک سراپا حسن ایک خوبی مجسم خاتون اس ہوٹل میں آئی۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ کہ اِن ممالک میں اس درجہ خوبصورت عورت ہم نے آج تک نہیں دیکھی۔ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں اس کا نام بھول چکا ہوں۔ تو یہ میرا ایمان ہے۔ لیکن اگر میں اپنی گفتگو میں اس کو میری کے نام سے پکاروں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے؟

اُس کی شادی ہو چکی تھی۔ لیکن اُس کا خاوند یہاں اُس کے ساتھ نہ آیا تھا۔ وہ اپنے وطن ہی میں تھا۔ اور میرا خیال ہے۔ کہ وہ وہاں سرکاری ہنڈی کی دلالی کا کام کرتا تھا۔ وہ یقیناً بہت امیر آدمی ہو گا۔ کیونکہ میری کا لباس ہمیشہ نہایت اعلےٰ درجہ کا ہوا کرتا تھا۔ اور جو لباس وہ شام کے وقت زیبِ بدن کرتی تھی۔ اس میں صرف وہ ہار جو اُس کی سفید نورانی گردن کو زینت دیتا تھا۔ چار ہزار پونڈ کی مالیت کا تھا۔

دس سال کا عرصہ ایک آدمی کی زندگی کا معتدبہ حصہ ہوتا ہے۔ لیکن آج بھی میں یہاں بیٹھ کر میری کا تصور کرتا ہوں تو اُس کی صورت مجھے اتنی صاف نظر آتی ہے جیسے تم میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہو۔ اس کی طبیعت تمہارے مُلک کی چُلبلی اور عشوہ طراز عورتوں سے بالکل مختلف تھی۔ اُسے تنہائی اور سکون پسند تھا۔ اُسے آفتاب کی گرمی اور روشنی میں پھولوں کے رنگ و بُو میں اور دریائے نیل کی اُس تمام زندگی میں جو ہوٹل کے باغ میں سنگترے کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر نظر آتی تھی، بے انتہا لطف آتا تھا۔

اس کے بال نہایت خوبصورت، نرم، گھنے اور سنہری رنگ کے تھے۔ اور وہ اُنہیں نہایت سادگی سے اپنے سر کے قریب گوندھ لیا کرتی تھی...... ہاں اور ابھی اُس وقت تک تمہاری عورتوں نے اپنی وضع و قطع لڑکوں کی سی بنانے کی دُھن میں اپنے بالوں کو ترشوانا شروع نہیں کیا تھا......

اور اُس کی آنکھوں میں ایک حیا پرور سکون جھلکتا تھا +

یوں تو لکسر میں اُسے سب چاہتے تھے۔ لیکن حسین کو اُس کی ہر ادا پسند تھی۔ میری کے پاس کتابوں کا جتنا ذخیرہ موجود تھا۔ تمام کا تمام مصریات پر مشتمل تھا۔ اور ہر روز حسین...... شاید میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ کہ حسین بھی میری طرح مصریات میں کافی دستگاہ رکھتا تھا۔ اور ہم دونوں اکثر ان دنوں ہوٹل میں جایا کرتے تھے .... ہاں میں کہہ رہا تھا۔ کہ ہر روز حسین اُسے ہوٹل کی کشتی میں بٹھا کر دریا کے پار لے جاتا تھا۔ اور وہاں سے یہ دونوں کرائے کے گدھے لے کر اس طرف روانہ ہو جاتے تھے۔ جہاں سلاطین کے مقابر واقع ہیں۔ حسین ایک سمجھدار آدمی تھا۔ اور اگر ایک عورت کو بجائے کسی ایسے نا اہل ترجمان کے جسے انگریزی زبان کے ایک آدھ درجن لوٹے پھوٹے الفاظ یاد ہوں۔ اور جس کی ہتھیلی چند ٹکوں کی خاطر ہر وقت کھجلاتی رہتی ہو۔ کوئی ایسا رہبر مل جائے، جو قابل، خوبصورت اور نوجوان ہونے کے علاوہ اُس کے مضمون سے بھی مس رکھتا ہو تو کیا وہ اُس کو ہاتھ سے جانے دیگی ؟

یہاں ایک بوڑھا پروفیسر بھی رہا کرتا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے ”پے پارس آف دی ہائی پریسٹ سنے بب“ کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی تھی ...... وہ ان دنوں یہاں قرنا کے چٹانی مقبروں کے کتبے نقل کیا کرتا تھا۔ اِسی نے پہلی مرتبہ میری توجہ کو اس طرف پھیرا کہ واقعات کچھ اور رنگ اختیار کر رہے ہیں۔ میری، پروفیسر اور میں ایک شام کو غروب آفتاب کے قریب ہوٹل کے باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور مصر کے قدیم دیوتاؤں کی طاقت و قدرت کے متعلق باتیں کر رہے تھے +

میری نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے۔ کہ قدیم مصری لوگ بڑے مذہبی تھے۔ دیکھو۔ اُنہوں نے آمون را آتور اور دوسرے دیوتاؤں کے مندر کس قدر عظیم الشان بنا رکھے ہیں“ +

پروفیسر نے کہا۔ ”مذہب سے تو ان کو کچھ واسطہ ہی نہ تھا۔ یہ سب کچھ جو تم دیکھ رہے ہو۔ اُنہوں نے نمود و نمائش کے لئے بنا رکھا تھا۔ جو دیوتا انہوں نے منتخب کر رکھے تھے۔ اُن کا مرتبہ دنیائے الوہیت

میں کچھ بلند نہ تھا۔ اُن کی توجہ زیادہ تر صرف انہی دیوتاؤں کی طرف تھی۔ جو بدی کے مظہر تھے۔ اور وہ ڈر
ان کے خوف سے متاثر ہو کر ان کو مانتے تھے۔ مثلاً سخمت۔ یہ وہ دیوی ہے۔ جس کا سر ببرنی کا ہے۔
اور جسے لڑائی فساد کا مظہر سمجھتے ہیں۔ تم اس پر یقین کرو۔ یا نہ کرو۔ لیکن آج تک فلاحین کی عورتیں اپنی
تکالیف کو سخمت دیوی کی طرف منسوب کرتی ہیں"۔

اس سخمت کے متعلق جس کے ہاتھ میں مرد اور عورت کی ازدواجی زندگی کو کامیاب یا ناکام بنانے
اور اُن کے درمیان محبت یا نفرت قائم کرنے کا اختیار تسلیم کیا جاتا ہے۔ شاید تمہیں کچھ زیادہ معلومات حاصل
نہیں۔ قصبۂ کارنک تو تم نے دیکھا ہے۔ وہیں پتاہ کے مندر کے ایک سنسان گوشہ میں ایک اور چھوٹا
سا مندر ہے۔ اسی مندر میں بھورے رنگ کے پتھر سے بنی ہوئی سخمت دیوی کی مہیب مورت رکھی
ہے۔ یہ ایک نہایت تاریک اور بھیانک جگہ ہے۔ جہاں روشنی کا کبھی گزر نہیں ہوا۔ مگر چودھویں رات
کو جب چاند اپنی پوری تابانی سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ چاندنی کی کچھ کرنیں چھت کے ایک سوراخ سے
چھن کر اندر آجاتی ہیں۔ فلاحین مصر کی عورتیں اب بھی اس مندر میں آتی ہیں۔ اور سخمت دیوی سے
کبھی بیٹا مانگتی ہیں۔ اور کبھی اپنے شوہر کے دِل کو اسیرِ محبت کرنے کے لئے دعائیں کرتی ہیں۔

پروفیسر نے کہا" خدا بچائے۔ اس جگہ جا کر تو انسان خوف و ہراس سے کانپ جاتا ہے۔
ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ اور ان دنوں میں ابھی جوان ہی تھا۔ کہ میں اپنی ایک عورت دوست کے ساتھ
وہاں چلا گیا۔ چاندنی کی کرنیں چھت میں سے چھن چھن کر دیوی کی مورت پر پڑ رہی تھیں۔ اور اس
کی مہیب وحشیانہ آنکھیں نہایت درشتی سے ہمیں گھور رہی تھیں۔ جنہیں دیکھ کر وہ اس قدر خوف زدہ
ہوئی کہ اُسے غش آگیا"۔

یہ سُن کر میری کے سمندِ شوق پر ایک اور تازیانہ لگا۔ تمہیں معلوم ہی ہے۔ کہ تمہاری گوری عورتیں
جب سنسنی پیدا کرنے والی کوئی نئی بات سنتی ہیں۔ تو بے طرح اُس کے دیکھنے کے درپے ہو جاتی ہیں۔

میری نے کہا۔ "اوہ! عجیب منظر ہوگا۔ لیکن اس کے تصور سے بدن میں خون سرسرانے لگتا ہے۔"

پروفیسر کی باتیں سُن کر اس کا شوق انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ اور اس وقت اس کے دل میں اس خواہش کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کہ کوئی اسے قصبۂ کارنک میں سحمت کا مندر دکھانے کے لئے اپنے ساتھ لے جائے۔ اُس نے کہا۔ "دو دن میں چاند پُورا ہو جائے گا۔ اور اگر ہم اُس رات وہاں جائیں تو کتنا پُرلطف منظر دیکھنے میں آئے۔ پروفیسر! مجھ سے وعدہ کرو۔ کہ تم مجھے ضرور وہاں لے چلوگے۔"

بوڑھے پروفیسر نے کہا۔ "نہیں۔ میں ایسی بات ہرگز نہ کروں گا۔ کیونکہ مجھ کو معلوم ہے۔ کہ تم بھی وہاں جا کر یہی دُعا کروگی۔ کہ دیوی مجھے مسحور کردے۔ اور جس طرح اب ہوٹل میں ہر شخص تمہارا مشتاق نظر آتا ہے۔ میں بھی تمہاری محبت میں گرفتار ہو جاؤں گا۔"

پروفیسر کی گفتگو کے دوران میں میری نظر میری پہ جمی ہوئی تھی۔ یکایک اس کے چہرے پر ایک تغیر نمایاں ہوا۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے اس کے دل میں مسرت کا ایک طوفان اُمنڈ پڑا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک جُنبش سی ظاہر ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو گئی۔ اُس کے تنفس میں بھی تیزی محسوس ہونے لگی۔ میں نے مُڑ کر پیچھے کو دیکھا کہ یہ انقلاب کیوں پیدا ہو گیا۔ تو میں نے اپنی کرسی کے پیچھے حسین کو کھڑا پایا۔

حسین نے کہا۔ "خاتون صاحبہ! مجھے آپ کے لئے ایک نہایت اعلےٰ درجہ کا گُلدان مل گیا ہے اور میں اُسے بوڑھے محاسب کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ آپ ذرا دوکان پر چل کر دیکھ لیجیے۔"

دن کی روشنی ہر لحہ مدھم ہو رہی تھی۔ لیکن غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں میں میں نے دیکھ لیا۔ کہ میری نے حسین کی طرف کن نظروں سے دیکھا ہے۔ وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ اور ہمیں کھجور کے درختوں میں سے دُور تک میری کا فراک چمک چمک کر نظر آتا رہا۔ ابھی وہ ہماری

نظروں سے بالکل غائب نہ ہوئے تھے۔ کہ میری نے اپنا بازو حسین کے بازو میں ڈال دیا +

"یہ مصر ہے"۔ بوڑھا پروفیسر جس نے اس ملک کو تیس سال سے خوب دیکھا تھا۔ اپنے سفید سر کو جنبش دے کر بولا "مجھ کو ہوا میں سے فسوں کاری کی بو آتی ہے" +

اُسی رات جب حسین اور میں لکسر کے مندر کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ اس نے مجھ سے اپنے دل کی بات کہی۔ وقت آدھی رات سے کچھ زیادہ گزر چکا تھا۔ میں نے حسین سے کہا "آؤ اب کیمپ کو چلیں۔ نیند بہت ستا رہی ہے" +

حسین نے کہا "آہ! جس کی آنکھیں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی بند نہ ہوئی ہوں اُسے نیند سے کیا واسطہ ہے"۔ یہ الفاظ اُس نے کچھ اس طرح کہے گویا کوئی دم میں اُس کی آواز اُس کے گلے میں بند ہو کر رہ جائے گی۔ اس نے کہا "عبداللہ! میں تم کو کچھ زیادہ عرصہ سے نہیں جانتا۔ مگر مجھے تم سے ایک طرح کا اُنس ہے۔ اور میں مجبور بھی ہوں۔ کہ میں اپنا راز کسی نہ کسی کو ضرور بتاؤں۔ مجھے بتاؤ! ایسا آدمی کیا کرے۔ جو کسی بیاہی ہوئی عورت کی محبت میں اسیر ہو گیا ہو؟"

اگر یہی بات وہ مجھ سے دس سال کے بعد یعنی آج پوچھتا تو غالباً میں اس کو اس کا علاج بتا سکتا۔ لیکن اُن دنوں میں نوجوان اور ناتجربہ کار تھا۔ میں نے جواب دیا "میرا خیال ہے کہ سب کچھ عورت کی مرضی پر منحصر ہے" +

اُس نے کہا "وہ اپنی پہلی شادی میں خوش ہے۔ کیونکہ وہ اکثر مجھ سے اپنے خاوند اور بچوں کی باتیں کیا کرتی ہے۔ اُس نے مجھ سے یہ بھی کہا ہے کہ اُسے مجھ سے ایک طرح کا اُنس ہے۔ لیکن ایسا جو ایک دوست کو دوسرے دوست سے ہوتا ہے۔ بتاؤ! ایسی محبت مجھے کیا نفع دے سکتی ہے؟ اُس کی اُس محبت نے جو میرے دل میں ہے، میری صبح اور میری شام کو بے چینی اور اضطراب سے معمور کر رکھا ہے۔ اُس کی دل رُبا صورت ہر وقت میرے سامنے رہتی ہے۔ لیکن آہ اُس کی یہ دل رُبائی

مجھے کسی وقت چین نہیں لینے دیتی۔ وہ ایک ایسی مہک میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ جو جنگل کی اُس تازگی اور شگفتگی میں سے آئے جس پر مینہ برس کر کھل چکا ہو۔ اور یہ مہک میرے مشامِ جاں کو مسرت سے لبریز کر دیتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ہر وہ گھڑی اور ہر وہ لمحہ جس میں ہم دونوں یہاں کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ ہمیں اُس دن سے قریب تر لا رہا ہے۔ جب ہمیں ایک دوسرے سے جُدا ہونا پڑے گا۔ وہ دن جب اُسے اپنے خاوند کی آغوش میں واپس جانا ہو گا۔ اور میں آہ میں . . . .‘‘

اِس کی گفتگو کا سلسلہ یہاں منقطع ہو گیا۔ اور اس کی نظر تاروں بھرے آسمان کے نیچے تمام ظلمتوں کو چیرتی ہوئی دریا اور پہاڑیوں کے پار پہنچ گئی۔

مَیں نے پوچھا ’’کیا تم نے کبھی اپنی محبت کا ذکر اُس سے کیا ہے‘‘؟

حسین نے اپنا سر ہلا کر کہا ’’نہیں‘‘۔

مَیں نے کہا ’’تو پھر تمہیں اُس سے پہلو تہی کر لینا چاہئیے‘‘۔

حسین نے کہا ’’ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے‘‘۔ اُس کے بعد ہم وہاں سے واپس آ گئے۔

تم جانتے ہی ہو۔ کہ اچھی نصیحت کا کیا حشر ہُوا کرتا ہے۔ دوسرے ہی دن مَیں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ حسین اور وہ خاتون ایک گاڑی میں بیٹھ کر کارنک روڈ سے گزر رہے ہیں۔

(۳)

گرم ہوا کا ایک طُوفانی جھونکا اُٹھا۔ اور تمام وادی کا گرد و غبار سمیٹتا ہُوا ہماری طرف بڑھا۔ اور پھر کھدائی کرنے والے مزدوروں پر اس طرح چھا گیا۔ کہ ان کی شکلیں مشکل سے نظر آتی تھیں۔ لیکن اُن کی آوازیں گرد و غبار کے اِس بادل کو چیر چیر کر اب بھی ہم تک پہنچ رہی تھیں:۔

’’میں دِل رنجی اور درماندگی کی حالت میں مشقت سے اُکتا گیا ہوں‘‘۔

"آہ! میرے محبوب نے مجھے چھوڑ دیا"۔

عبداللہ اب خاموش تھا۔ اُس کی نگاہ اُس ندی پر جمی ہوئی تھی۔ جو وادی کے سرسبز دامن میں نیلے رنگ کی کور کی طرح لہراتی ہوئی چلی گئی تھی +

سر چارلس نے پوچھا ۔"اور پھر"؟

عبداللہ نے اپنی کہانی پھر شروع کی :۔ حسین میری نصیحت پر عمل کرنے کے لئے آمادہ تھا۔ وہ مجھ سے اس بات کا وعدہ کر چکا تھا۔ لیکن دیکھو۔ تقدیر غریب انسان کے ساتھ کیا کیا داؤں کھیلتی ہے دوسرے دِن میری خود اُس کے ہاں آگئی۔ اور بصد منت اُس سے کہنے لگی۔ کہ وہ اُسے سخمنت کے مندر میں لے چلے۔ حسین نے عذر کیا کہ اُس کو قاہرہ جانا ہے۔ اور اس لئے وہ اُس کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ لیکن میری نے ایک نہ مانی۔ اور کہا کہ جس طرح بھی ہو سکے، تم چوبیس گھنٹے کے لئے اپنی روانگی کو ملتوی کردو۔ کیونکہ تمہارے سوا میں کسی کے ساتھ وہاں جانا نہیں چاہتی +

پھر بھی حسین نے نہایت استقلال کے ساتھ اپنے آپ کو میری کے ہاں جانے سے روکے رکھا۔ اور تمام دِن وہ ایک دُوسرے سے نہ ملے۔ لیکن وہ قاہرہ بھی نہ گیا۔ دُوسری شام کو وہ پھر اُس کے پاس آئی۔ ابھی کھانے کا وقت نہ ہوا تھا۔ حسین بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میری نے پوچھا۔ کہ آخر مجھ سے کیا خطا سرزد ہوئی۔ کہ تم مجھ سے یوں اجتناب کر رہے ہو۔ بس اِس فقرے نے قیامت کر دی۔ حسین سب کچھ بھول گیا۔ اُس کے دل میں اب اِس کے سوا اور کوئی آرزو نہ تھی۔ کہ میری اپنے رنج کو بھول جائے۔ اُس نے اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ اگر تم چاہو۔ تو آج رات میں تمہیں کارنک لے جانے کے لئے تیار ہوں۔ میری نے اپنے ہاتھوں کو اُس کے ہاتھوں میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ گویا وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ کہ اُس نے اُس کے قصور کو مُعاف کر دِیا۔ اس کے بعد وہ واپس چلی گئی۔ اور ہوٹل والوں کو اس نے حکم دیا۔ کہ فوراً ایک گاڑی

تیار کی جائے۔ اور اس کے اندر کھانا اور ایک ناند میں برف لگا کر پانی کی چند بوتلیں رکھ دی جائیں۔ چاند مشرق سے طلوع ہو رہا تھا۔ کہ وہ دونوں کارنک کی سیر کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ دور سے گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جو مقدس جھیل کے کناروں پر چیخ رہے تھے۔

اُس رات وہ اُس کے ساتھ بڑی ملاطفت اور مہربانی کے ساتھ پیش آئی۔ بلکہ اُس رات اُس نے اپنے خاوند اور بچوں کا بھی ذکر نہ کیا۔ وہ حسین کو اِس ڈھب پر لے آئی کہ وہ اُسے اپنی ذات کے متعلق باتیں سنائے۔ اور اُن عورتوں کی نسبت کچھ بتائے۔ جن سے اُس نے اپنی زندگی میں محبت کی ہے۔ وہ زندگی کی حقیقت اور محبت کے فلسفے پر بحث کرتے رہے۔ وہ اپنے اپنے خیال کے مطابق بتاتے رہے۔ کہ سچی خوشی کہاں میسر آ سکتی ہے۔ غرض کہ جو مہمل اور لغو بحث دو مختلف قوموں کی دو نادان ہستیاں جن کی دُنیا کو پیدا ہوئے ابھی بہ مشکل تیس برس گزرے ہوں گے۔ ایک خوشگوار سہانی رات سے متاثر ہو کر جس میں چاند کا سُنہری فانوس بھی سر پر لٹک رہا ہو، کر سکتی ہیں۔ اُنہوں نے فروگزاشت نہ کیں۔

حسین نے مجھے بتایا۔ کہ ہم دونوں نے پائی لون پر بیٹھ کر اپنا مختصر سا کھانا کھایا۔ اور ایک دوسرے سے اِس طرح باتیں کرتے رہے۔ جس طرح دو پُرانے دوست کرتے ہیں۔ کیونکہ حسین میری سے اپنے دِل کو چھپانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ جب کھانا ختم ہو چکا۔ تو اس نے میری کا بازو پکڑ لیا۔ اور ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں سے جن پر عظیم الشان دروازے کے سائے نے اندھیرا ڈال رکھا تھا، اُترنا شروع کیا۔ چاند اپنی پوری تابانی سے جلوہ گر تھا۔ اور اس میں ہیپوسٹائیل ہال کے رفیع و عظیم ستون دِل پر ہیبت طاری کر رہے تھے۔ اسی لئے وہ اُن فلک بوس ستونوں میں سے خاموشی کے ساتھ گزرتے چلے گئے، جن کے اُوپر تاروں بھرا آسمان ایک زرنگار چھتر کی طرح چمک رہا تھا۔

جب وہ آموں کے مندر سے گزر رہے تھے۔ اُس وقت حسین کے جسم میں خون نے ایک ہیجان برپا کر رکھا تھا۔ اُس کا دِل میری کی محبت سے سینے میں بلیوں اُچھل رہا تھا۔ شاید اِسی لئے

میرتی نے اپنا بازو اُس کی گرفت سے نہ چھڑایا۔ اس وقت حسین کی زبان میں بولنے کی طاقت نہ تھی، اور نہ اُسے اتنی جرأت ہوتی تھی کہ وہ اُس کی طرف دیکھ ہی سکے۔ میرتی کے بازو کی گرمی نے اُس کے خُون کو کھولا دیا تھا۔ اور وہ بے اختیار اُسے اپنی آغوش میں لے کر اپنے دِل میں بٹھا لینا چاہتا تھا۔

اِسی حالت میں وہ سخمت کے مندر تک آپہنچے۔ جو ایک چھوٹے سے صحن سے گزر کر پتاہ کے معبد کے ساتھ ہی واقع ہے۔ مندر کا ایک محافظ چراغ لے کر جھٹ وہاں آ پہنچا۔ لیکن میرتی نے اسے پانچ پیاسٹر کا ایک سِکّہ دے کر رخصت کر دیا۔ ستونوں کے سایوں نے اُسے جلد ہی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اور وہ دونوں اکیلے سخمت کے مندر میں داخل ہو گئے۔

پروفیسر نے درست کہا تھا۔ یہ واقعی ایک نہایت وحشت انگیز جگہ ہے۔ ایک چھوٹا سا تاریک کمرہ ہے، جس کی دیواریں پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ اور چھت بہت اُونچی ہے۔ داخل ہوتے ہی مقابل کی دیوار کے سامنے دیوی کی گھورتی ہوئی مُورت نظر پڑتی ہے۔ چھت میں چار سُوراخ ایک چوکور کی شکل میں بنائے گئے ہیں۔ جو چاند کی کرنوں کا شکار کرنے کے لئے دام کا کام دیتے ہیں۔ اُس رات دیوی کے چہرے کو ایک چمکتی ہوئی شعاع پڑ کر نمایاں کر رہی تھی۔ دیوی ببری کی طرح اپنا سر اُٹھائے کھڑی تھی، جس پر قرص آفتاب کا تاج رکھا تھا۔ اس کے دونوں نوکیلے کانوں کے درمیان ایک ناگن اپنا پھن پھیلا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی دو چھوٹی چھوٹی بے رحم آنکھیں، اُس کی بے ڈھب چوڑی ناک اور اس کا گلپھوں والا خوفناک مُنہ جس میں سے اس کے پھاڑ کھانے والے تیز دانت چمک رہے تھے، جسم پر لرزہ طاری کر دیتے تھے۔ اس کا قد حسین کے قد سے نکلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور حسین کا قد چھ فٹ تین اِنچ سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ بھوری چٹان کی طرح دیوی کا رنگ بھی بھورا تھا۔ اور چاند کی کرنیں اس کی خونخوار پتھریلی آنکھوں پر پڑ پڑ کر ان میں جان ڈال رہی تھیں۔

میرتی نے جب بُت کی شکل دیکھی۔ تو زور سے ایک مرتبہ سانس لیا۔ پھر اس نے حسین

کا بازو چھوڑ دیا۔ اور دیوی کے پاس جا کر اپنا ہاتھ اس کے اُس سرد ہاتھ پر رکھ دیا۔ جس میں اس نے ایک نیزہ تھام رکھا تھا۔ چھت کے سوراخ میں سے جو شعاع اندر آرہی تھی۔ اب اس کے چہرے پر بھی پڑنے لگی۔ حسین میری کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں چاند کی کرنوں میں چمک رہی ہیں۔ وہ ذرا کانپ کر پیچھے ہٹی۔ پھر اُس نے حسین کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ایک دُوسرے سے ملیں ؛

میری نے کہا " میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ڈر گئی ہوں " اُس نے اپنا ہاتھ حسین کی طرف پھیلایا حسین نے جوش کے ساتھ اُسے پکڑ لیا۔ اور ایک لمحہ بعد وہ اُس کی آغوش میں تھی ؛

"میری آہ میری تمہاری محبت نے میرے دِل کو بے قابو کر دیا ہے۔

" حسین پیارے حسین تمہاری محبت میرے دل کے انتہائی گوشوں میں سرایت کر چکی ہے !"

یہ کہکر اُن دونوں نے شعاعِ ماہتاب کے اُس سائے میں جو ایک جو سے سیال کی طرح دیوی کے مُنہ کو دھو رہی تھی۔ ایک دُوسرے کو بوسہ دیا ؛

وہ دونوں ابھی جدا نہ ہوئے تھے۔ کہ یکایک حسین کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ اُس نے زور کے ساتھ اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ میری نے پریشانی کے عالم میں اس کی طرف دیکھا۔ حسین کی آنکھوں میں درد و کرب کا نہایت گہرا اثر نظر آرہا تھا۔ اور وہ اُس ہاتھ سے جسے اُس نے جھٹک کر علیحدہ کر لیا تھا، دیوی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میری نے جلدی سے مُڑ کر دیکھا۔ تو اُسے ایک لمبا سیاہ جسم دیوی کی پُشت کی طرف سرکتا ہؤا نظر آیا ؛

میری نے کہا " حسین۔ میرے پیارے حسین یہ کیا تھا ؟"

حسین نے جواب دیا " سانپ " اور اپنا بایاں ہاتھ باہر نکال کر دکھایا۔ ہتھیلی کے کنارے پر چھوٹی اُنگلی کے عین نیچے لہو کے دو رُمانی قطرے لٹک رہے تھے۔ حسین نے نیند بھری آواز

یں کہا۔" اگر کوئی سنے تو یہی کہے۔ کہ میری ممتیں مجھ سے بچانے کے لئے سمت نے اس سانپ کو بھیجا تھا۔" زہر کے اثر سے بے ہوشی حسین پر غلبہ پا رہی تھی۔ اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میری چیخیں مارتی ہوئی اُسے گھسیٹ کر باہر تازہ ہوا میں لے آئی۔ اُن کے پیچھے دیوی کی خونخوار آنکھیں مندر کی تاریکی کو چیر چیر کر ان کو گھور رہی تھیں۔

(۴)

عبداللہ یہاں ٹھیر گیا۔ اُس کا سگار بجھ گیا تھا اس لئے اُس نے اُسے اپنے گرد آلود کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

سر چارلس نے جس کی پیشانی پر ہراس آمیز خیالات نے ایک گرہ سی ڈال دی تھی۔ پوچھا "تو کیا پھر حسین مر گیا؟"

عبداللہ نے کہا۔" نہیں وہ مرا نہیں۔ بلکہ پاس ہی کھنڈروں میں کچھ امریکن کھانا کھا رہے تھے۔ جو اُسے فوراً ہوٹل میں واپس لے گئے۔ اور ڈاکٹر نے اس کے زخم پر عمل جراحی کیا۔ بات تو بہت خطرناک تھی۔ لیکن حسین نوجوان اور تنومند تھا۔ اِس لئے وہ اس پر غالب آ گیا۔

سر چارلس نے پوچھا۔" اور وہ عورت؟"

عبداللہ نے کچھ دیر تامل کیا۔ پھر بولا۔" اُس نے اُس نصیحت پر عمل کیا۔ جو مَیں نے حسین کو کی تھی۔ جب حسین کی زندگی کو کوئی خطرہ نہ رہا۔ اور اِس کا علم اسے دُوسرے ہی دِن ہو گیا تھا۔ کیونکہ ایسے حالات میں موت وزیست کا فیصلہ بہت جلد ہو جایا کرتا ہے۔ اُس نے حسین سے مِلے بغیر ہوٹل کو چھوڑ دیا۔ اور جہاں تک مجھے عِلم ہے۔ حسین نے بھی اُسے پھر کبھی نہ دیکھا۔"

عبداللہ نے ایک سرد آہ بھری۔ اور اپنے سر کو ایک یاس آمیز انداز سے ہلایا۔ پھر خیالات کے ہجوم میں کچھ کھو سا گیا۔ اور اپنی نرم اور شیریں عربی زبان میں اُس نے یہ الفاظ کہے:۔

"غریب حسین! آہ اُس کی زندگی اُس کے لئے ایک بارِ گراں ہو گئی"۔

اِس کے بعد وہ پھر خیالات میں گم ہو گیا۔ نشیب سے کھدائی کرنے والے مزدوروں کے گانے کی آواز برابر آرہی تھی:۔

"میرا دِل میرے سینے میں مُردہ ہو چکا ہے"

"آہ میرے محبوب نے مجھے چھوڑ دیا"

"میں اس کی شعاع ریز آنکھیں پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گا"

"آہ! میرے محبوب نے مجھے چھوڑ دیا"

عبداللہ نے تھکے ہوئے انداز میں سہارا لے کر اُٹھنے کے لئے اپنا بڑا سیاہ ہاتھ زمین پر ٹیک دیا۔ سر چارلس نے دیکھا۔ کہ اُس کی ہتھیلی کے کنارے پر چھوٹی اُنگلی کے نیچے اُودے رنگ کے دو نشان پڑے ہوئے ہیں۔ اور دونوں نشانوں کو ایک لکیر آپس میں ملا رہی ہے +

مسٹر چارلس کے ماتھے پر جو بادل چھا رہے تھے۔ وہ چھٹ گئے۔ اور اس کی آنکھوں میں مسرت کی روشنی جھلکنے لگی۔ مِصری جماعت دار کے ساتھ مصافحہ کرنے کے لئے جو اب پھر مزدوروں کو ڈانٹ بتا رہا تھا۔ وہ بھی اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اور کہنے لگا "میرے دوست! میں نے یہ کہانی آج دوسری مرتبہ سُنی ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ میری جس کا تم نے ذِکر کیا ہے۔ میری بیوی کی ایک ایسی ہی سہیلی ہے جیسے حسین تمہارا دوست تھا۔ اور میں اُس خاتون کے خاوند کو جو جزائر برطانیہ میں سرکاری ہُنڈی کا دلال ہے۔ اور جو اتفاق سے میرا بڑا گہرا دوست ہے، بتا دوں گا۔ کہ جو کچھ ہُوا بہتر ہُوا۔ اور اِس کے لئے اُسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے"+

اِسکے بعد اُس نے نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ سلام کے لئے اپنے سر کو جُھکایا۔ اور پھر ٹیلے سے نیچے اُترنا شروع کر دیا +

"اے۔ کے۔ کے"

ذرّاتِ مُضطرب

میں اور میرے چند عزیز اور رشتہ دار پوجا کے سفر سے واپس کلکتہ جا رہے تھے۔ کہ ہماری اُس شخص سے گاڑی میں ملاقات ہوئی۔ وضع ولباس سے تو پہلے ہم یہ سمجھے کہ وہ کوئی شمالی علاقہ کا مسلمان ہے۔ مگر جب ہم نے اُس کی باتیں سنیں تو ہم حیران رہ گئے۔ ہر موضوع پر وہ اِس تیقن کے ساتھ گفتگو کرتا تھا کہ اگر کوئی اس کو سنے تو یہی سمجھے کہ شاید دنیا جہان کو آراستہ ومنظم کرنے والا خدا بھی ہمیشہ اور ہر بات میں اس شخص سے مشورہ لے کر کام کرتا ہو گا۔ اودھر اب تک ہم ہر قسم کے فکر و غم سے آزاد تھے، کیونکہ ہمیں علم ہی نہ تھا کہ دنیا میں کون کون سی نادیدہ و ناشنیدہ طاقتیں کارفرما ہیں ہمیں خبر نہ تھی کہ پروسی بڑھتے بڑھتے ہمارے قریب آگئے ہیں، انگریزوں کی گہری اور پُراسرار چالوں سے ہم ناواقف تھے۔ اور ہمیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دیسی ریاستوں کی تباہی وبربادی کا زمانہ قریب آپہنچا ہے۔ ہمارے نئے دوست نے مُسکراتے ہوئے حرافانہ انداز سے کہا "میرے دوست! آسمان اور زمین میں بعض ایسی باتیں بھی ظہور میں آتی ہیں جن سے تمہارے اخبارات کے صفحات بے بہرہ رہتے ہیں۔" چونکہ ہم اس سے پہلے کبھی اپنے گھر سے باہر نہ نکلے تھے۔ اس لئے اُس شخص کی وضع وگفتگو نے ہماری زبانوں پر مہر سکوت لگادی۔ کتنا ہی عام اور معمولی سے معمولی موضوع کیوں نہ ہو، وہ اس پر مختلف علوم کی رُو سے بحث کرتا، ویدوں سے حوالے دیتا یا کسی ایرانی شاعر کی رباعیات پڑھتا اور چونکہ ہمیں اِن علوم اور کتبِ مقدسہ کے جاننے کا یا اپنی فارسی دانی کا کوئی دعویٰ نہ تھا اس لئے ہمارے دلوں میں اُس کی بزرگی کا نقش گہرا ہوتا چلا گیا۔ میرے عزیزوں میں ایک جنہیں تصوّف سے شغف تھا یہ سمجھنے لگے کہ اس شخص کے قبضہ میں ضرور کوئی غیر معمولی روحانی قوت ہے۔ وہ ہمارے

اس عجیب و غریب ہم سفر کے فرسودہ سے فرسودہ خیالات کو نہایت توجہ سے سنتے اور پوشیدہ طور پر اس کی گفتگو کے بعض فقرات قلمبند بھی کرتے جاتے۔ میرا خیال ہے۔ کہ اُس نے اُن کی یہ حرکت دیکھ لی اور اِس پر کسی حد تک مسرور بھی ہوا۔

جب گاڑی مقامِ اتصال پر پہنچی تو ہم تبدیلی کے لئے ویٹنگ روم میں جمع ہو گئے۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ اور چونکہ لائنوں کی خرابی کی وجہ سے ہماری گاڑی کے دیر میں آنے کا احتمال ظاہر کیا جا رہا تھا۔ اس لئے میں نے میز پر اپنا بستر بچھا دیا اور لیٹنے کے قریب ہی تھا۔ کہ اس حیرت انگیز انسان نے اپنی کہانی شروع کر دی۔ بلاشبہ میں اس رات آنکھ نہ جھپک سکا۔

جب چند انتظامیہ مسائل پر اختلاف ہو جانے کی وجہ سے میں نے اپنی جونا گڈھ کی ملازمت ترک کر دی اور نظامِ حیدر آباد کی ملازمت میں شامل ہو گیا۔ تو انہوں نے مجھے مضبوط اور نوجوان دیکھ کر جھٹ بیرچ میں کپاس کے محصول کی کلکٹری پر متعین کر دیا۔

بیرچ ایک خوبصورت مقام ہے۔ یہاں ایک ندی تنہا پہاڑیوں کے نیچے جنگلوں کے پتھریلے راستوں سے شور مچاتی اور کنکروں کو بجاتی اِس طرح چلتی ہے، جیسے کوئی طرار رقاصہ سبک خرامی کر رہی ہو۔ دریا سے کوئی ڈیڑھ سو سیڑھیوں کی بلندی پر اور پہاڑی کے دامن میں سنگِ مرمر کا ایک تنہا محل کھڑا ہے۔ اِس کے آس پاس کوئی انسان نہیں رہتا ـــــــــ بیرچ کا گاؤں اور کپاس کی منڈی یہاں سے فاصلہ پر واقع ہیں۔

تقریباً ڈھائی سو سال گزرتے ہیں کہ شہنشاہ محمود ثانی نے یہ تن تنہا محل یہاں اپنے عیش و عشرت کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ اُس کے عہد میں یہاں فواروں میں سے گلاب کی دھاریں اُچھلتی تھیں اور پانی کی ہلکی ہلکی موجوں سے دھوئے ہوئے کمروں کے ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر نوخیز ایرانی لڑکیاں

نہانے سے پہلے اپنے بال کھول کر بیٹھتی تھیں، اور اپنے نرم نرم برہنہ پیروں سے شفاف پانی کے حوضوں میں چھینٹے اڑاتی تھیں اور بربط کی دھن پر اپنے تاکستانوں کے نغمے گاتی تھیں +

فوارے اب نہیں اُچھلتے، نغمے خاموش ہو چکے ہیں، وہ برف جیسے سفید پاؤں بھی اب اِس برفانی مرمر کو اُس انداز و ادا سے نہیں چھوتے۔ یہ جگہ اب ہم جیسے تنہائی کے ماروں اور بیوی بچوں کی صحبت سے محروم محصولیوں کی قیام گاہ بنی ہوئی ہے۔ کریم خاں جو ہمارے دفتر کا ایک محرّر ہے مجھے ہمیشہ اس مقام کو اپنا مسکن بنانے سے منع کیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا "دِن تم شوق سے یہاں گزارو لیکن رات کبھی بسر نہ کرنا۔" میں ہنسی میں بات ٹال دیا کرتا۔ ملازمین نے کہا "ہم گھری شام تک تو کام کیا کریں گے لیکن رات کو چلے جایا کریں گے۔ میں نے اِسے جھٹ منظور کر لیا۔ یہ مکان ایسا بدنام ہو چکا تھا کہ اندھیرا چھا جانے کے بعد چوروں کو بھی یہاں بھٹکنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔

پہلے پہل اس سنسان محل کی تنہائی کابوس کی طرح مجھ پر سوار رہی۔ میں دن بھر باہر رہتا اور بڑی محنت سے کام کرتا۔ پھر رات کو تھک ٹوٹ کر گھر آتا اور آتے ہی سو جاتا۔

ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ محل کا پُر ہول سحر مجھ پر چھانے لگا۔ یہ بات بیان سے بھی باہر ہے۔ اور لوگوں کو اِس پر یقین دلانا بھی مشکل ہے لیکن مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے یہ تمام مکان ایک زندہ جسم ہے جو مجھے آہستہ آہستہ ایک نامعلوم طریقہ سے ہضم کر رہا ہے +

شاید یہ عمل اسی وقت شروع ہو گیا جب میں نے گھر میں قدم رکھا لیکن مجھے وہ دن بہت اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں پہلی مرتبہ اِس سے آگاہ ہوُا۔

موسمِ گرما کی ابتدا تھی۔ اور چونکہ تجارت کا بازار سرد تھا، اس لئے میرے پاس کوئی کام نہ تھا۔ غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے میں سیڑھیوں کے نیچے دریا کے کنارے ایک آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ ندی کا پانی اترا ہوُا تھا۔ دوسری طرف ریت کا ایک چوڑا سا قطعہ شام کے رنگوں سے چمک

رہا تھا۔ کہیں سے ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ آتا تھا، اور پُرسکون فضا اُن جھاڑیوں کی گراں بار خوشبو سے لدی ہوئی تھی۔ جو پاس کی پہاڑیوں پر اُگ رہی تھیں۔

سورج پہاڑی چوٹیوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا، تو دن کے چہرے پر ایک لمبی سیاہ نقاب پڑ گئی، اور حائل پہاڑیوں نے اُن لمحات کو مختصر کر کے کاٹ ڈالا جن میں غروب کے وقت روشنی اور سایہ آپس میں ملتے ہیں۔ میں نے گھوڑے پر سوار ہو کر باہر سیر کو جانے کا خیال کیا اور اب اُٹھنے ہی کو تھا کہ نیچے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے نیچے دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

میں اسے دھوکا سمجھ کر پھر بیٹھ گیا تو سیڑھیوں پر مجھے کتنے ہی پاؤں پڑتے ہوئے سنائی دیئے۔ جیسے بہت سے آدمی ایک ساتھ نیچے اتر رہے ہیں۔ مسرت کی ایک عجیب تھرتھری جس میں کچھ کچھ خوف بھی ملا ہوا تھا، میرے بدن میں دوڑ گئی، اور گو میری نظروں کے سامنے کوئی شکل نہ تھی تاہم مجھے خیال ہو گیا کہ ہنستی کھیلتی دوشیزہ لڑکیوں کی ایک ٹولی ندی میں نہانے کے لئے سیڑھیوں سے اُتر رہی ہے۔ وادی میں، دریا میں، محل میں ذرا سا کھٹکا بھی نہ ہوتا تھا کہ سکوت اُس سے ٹوٹے، لیکن لڑکیوں کی اُس مسرور اور خوش آیند ہنسی کو جو کسی سینکڑوں جھرنوں میں سے بہنے والے نغمہ ریز چشمے کی طرح پھوٹ رہی ہو، میں نے صاف سُن لیا، جب وہ میری موجودگی کا احساس کئے بغیر شوخی سے ایک دوسرے کا تعاقب کرتی میرے پاس سے گزر گئیں۔ جس طرح وہ مجھ کو نظر نہ آتی تھیں اسی طرح میں بھی اُن کو نظر نہ آتا تھا۔ دریا میں کامل سکون تھا، لیکن مجھے یُوں معلوم ہُوا جیسے اس کے ساکن، پایاب اور صاف پانی میں چوڑیوں سے کھنکھناتی ہوئی باہوں کے ہلنے سے ایک ہیجان پیدا ہو گیا ہے، جیسے لڑکیاں ہنستی ہیں اور ایک دوسرے پر پانی کے چھینٹے اُڑاتی ہیں۔ اور جیسے اِن حسین تیراکوں کے پاؤں ننھی ننھی لہروں کو اُبھار اُبھار کر اُن میں سے

موتی اُچھال رہے ہیں۔

میرا دِل کانپ گیا ——— میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیفیت خوف کی وجہ سے طاری ہوئی یا خوشی سے یا تعجب سے، میرے دِل میں ان باتوں کو اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ دیکھنے کی خواہش تھی مگر مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اپنے کانوں پر ذرا زور ڈالوں تو میں اُن کی تمام گفت گو سمجھ لُوں گا، اور میں نے بہت زور ڈالا مگر جنگل کے جھینگروں کی آواز کے سوا مجھے کچھ سُنائی نہ دیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ڈھائی سَو برس کا ایک تاریک پردہ میرے سامنے لٹک رہا ہے، اور میں کانپتے ہوئے اِس کا ایک کونہ ہٹا کر نظارے کو جھانک لُوں گا، گو دوسری طرف کا مجمع پورے طور پر تاریکی میں لپٹا ہوا تھا۔

شام کا سکوتِ گراں یکایک ہوا کے ایک جھونکے سے ٹوٹ گیا، اور ندی کی ساکن سطح پر کسی دریائی پری کے گھُنگریالے بالوں کی سی لہریں اُٹھنے لگیں، اور شام کی تیرگی میں لپٹے ہوئے جنگلوں میں سے ایک مسلسل سنسناہٹ سنائی دینے لگی۔ جیسے وہ کسی خوابِ سیاہ سے بیدار ہو رہے ہوں اِس کو حقیقت کہو یا خواب، وہ غیر مرئی لمحاتی جھلک جس کا انعکاس ڈھائی سو سال کی پُرانی دنیا سے ہو رہا تھا، ایک پل میں میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی، وہ پُر اسرار شکلیں جو غیر جسمانی رفتار اور بلند بے آواز قہقہوں کے ساتھ جلد جلد میرے پاس سے گزر گئی تھیں اور دریا میں کُود پڑی تھیں، اب اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ اِسی راستے واپس نہ گئیں۔ بلکہ جس طرح خوشبو ہوا میں مِل کر غائب ہو جاتی ہے، اسی طرح وہ بھی ہوا کے ایک ہی جھونکے سے منتشر ہو گئیں۔

اب حقیقتہً مجھ پر ایک خوف سا طاری ہو گیا۔ یہ شاید سرسوتی دیوی تھی جس نے مجھے اکیلا دیکھ کر مجھ پر غلبہ پا لیا تھا ——— آہ، اس ساحرہ نے یہ نہ دیکھا کہ اُس کم بخت کو تباہ کرنے سے کیا حاصل ہے جو کپاس کا محصُول اکٹھا کر کے اپنی روزی کماتا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج نہایت اچھا کھانا

کھاؤں گا کیونکہ جب پیٹ خالی ہوتا ہے۔ تو بہت سے امراض اسے اپنی آماجگاہ بنا لیتے ہیں۔ میں نے اپنے باورچی کو بلایا اور اُسے نہایت اعلےٰ درجہ کا مغلئی کھانا تیار کرنے کو کہا۔

دُوسری صبح مجھے اس تمام واقعہ کی حقیقت وہم و خیال سے زیادہ نظر نہ آتی تھی۔ میری طبیعت ہلکی ہو چکی تھی۔ میں نے صاحب بہادروں کی سی ٹوپی پہنی اور اپنے کام کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ اُس روز مجھے اپنی سہ ماہی رپورٹ لکھنی تھی۔ اِس لئے میرا خیال تھا کہ دیر تک واپس نہ آسکوں گا لیکن ابھی اندھیرا نہ ہوا تھا کہ میرا دِل عجیب و غریب طریقہ سے گھر کی طرف کھنچنے لگا ـــــــ مجھے محسوس ہوا کہ وہ سب میرا انتظار کر رہے ہیں اور اب مجھے زیادہ دیر نہیں کرنی چاہئے۔ رپورٹ کو ختم کئے بغیر میں اُٹھ کھڑا ہوا، ٹوپی پہنی اور تاریک، سایہ دار سنسان راہ کے سکوت میں اپنی گاڑی کی گڑگڑاہٹ سے رخنہ اندازی کرتا ہوا اُس وسیع اور خاموش محل میں پہنچ گیا، جو پہاڑیوں کی تاریک فضا میں تنہا کھڑا تھا۔

پہلی منزل میں ایک نہایت فراخ کمرہ تھا، اُس کی چھت خوشنما محرابوں کے اُوپر موٹے موٹے ستونوں کی تین قطاروں پر پھیلتی چلی گئی تھی، اور دِن رات شدید تنہائی کے بوجھ تلے دب کر کراہتی رہتی تھی۔ دِن ابھی ابھی ختم ہوا تھا اور چراغ ابھی روشن نہیں کئے گئے تھے، جب میں نے دروازے کو دھکا دے کر کھولا تو ایسا معلوم ہوا کہ اندر بڑی ہل چل سی پڑ گئی ہے۔ اور انسانوں کا ایک بہت بڑا مجمع درہم برہم ہو رہا ہے اور وہ سب کے سب دروازوں سے، کھڑکیوں سے، برآمدوں سے اور کمروں سے بسرعت تمام نکل بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

چُونکہ مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا میں حیران و پریشان کھڑا رہا۔ ایک قسم کی پُرکیف مسرت میں میرے رُونگٹے کھڑے ہو رہے تھے اور عطر کی ہلکی ہلکی خوشبو جسے امتدادِ زمانہ نے نابُود کر کے برابر کر دیا تھا، میرے دماغ میں سما رہی تھی۔ اِس وسیع اور خالی ایوان کی تاریکی میں اِن قدیم ستونوں کی

قطروں کے درمیان کھڑے ہوکر فواروں کے نغموں کو سنگ مرمر کے فرش پر اُن کے گرنے کو، بربط کے ایک عجیب سُر کو، زیوروں کی کھن کھن کو اور بالیوں کی آواز کو، گھڑیال کی منادی کو، ہوا سے ملتے ہوئے جھاڑوں کے بلوروں کی ٹن ٹن کو، پنجروں میں بند بلبلوں کے نزانوں کو اور باغ میں سارس کے نالوں کو میں سُن رہا تھا، اور یہ سب میرے آس پاس ایک عجیب غیر ارضی موسیقی پیدا کر رہے تھے۔ پھر مجھ پر ایسا جادو ہو گیا، کہ یہ غیر محسوس، غیر مرئی اور غیر ارضی نظارہ مجھے دنیا کی تنہا حقیقت معلوم ہونے لگا اور باقی ہر ایک چیز ایک خواب نظر آنے لگی۔ میں یعنی سری جت فلاں ابن فلاں جو کپاس کے محصول کے محصّل کی حیثیت سے چار سَو پچاس روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا اور اپنی ٹمٹم میں بیٹھ کر چھوٹا کوٹ اور انگریزی ٹوپی پہن کر ہر روز دفتر جاتا تھا، اپنے آپ کو اس قدر حیرت انگیز طور پر مضحکہ خیز سراب سمجھنے لگا کہ اس وسیع خاموش ایوان کی تاریکی میں کھڑے کھڑے بے اختیار ہنس پڑا +

اِسی وقت میرا ملازم ہاتھ میں ایک جلتا ہوا لمپ لے کر اندر داخل ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ اُس نے مجھے دیوانہ سمجھا یا کیا، لیکن اُس کی آمد سے مجھ پر یہ پھر نمایاں ہو گیا کہ میں سری جت فلاں ابن فلاں ہوں اور یہ جو ہمارے چھوٹے بڑے شاعر کہا کرتے ہیں کہ اس دنیا میں یا اس دنیا سے باہر ایک سرزمین ایسی بھی ہے جہاں نادیدہ چشمے ابل کر اور سریلے بربط کے تار غیر مرئی انگلیوں سے مس ہو کر سرمدی نغمے پیدا کرتے ہیں، بہر حال یقینی ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ میں بیرچ کی روئی کا محصول جمع کر کے چار سو پچاس روپے ماہوار تنخواہ پاتا ہوں، وفور مسرت میں اپنے اِن نادر اور عجیب تصورات پر ہنستے ہوئے میں اپنی میز پر بیٹھ گیا اور اخبار پڑھنے لگا +

جب میں اخبار ختم کر چکا اور اپنا مغلئی کھانا کھا چکا تو میں نے چراغ گُل کر دیا اور ایک بغلی کمرے میں اپنے بستر پر جا لیٹا۔ کھُلی ہوئی کھڑکی میں سے پہاڑیوں کے اُوپر اور اُن کے جنگلوں کی

تاریکی میں محیط ایک چمکتا ہؤا ستارہ آسمان کی کروڑوں میل کی دوری سے مسٹر کلکٹر کو ایک غریبانہ بستر میں غور سے دیکھ رہا تھا، میں متحیر تھا اور اس خیال سے خوش تھا۔ اور میں نہیں جانتا کہ کب مجھے نیند آئی اور کتنی دیر میں سوتا رہا۔ لیکن یکایک میں چونک کر اُٹھا، گو کوئی آواز میرے کان میں نہ آئی اور کسی خلل انداز کو میں نے نہ دیکھا ــــ صرف پہاڑی کی چوٹی پر چمکنے والا وہ روشن ستارہ غروب ہو چکا تھا، اور چاند کی دھیمی روشنی کھلی ہوئی کھڑکی میں سے چپکے چپکے اندر داخل ہو رہی تھی جیسے وہ اِس مداخلت سے محجوب ہو رہی ہو۔

مجھے کوئی نظر نہ آیا مگر میں نے یوں محسوس کیا جیسے کوئی مجھے آہستہ آہستہ ہلا رہا ہے۔ جب میں جاگا تو اُس نے ایک لفظ بھی مُنہ سے نہ نکالا، بلکہ انگوٹھیوں سے چمکتی ہوئی پانچ انگلیوں کے اشارہ سے مجھے باحتیاط پیچھے آنے کو کہا، میں دبے پاؤں اُٹھا اور گو میرے سوا کوئی ایک متنفس بھی اس خوابیدہ آرزوؤں اور بیدار صداؤں والے سنسان محل کے بے شمار ایوانوں میں موجود نہ تھا، تاہم میں ہر ہر قدم پر ڈرتا تھا کہ کوئی جاگ نہ اُٹھے۔ محل کے اکثر کمرے ہمیشہ بند رہتے تھے۔ اور اِن میں میں کبھی داخل نہ ہؤا تھا۔

میں دم بند کئے ہوئے، پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے اِس غیر مرئی رہنما کے پیچھے چلا جا رہا تھا ــــ میں اب نہیں بتا سکتا کہ کہاں، کتنے لمبے تھے وہ تاریک اور تنگ راستے، کتنی طویل تھیں وہ غلام گردشیں اور کیسے خاموش اور پُر رُعب تھے وہ مجلسی ایوان اور خاص کمرے جن میں سے میں گزرا۔

گو میں اپنی حسین پیش رَو کو دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اُس کی شکل میرے دِل کی آنکھوں سے پوشیدہ نہ تھی ــــ وہ ایک عرب لڑکی تھی، جس کی مرمر جیسی سخت اور ملائم باہیں اس کی ڈھیلی ڈھالی آستینوں میں سے نظر آ رہی تھیں، ایک باریک نقاب تھی، جو اس کی ٹوپی کے کناروں سے

اس کے رُخ پر پڑ رہی تھی اور ایک خم دار خنجر تھا جو اُس کی کمر سے لٹکا ہُوا تھا۔ میں سمجھا کہ الف لیلہ کی ایک رات رومانی دنیا سے اڑ کر میرے پاس آگئی ہے اور میں آدھی رات کے وقت محوِ خواب بغداد کی تنگ و تاریک گلیوں میں سے گزر کر کسی پُرخطر موعودہ و مقررہ مقام پر جا رہا ہوں۔

آخر وہ حسینہ یکایک ایک گہرے نیلے پردے کے سامنے کھڑی ہو گئی اور نیچے کسی چیز کی طرف اشارہ کرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہاں کچھ نہ تھا مگر ایک فوری خوف نے خون کو میرے قلب میں منجمد کر دیا —— میں سمجھا کہ میں پردے کے دامن میں زمین پر ایک ہیبت ناک حبشی غلام کو دیکھ رہا ہوں۔ جو زربفت کی ایک قیمتی پوشاک پہنے، اپنی ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ہی بیٹھا اُونگھ رہا ہے، اور ایک ننگی تلوار اس کی گود میں پڑی ہے۔ وہ حسینہ آہستہ سے اُس کی ٹانگوں کو طے کر کے آگے بڑھی اور پردے کا ایک کنارہ اُٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے کمرے کے صرف ایک حصّہ کی خفیف سی جھلک نظر آئی جہاں ایک ایرانی قالین بچھا تھا —— اندر پلنگ پر کوئی خاتون بیٹھی تھی —— میں اُسے دیکھ نہ سکا، مگر دو نازک اور خوبصورت پاؤں مجھے نظر آئے جن میں دو زرنگار جوتیاں تھیں اور جو زعفرانی رنگ کے پائنچوں میں سے نمایاں ہوتے ہوئے عجب بے پروایانہ انداز سے نارنجی رنگ کے مخملی قالین پر پڑے تھے۔ ایک طرف ایک ہلکے نیلے رنگ کا بلوریں تاش تھا، جس میں چند سیب، ناشپاتیاں سنگترے اور بہت سے انگوروں کے گچھے، دو چھوٹے پیالے اور ایک سنہری رنگ کی صراحی، یہ سب چیزیں کسی مہمان کا انتظار کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ کمرے میں ایک ایسی کیف آور خوشبو جل رہی تھی جس نے میرے حواس کو مدہوش کر دیا۔

جونہی کہ کانپتے ہوئے دل کے ساتھ میں نے غلام کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کو پھلانگنا چاہا۔ وہ چونک کر اُٹھا اور تلوار اُس کی گود سے ایک تیز جھنکار کے ساتھ سنگِ مرمر کے فرش پر گر پڑی۔

ایک چیخ سنائی دی اور میں اُچھل پڑا، اور میں نے دیکھا کہ میں اپنے بستر پر بیٹھا ہوں اور

میرے جسم سے پسینے کے فوارے چھوٹ رہے ہیں، اور چاند کا چہرہ ایک تھکے ہوئے شب بیدار مریض کے چہرے کی طرح صبح کی روشنی میں زرد نظر آ رہا ہے، اور ہمارا سودائی کریم خاں سنسان سڑک پر سے گزرتے گزرتے اپنے روزمرّہ کے قاعدے کے مطابق پکار پکار کر کہہ رہا ہے "خبردار! خبردار!"

یوں اچانک میری الف لیلہ کی ایک رات ختم ہوئی، لیکن ابھی ایسی ہزار راتیں باقی تھیں۔ اِس کے بعد میرے دِنوں اور راتوں کے درمیان کوئی مناسبت نہ رہی، دِن کو میں افسردہ مضمحل اپنے کام پر جاتا اور سحر کن رات اور خالی خولی خوابوں کو صلواتیں سناتا رہتا۔ لیکن جب رات آتی تو مجھے اپنی پابندیوں اور ذمہ واریوں سے بھری ہوئی زندگی ایک حقیر، بے اصل، مضحکہ خیز ڈھکوسلا معلوم ہوتی۔

رات کی تاریکی چھا جانے کے بعد مجھ پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اُس وقت میری ہستی گزرے ہوئے زمانے کی کسی نامعلوم شخصیت میں تبدیل ہو جاتی جس کے کارنامے بِن لکھی تاریخ کے صفحات میں منضبط ہو رہے ہوں، اور چھوٹا انگریزی کوٹ اور چست برجس مجھے اپنے لئے قطعاً ناموزون معلوم ہوتے۔ سر پر ایک مخملی ٹوپی، ڈھیلا پاجامہ، ایک کامدار واسکٹ ایک لمبا لہراتا ہوا چغہ اور عطر میں بسے ہوئے رنگین رومال میری پرتکلف پوشاک کی تکمیل کرتے سگریٹ کی بجائے میرے سامنے گلاب سے بھرا ہوا ایک پیچ دار حقہ ہوتا اور میں ایک نرم گدیلوں والی عمدہ چوکی پر یوں بیٹھ جاتا جیسے کوئی اپنے محبوب کی ملاقات کے شدید انتظار میں ہو۔

میں اُن حیرت انگیز واقعات کے بیان کی اپنے اندر طاقت نہیں پاتا جو رات کی تاریکی کے بڑھنے کے ساتھ ہی اپنے آپ کو منکشف کرنے لگتے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اِس وسیع محل کے عجیب و غریب کمروں میں ایک خوبصورت کہانی کے اجزا بادِ بہاری کے ایک ناگہانی جھونکے سے اڑنے لگے ہیں۔ یہ ایک ایسی کہانی تھی جس کا ایک حد تک تو میں مطالعہ کر لیتا لیکن جس کا

انجام مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکتا، تاہم میں تمام تمام رات اِن اجزا کے تعاقب میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھرتا رہتا۔

اِن خوابناک اجزا کے بھنور میں، حنا کی خوشبو اور بربط کے نغموں میں فواروں کی مہکتی ہوئی پھوار سے لدی ہوئی ہوا میں برق کی چشمک کی طرح مجھے ایک نازنین کی جھلک دِکھائی دے جاتی یہ وہی تھی جس کا پاجامہ زعفرانی رنگ کا تھا، جس کے سُرخ وسپید نرم پیروں میں خمدار نوک والی زرنگار جوتی تھی۔ جس نے ایک چُست سونے کے کام والی انگیا اور ایک سُرخ ٹوپی پہن رکھی تھی، جس کے سنہری تار اُس کی روشن پیشانی اور گورے گالوں پر پڑتے تھے۔

اُس نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا، اُس کی تلاش میں میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتا تھا، اور دنیائے خواب کی مسحور سرزمین میں پیچ در پیچ گلیوں کی بھول بھلیاں کو جادہ بہ جادہ طے کرتا پھرتا تھا۔

بعض دفعہ شام کے وقت جب میں اُس بڑے آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر جس کے دونوں جانب دو مومی شمعیں جل رہی ہوتیں، اپنے آپ کو بڑے انہماک کے ساتھ ایک شاہزادے کے لباس میں آراستہ کر رہا ہوتا، مجھے ناگہاں اپنے پہلو پر اس فسوں ساز ایرانی حسن کا عکس نظر آجاتا، اُس کا تیزی سے پلٹنا، اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں درد اور محبت سے چھلکتی ہوئی ایک مضطرب نگاہ، اُس کے سُرخ ہونٹوں پر بول اُٹھنے کی سی کیفیت، اُس کا خوبصورت اور نازک شباب پرور قد و قامت جیسے ایک پھولوں سے بھری ہوئی بیل پُر کیف انداز میں بلند ہوتی چلی گئی ہو: ارمان، آرزو، اور امنگ کی ایک خیرہ کن جھلک، ایک تبسم، ایک نگاہ اور اس کے جواہرات اور لباس کی ایک بھڑک پیدا ہوتی اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتی، پہاڑیوں اور جنگلوں کی تمام خوشبو سے لدا ہوا ہوا کا ایک وحشی جھونکا آکر میری روشنی کو گُل کر جاتا اور میں اپنی پوشاک کو ایک طرف پھینک کر اپنے بستر پر لیٹ

جاتا، میری آنکھیں بند ہوتیں اور میرا جسم نشاط سے کانپ رہا ہوتا ——— میرے آس پاس ہوا میں جنگلوں اور پہاڑیوں کی خوشبو کے درمیان خاموش تاریکی میں بہت سی ہم آغوشیاں اور بہت سے بوسے اور نرم نرم ہاتھوں کے بہت سے مس تیرتے تھے، میں ہلکی ہلکی سرگوشیوں کو سنتا تھا اور کسی کی معطر سانسیں اپنی پیشانی پر محسوس کرتا تھا یا بھینی بھینی خوشبو میں بسا ہوا رومال بار بار میرے رخساروں پر ہلایا جاتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک پُراسرار ناگن اپنے ہوشربا پیچوں سے مجھے جکڑنے لگتی۔ اور میں ایک بوجھل آہ بھر کر بے خبری کے عالم میں کھو جاتا اور پھر مجھ پر گہری نیند طاری ہو جاتی۔

ایک شام میں نے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر باہر جانے کا ارادہ کیا ——— میں نہیں جانتا کہ کون بہ اصرار رہ جانے کی مجھ سے التجائیں کر رہا تھا ——— مگر اُس دِن میں نے کسی التجا کو نہ سُنا۔ میری انگریزی ٹوپی اور کوٹ ایک کھونٹی پر لٹک رہے تھے۔ میں اِن کو وہاں سے اُتارنے ہی کو تھا کہ یکایک ندی کی ریت اور پہاڑی کے خشک پتوں کا ایک بگولا سا اُٹھ کر اُن پر جھپٹا اور اپنے چکر میں ان کو لے کر گھمانے لگا، اِس کے ساتھ ہی کسی کے پُرمسرت قہقہوں کی آواز لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگی جس نے سازِ طرب کے ایک ایک تار کو چھیڑ ڈالا، یہاں تک کہ آخر کار وہ غروب آفتاب کی سرزمین میں گم ہو گیا۔

میں سواری کے لئے باہر نہ جا سکا، اور دوسرے دِن میں نے انگریزی کوٹ اور ٹوپی ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی۔

اُس دِن آدھی رات کے وقت پھر میں نے کسی کی دِل خراش سسکیاں سنیں ——— جیسے بستر کے نیچے اس رفیع الشان محل کی سنگین بنیادوں کے نیچے کسی مرطوب اور تاریک قبر میں ایک آواز، مستر حمانہ میری منتیں کر رہی ہے: "آہ! مجھے چھڑا لو! اِس شدید فریب، اِس موت نما نیند، اِن بے ثمر خوابوں کے دروازے توڑ کر میرے پاس آؤ، گھوڑے پر سوار ہو کر مجھے اپنے پہلو

میں بٹھالو، مجھے اپنے سینے سے لگالو اور پہاڑیوں جنگلوں اور دریاؤں میں سے ہوتے ہوئے مجھے اپنے روشن کمروں کی گرم فضا میں لے آؤ!"

میں کون ہوں؟ آہ میں تجھے کیونکر چھڑا سکتا ہوں؛ اے غارت گرحسن اور اے سراپا عشق تو کون ہے جسے میں خواب کے وحشی بھنور میں سے نکال کر ساحل پر لاؤں؟ اے دل کو موہ لینے والی اثیری پری! تو نے کہاں نشو و نما پائی؟ کس ٹھنڈے چشمے کے کنارے کس نخلستان کے سائے میں تو پیدا ہوئی ـــــــ کس بے خانماں بادیہ گرد ماں کی گود کو تو نے زینت دی؛ وہ بدوی کون تھا جس نے تجھے تیری ماں کی آغوش سے جدا کیا، ایک کھلتی ہوئی کلی کو ایک صحرائی بیل سے توڑ لیا، تجھے ایک برق رفتار گھوڑے پر رکھ کر جلتی ہوئی ریت کو طے کرتا ہوا وہ تجھے کس شاہی شہر میں لایا؛ اور وہاں، بادشاہ کے کس اہلکار نے تیری اٹھتی ہوئی پُرحیا جوانی کی شان و شوکت کو دیکھ کر سونے کے بدلے تجھے خرید لیا، ایک زریں پالکی میں تجھے بٹھایا اور اپنے آقا کے محل کی زینت کے لئے تجھے تحفۃً پیش کر دیا؛ اور آہ، اے اس محل کی سرگزشت! آہ وہ سارنگ کی موسیقی، پایلوں کی جھنکار، خنجروں کی چمک اور شیرازی شراب کی تندی اور تیزی! آہ وہ بے پایاں جاہ و جلال اور وہ بے حساب اطاعت و خدمت! تیرے دائیں بائیں کنیزیں چمر ہلاتی تھیں تو اُن کے سینوں پر ہیرے چمکتے تھے، بادشاہ وہ حاکموں کا حاکم دست بستہ تیرے برف جیسے سفید پاؤں میں بیٹھتا تھا۔ اور باہر وہ خطرناک حبشی غلام جس کی شکل موت کے قاصد کی طرح اور جس کا لباس ایک فرشتے جیسا ہوتا تھا ہاتھ میں ایک برہنہ تلوار لئے کھڑا رہتا تھا! پھر اے وہ صحرا کے پھول جسے عظمت و شوکت کا وہ تاباں و درخشاں خون آلود سمندر بہا کر لے گیا جس میں رشک اور حسد کا کف اور فریب و سازش کی چٹانیں اور ٹیلے ہیں۔ مجھے بتا کہ تجھے اس نے ظالم موت کے کس ساحل پر جا ڈالا، یا کس غدار تر اور ظالم تر سرزمین پر جا پھینکا؟

یکایک اس وقت وہی مجنون مہر علی پکارا "خبردار! خبردار!! سب مایا ہے! سب مایا ہے!!"
میں نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ صبح کی روشنی نمودار ہو چکی تھی۔ میرا چپڑاسی آیا اور اُس نے مجھے کچھ خطوط دیے، اور خانساماں سلام کر کے میرے احکام کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے کہا "سنو، میں اب یہاں نہیں رہوں گا" اُسی دن میں نے اپنا اسباب باندھا اور دفتر میں منتقل ہو گیا۔ بوڑھا کریم خاں مجھے دیکھ کر ذرا مسکرایا، اُس کی مسکراہٹ مجھے کانٹے کی طرح چبھ گئی۔ مگر میں نے کچھ نہ کہا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

جب شام ہوئی تو میرا دِل اُڑنے لگا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اپنا کوئی وعدہ پورا کرنا ہے اور حساب کی پڑتال کا کام مجھے بالکل بے فائدہ معلوم ہونے لگا، یہاں تک کہ نظام کی نظامت بھی مجھے ہیچ نظر آنے لگی، جس چیز کو بھی حال کے ساتھ تعلق تھا، جو چیز بھی روٹی کے لئے حرکت کر رہی تھی یا سرگرمِ عمل تھی، مجھے بے حقیقت بے معنی اور حقیر دِکھائی دینے لگی۔

میں نے اپنا قلم رکھ دیا، کھاتے بند کر دیئے، اپنی گاڑی میں بیٹھا اور روانہ ہو گیا، میں نے دیکھا کہ گاڑی غروبِ آفتاب کے وقت خود بخود محل کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ میں جلد جلد زینے کو عبور کر کے کمرے میں داخل ہوا۔

محل میں شدید خاموشی محیط تھی، تاریک کمرے رنجیدہ نظر آ رہے تھے، جیسے وہ ناراض ہو گئے ہوں، میرا دِل پشیمانی سے لبریز ہو گیا مگر وہاں کوئی نہ تھا جس کے سامنے میں اِسے کھول کر رکھ سکوں یا جس سے میں معافی مانگ سکوں، میں ان تاریک کمروں کے پاس بے فکر ہو کر پھرتا رہا میں چاہتا تھا، کہ میرے پاس ایک بربط ہو اور میں اُس پر اُس نامعلوم کے لئے گاؤں "اے آگ، غریب پروانہ جس نے اُڑ بھاگنے کی بیکار کوشش کی تھی تیرے پاس پھر واپس آ گیا ہے! بس اِس دفعہ اسے معاف کر دے، اس کے پروں کو جلا اور اسے اپنے شعلے میں بھسم کر ڈال!"

یکایک اُوپر سے آنسوؤں کے دو قطرے میری پیشانی پر گرے۔ اُس دن پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سیاہ بادلوں کے دَل چھا رہے تھے۔ تاریک جنگل اور ندی کا تاریک پانی ہولناک امید و بیم میں ساکن پڑا تھا۔ یکایک زمین پانی اور آسمان کانپ گیا۔ اور ایک تیز و تند طوفانی جھونکا دور بے راہ جنگلوں میں سے شور مچاتا ہوا اور اپنے برق پاش دانت نکالتا ہوا لپکا، جیسے کوئی دیوانہ زنجیریں تڑا کر بھاگا ہو۔ محل کے خالی ایوانوں کے دروازے زور زور سے بجنے لگے اور درد و کرب میں کراہنے لگے۔

نوکر تمام دفتر میں تھے اور وہاں کوئی نہ تھا جو چراغ روشن کرے۔ رات ابر آلود اور بے ماہ تھی محل کی شدید تاریکی میں میں صاف طور پر محسوس کرتا تھا کہ ایک عورت پلنگ کے نیچے قالین پر منہ کے بل لیٹی ہے اور اپنے کھلے ہوئے لمبے بالوں کو نوچ رہی ہے۔ اُس کی خوبصورت پیشانی سے خون بہہ رہا تھا، کبھی وہ ایک ناگوار کرخت اور ناشاد ہنسی ہنستی اور کبھی روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ جاتی اور کبھی وہ اپنا گریباں چاک کر کے اپنی چھاتی پیٹتی، کھلی ہوئی کھڑکی میں سے ہوا چیخ چیخ کر داخل ہوتی اور مینہ کے دھارے اندر آ آ کر اُسے تر بہ تر کر جاتے۔

تمام رات نہ طوفان تھما اور نہ اُس کی دِل گداز گریہ وزاری ختم ہوئی۔ میں بھی اندھیرے ہی میں اپنے بے حاصل غم کو لئے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھرتا رہا۔ میں کس کی ڈھارس بندھاتا جب مجھے کوئی نظر ہی نہ آتا تھا؟ یہ کس کے غم و اندوہ کا کرب و اضطراب تھا؟ یہ تسکین ناپذیر غم والم کہاں سے اُمنڈ رہا تھا؟ اتنے میں اُس دیوانے نے آوازہ لگایا:۔ خبردار! خبردار!! سب مایا ہے! سب مایا ہے!!

میں نے دیکھا کہ صبح ہو چکی ہے، اور اس خوفناک موسم میں بھی مہر علی محل کے ارد گرد چکر کاٹ رہا ہے۔ اور اپنی مقررہ صدا لگا رہا ہے۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ شاید وہ بھی کبھی اس محل میں رہا ہے۔ اور اگرچہ وہ اب دیوانہ ہو چکا ہے تاہم وہ اس مرمر کے دیو کے جادو سے مسحور ہو کر یہاں آتا

ہے اور اس کا طواف کرتا ہے۔

طوفان اور بارش کے باوجود میں اُس کے پاس پہنچا، اور میں نے کہا، "او مہر علی! کیا مایا ہے؟"

اُس نے کچھ جواب نہ دیا بلکہ مجھے ایک طرف ہٹا کر اپنے طواف میں مصروف رہا اور وہی مجنونانہ آوازہ لگاتا گیا، جیسے کوئی مسحور پرندہ کسی سانپ کے مُنہ پر منڈلا رہا ہو، اور یہ کہہ کہہ کر اپنے آپ کو ہوشیار کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہو: خبردار! خبردار!! سب مایا ہے! سب مایا ہے!!

اِس بے پناہ بارش میں ایک سودائی کی طرح بھاگتا ہوا میں دفتر پہنچ گیا، اور میں نے کریم خاں سے کہا، "مجھے بتاؤ یہ کیا ماجرا ہے؟"

جو کچھ مجھے اُس نے بتایا اُس کا ماحصل یہ ہے کہ ایک وقت تھا جب بے حساب ناشاد ارمانوں ناکام آرزوؤں اور عیش و عشرت کی مسرتوں کے گستہ عنان شعلے اس محل میں بھڑکتے تھے، اور دِل کی ٹیسوں اور اُمید کی شکستوں کی نحوست نے اس کے ایک ایک ذرے کو ایک بھوکی ڈائن کی طرح بنا رکھا تھا، اور اگر اتفاقاً یہاں کوئی شخص آجاتا تو یہاں کا کونہ کونہ اُسے پھاڑ کھانے کے لئے مضطرب ہو جاتا، جس نے بھی یہاں مسلسل تین راتیں بسر کیں، وہ ضرور اِس کے خونخوار چنگل کا شکار ہو گیا، لیکن مہر علی اپنی عقل و دانش کے بل پر یہاں سے بچ نکلا۔

میں نے پوچھا، "کیا میری رِہائی کی کوئی تدبیر ہو سکتی ہے"؟ بوڑھے کریم خان نے کہا، "صرف ایک تدبیر ہے اور وہ بہت مشکل ہے۔ میں یہ تمہیں بتا دوں گا، مگر پہلے تم ایک ایرانی دوشیزہ کی سرگزشت سن لو جو کبھی اس عشرت گاہ میں رہتی تھی، اس سے زیادہ عجیب اور اس سے زیادہ دلگداز واقعہ دنیا کی آنکھ نے کبھی نہ دیکھا ہو گا۔"

اتنے میں قلیوں نے شور مچایا کہ گاڑی آگئی - ہم نے جلد جلد اپنا اسباب باندھا، گاڑی اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی، ایک انگریز جو بظاہر ابھی ابھی بیدار ہوا تھا اسٹیشن کا نام پڑھنے کی کوشش میں ایک اول درجہ کی گاڑی سے باہر جھانک رہا تھا، جونہی اس کی نظر ہمارے ہمراہی پر پڑی، وہ بولا "ہیلو" اور اس نے اسے اپنے کمرے میں بٹھا لیا - چونکہ ہم دوم درجہ کی گاڑی میں بیٹھے اس لئے ہمیں یہ معلوم کرنے کا موقعہ نہ ملا کہ وہ کون تھا اور اس کی کہانی کا انجام کیا تھا؛

میں نے کہا" اس نے ہمیں بے وقوف سمجھ کر ہم سے خوب مذاق کیا ہے، کہانی شروع سے آخر تک محض گھڑت تھی"۔ اس پر جو بحث ہوئی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مجھ میں اور میرے صوفی عزیز میں عمر بھر کشیدگی رہی +

رابندر ناتھ ٹیگور

سحر ناکام

گھنے اور تاریک جنگل کے ساتھ ساتھ ایک ٹوٹا پھوٹا راستہ دور تک چلا گیا ہے - جہاں جنگل ختم ہوتا ہے وہاں کوہستان کی بلندیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے - آفتاب دن بھر کے کاروبار سے تھک کر دامن کوہ میں جا چھپا ہے، شام کا سایہ سرعت کے ساتھ تمام منظر پر چھا رہا ہے - اور تاریکی لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی ہے - پہاڑی کے دامن میں ایک غار ہے جس کے منہ سے کبھی کبھی سرخ روشنی کی جھلک نظر آجاتی ہے، اس کے سوائے سارے بیابان میں روشنی کی ایک کرن بھی دکھائی نہیں دیتی +

مصور سپریا اس سنسان جنگل کے ٹوٹے پھوٹے راستے سے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا گزر رہا تھا۔ بظاہر اس کی عمر تو کچھ زیادہ معلوم نہ ہوتی تھی۔ مگر اس کا کمزور اور نحیف جسم اس بوجھ سے جھکا پڑتا تھا جو اس کی پُر الم زندگی نے اس کے کندھوں پر ڈال رکھا تھا۔ ضعف اور تکان کے باعث اب اس میں چلنے کی سکت نہ رہی تھی لیکن اس خیال سے کہ زیادہ اندھیرا چھا جانے پر کہیں راستہ چلنا دشوار نہ ہو جائے۔ وہ بہت جلد شہر میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔

ایک اور شخص جو سامنے سے اس کی طرف آ رہا تھا۔ اب اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا، سپریا نے ایک وحشت آمیز طریقہ سے اپنا سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا "باسودت تم ہو؟"

باسودت نے ہنس کر جواب دیا "ہاں میں ہی ہوں۔ لیکن تم اس وقت یہاں کہاں؟"

سپریا۔ میں شاہی محل سے آ رہا ہوں۔

باسودت۔ اچھا! پھر تمہیں وہاں کچھ کامیابی بھی ہوئی؟

سپریا۔ ہاں ایک تصویر فروخت ہوئی اور ایک اور کے بنانے کا حکم ہوا۔

باسودت۔ تو کیا یہ تمہاری حرص کی تسکین کے لئے کافی نہیں۔ تم تو کچھ ایسا مُنہ بنائے جا رہے ہو گویا تمہیں کچھ ملا ہی نہیں۔ اور اگر تم اپنی اس کامیابی کا لحاظ کرو۔ تو آج کی رات تمہیں ہزار صبح سے بہتر سمجھنی چاہیئے۔ ایسی کامیابی اگر مجھے نصیب ہوتی، تو تم دیکھتے کہ میں اس وقت خوشی کے مارے قلابازیاں لگاتا ہوا نظر آتا۔

سپریا نے اپنا سر اُٹھایا اور ایک الم انگیز آواز کے ساتھ کہا "میرے دوست تم نے سچ کہا ہے۔ حقیقت میں یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور میری قسمت نے بھی ضرور پلٹا کھایا ہے لیکن آہ! اب یہ سب کچھ بے سُود ہے"

سپریا کی یہ باتیں سُن کر باسودت کچھ خوف زدہ سا ہو گیا۔ کچھ دیر تک وہ خاموش کھڑا رہا

پھر کہنے لگا "کیوں کیا ہوا؟"

سپریا۔ کچھ نہیں مگر آج قبل اس کے کہ شاہی خزانے سے میری تصویر کی قیمت برآمد ہوتی شاہی طبیب نے مجھے گھر چلے جانے کی ہدایت کی۔

باسودت۔ یہ کس لئے؟

سپریا۔ بات دراصل یوں ہے کہ جب میں بادشاہ کے حضور سے واپس ہوا تو باہر آکر مجھے غش آگیا۔ جب میں ہوش میں آیا تو مجھے یہ سارا حال معلوم ہوا۔

باسودت کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا اس وقت اسے کوئی ایسی بات نہ سوجھتی تھی جو اس کے لئے کسی تسلی یا اطمینان کا موجب ہو سکے۔ آخر سپریا نے اس کے احساسات کو سمجھ لیا اور پھر یہ کہہ کر چل دیا کہ "میرے دوست، تم میرے لئے کوئی غم نہ کرو اس سے مجھے کچھ بھی فائدہ نہ ہوگا۔"

جب سپریا گھر پہنچا۔ تو رات کا اندھیرا چھائے ہوئے دیر ہو چکی تھی، اس نے دروازے کو کھٹکھٹاتے ہوئے آواز دی۔ "دیپکا!"

دروازہ کھلا اور ایک نوجوان لڑکی دہلیز کے قریب چراغ لئے کھڑی نظر آئی۔ وہ تشویش آمیز لہجہ میں بولی "بڑی دیر سے آئے۔ میں تو انتظار کرتے کرتے بھی تھک گئی۔ جلد اندر آجاؤ۔ یہاں کھڑے نہ رہو۔ باہر بڑی سردی ہے۔"

سپریا اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ کمرہ کسی بڑے ساز و سامان کا حامل نہ تھا۔ ایک طرف کونے میں ایک شاندار پلنگ پڑا ہوا تھا اور اس کے سرہانے ایک خوبصورت شمعدان رکھا تھا جس پر عجیب و غریب قسم کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے، ان دو چیزوں کے علاوہ ایک اور چیز بھی تھی جس کی طرف ہر شخص کی توجہ بے اختیار منتقل ہو جاتی تھی۔ اور یہ ایک لڑکی کے عنفوانِ شباب کی تصویر تھی، تصویر پر رنگ و روغن کی نمائش تو کچھ ایسی نہ تھی کہ مصور کو اس پر ناز ہو سکے۔

لیکن جس چہرۂ ماہ پارہ کا یہ انعکاس تھا اس کا حسن وجمال کسی آرائش وزیبائش کا محتاج ہی نہ تھا۔یہ دیپکا تھی۔

سپریا کے باپ کا ذریعۂ معاش بھی مصوری ہی تھا، بادشاہ کے الطاف وعنایات ہمیشہ اِس کے شاملِ حال رہے اور تنگدستی نے کبھی بھول کر اس کے گھر میں قدم نہ رکھا تھا۔ اس کے بعد سپریا کو بھی الطاف وعنایاتِ شاہانہ اسی طرح حاصل رہے گویا یہ بھی اس کے باپ کی کوئی وراثت تھی مگر دولت کی بے وفا اور متلوّن المزاج دیوی کو ایک ہی گھر میں کہاں قرار آتا تھا۔ چنانچہ ایک دن بادشاہ اور سپریا کے درمیان ایک تصویر کے معاملہ میں کچھ اختلافِ رائے ہو گیا۔ اور اِس اختلافِ رائے نے سپریا کو تباہ کر دیا۔ اِدھر شاہی محلّات کے دروازے اس پر بند ہوئے اُدھر دوستوں نے اس سے راہ ورسم چھوڑ دی۔ سپریا نے اوّل اوّل اپنی مستعدی اور زندہ دِلی کو قائم رکھا۔ کیونکہ اس کے دِل میں ولولۂ شباب جوش زن تھا۔ مدتوں اس کی امید ناامیدی کا مقابلہ کرتی رہی اس کے تبسم کی شگفتگی دیپکا کو دھوکا دیتی رہی اور دیپکا نے اس کے اِس تبسم کی ماہیت کو کبھی نہ سمجھا۔

لیکن محض اُمید کے بھروسہ پر کوئی کب تک جی سکتا ہے۔ غربت اور تنگ دستی اب اپنا احساس کرانے لگی۔ گھر کے تمام ملازموں کو ایک ایک کر کے رخصت کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ تصویریں جو سپریا کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھیں اصلی لاگت پر بھی فروخت نہ ہو سکیں، دیپکا کے جواہرات بھی اسی راہ میں گئے اور آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ گھر کا ساز وسامان اور برتن بھی افلاس کی نذر ہو گئے، مگر مصیبت کہتی تھی کہ ابھی آغاز ہی ہوا ہے۔ ایک دِن گھر میں پورے آٹھ پہر کا فاقہ تھا، سپریا نے دیپکا کی تصویر، کہ لے دے کر اب یہی ایک چیز غربت کی دستبرد سے بچ رہی تھی اُٹھائی تاکہ جا کر بیچ لائے۔ لیکن دیپکا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا کہ میں اس تصویر کو جدا نہیں کر سکتی۔ اِسے ہرگز

فروخت نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اب میں ویسی پھر کبھی نہ ہونگی جیسی کسی زمانہ میں ہوا کرتی تھی۔ اور یہ تصویر اس زمانے کی یادگار ہے۔ وہ جاکر ہیرے کی ایک انگوٹھی لے آئی۔ یہ اس کی ماں کی نشانی تھی۔ اسی لئے اس نے اس کو چھپا رکھا تھا۔ انگوٹھی فروخت کردی گئی اور اس طرح یہ تصویر بچ گئی۔

دولت و ثروت کی بے قرار دیوی نے ایک مرتبہ پھر اچانک ہی اپنی شکل آدکھائی۔ شاید وہ اس گھر کو ایک دفعہ اور دیکھنا چاہتی تھی، جس میں اس نے کئی سال گزارے تھے۔ یعنی سپریا پھر دربار میں بلایا گیا۔ چنانچہ ہم اسے شاہ کے حضور سے واپس گھر آتے ہوئے دیکھ چکے ہیں۔ غربت و افلاس نے مصوّر کے گھر کو خیرباد کہی، اور گذشتہ آرام و آسائش کے دن ایک بار پھر پلٹ آئے لیکن مصائب و آلام کا دیو جاتے جاتے بھی دو ایسی چیزیں اپنے ساتھ لے گیا جو پھر کبھی واپس نہ آسکتی تھیں۔ دیپکا کے حسن نور افروز پر اب ایک غبار سا چھا گیا تھا، اور اس کی جوانی کا شگفتہ پھول اب مرجھا چکا تھا۔ ایک دن جب وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی تو اسے اپنے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی دکھائی دینے لگیں اور اسے اپنے کالے کالے گیسوؤں میں سے سفید بال جھانکتے ہوئے نظر آنے لگے۔ اس نے آئینہ کو زمین پر پٹک کر ٹکڑے ٹکڑے کردیا، اور اپنے آپ کو اپنے گذشتہ حسن کی تصویر کے سامنے ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ادھر دیپکا کے حسن کا آفتاب سیاہ رات کی تاریکی میں جا چھپا، اُدھر سپریا کی صحت روز بروز خراب ہونا شروع ہوئی لیکن سپریا نے اس جانستاں راز کو اپنے سینہ میں ہی چھپائے رکھا جو اس کے دل و جگر کو پگھلا کر خون کر رہا تھا اور کسی کو خبر تک بھی نہ ہوئی کہ موت کا تاریک بادل اس کی ہستی پر چھائے جا رہا ہے۔ وہ دیکھتا تھا کہ دیپکا کا وہ تبسم جو آج سے مدتوں پہلے اس کے ہونٹوں پر کھیلا کرتا تھا۔ اب پھر اس کے چہرہ پر وہی پرانی کیفیت نمایاں کر رہا ہے اور اب وہ اس تبسم کو افسردہ نہ کرنا چاہتا تھا۔ دیپکا سے کسی بات کا چھپانا نہایت ہی مشکل تھا لیکن سپریا نے اپنے

اوقات زندگی کو کچھ اس انداز سے تقسیم کر رکھا تھا کہ دیپکا کو اس کے پاس رہنے کا بہت ہی کم موقع ملتا تھا +

(۲)

سپریا اپنے کمرے میں ایک تصویر بنانے میں مصروف تھا۔ یہ تصویر بھی وہ شاہی ایما سے بنا رہا تھا۔ اور وہ اسے جلد سے جلد ختم کر دینا چاہتا تھا، کیونکہ وہ نہ جانتا تھا کہ کام کرنے کی طاقت کب تک اس کا ساتھ دیتی ہے، بادشاہ نے اس تصویر کے معاوضہ میں اُسے ایک معقول رقم دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ وہ اس رقم کو دیپکا کے لئے وقف کر دینا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کے بعد پوری بےفکری کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ لیکن جب اسے خیال آتا کہ احتیاج و افلاس کے علاوہ کئی اور ہولناک مصیبتیں بھی ہونگی جن سے دیپکا کو اس کے بعد دوچار ہونا پڑے گا تو وہ ایک لمبی آہ بھرتا اور دل ہی دل میں کہتا کہ اِن کا کوئی علاج نہیں۔ شاید یہ بہتر ہوتا کہ وہ دیپکا کو اپنے راز سے اوّل ہی اوّل آگاہ کر دیتا۔ تاکہ وہ اِن تکلیفوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار تو ہو جاتی۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا۔ اِس خوفناک راز کا انکشاف ان کے لئے اور مشکل ہوتا جاتا۔ ہائے وہ اس جانکاہ صدمہ کو کیونکر برداشت کر سکے گی۔ جس کا اسے خواب و خیال تک نہیں۔

سپریا کے ماں باپ بچپن ہی میں مر چکے تھے۔ جوانی کا آغاز بھی ہوا تو اس کے دِل میں کوئی اُمنگ پیدا نہ ہوئی۔ وہ اکثر اپنے خیالات کی دیوی کو اپنی نظم عبودیت سنایا کرتا۔ لیکن وہاں سے اُسے کوئی جواب نہ ملتا۔ اس کا دل ہر وقت کسی ایسی چیز کی آرزو میں بےقرار رہتا، جو کبھی کسی دیوتا کے دربار سے نہیں ملی۔ اس کا دِل ہر وقت اس کی مصوری سے برسرِ پیکار رہتا +

اِسی ملک کے کسی دوسرے گوشہ میں ایک بے ماں باپ کی بچی جسے قسامِ ازل نے دولتِ حُسن سے مالامال کر رکھا تھا سپریا کا انتظار کر رہی تھی، مشاطۂ تقدیر نے دونوں کو ایک دوسرے

سے ملا دیا۔ اور سپریا کے خیال کی دیوی نے ایک غرور ناکام کے ساتھ اس کے دِل کے تخت کو چھوڑ دِیا۔ دیپکا نے اب جانا کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اور سپریا نے اب سمجھا کہ اس کا دِل کس لئے بیقرار تھا۔ عیارۂ تقدیر نے جب یہ دیکھا کہ یہ دونوں ایک دوسرے میں اتنے محو ہو گئے ہیں کہ اِن کی نظروں میں دنیا جہان کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہی تو اس کے دِل پر حسد کی بجلیاں کوندگئیں +

سپریا تصویر بنانے میں مصروف تھا لیکن اس کے دِل میں خیالات کا ایک سمندر موجیں لے رہا تھا۔ اس نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ نیلگوں آسمان نے شاید سردی کی شدت سے ڈر کر کہر کی چادر اوڑھ لی تھی، فضا اشک آلود اور اُداس تھی۔ زمین کی سبز فرغل چھین لی گئی تھی اور اس نے اپنے جسم کو برف کی سفید چادر سے ڈھانپ لیا تھا۔ جدھر دیکھو موت کی حکومت غالب نظر آتی تھی۔ ہر جگہ موت، ہر شکل میں موت، ہر لباس میں موت جلوہ گر تھی۔ سپریا فطرت کے چہرے کو دیر تک محویت کی نظر سے دیکھتا رہا۔ ہاں وہی اور صرف وہی دیپکا سے پہلے اس کے دِل کی ملکہ اور اس کے خیال کی دیوی تھی۔ اور اِس سے پہلے کہ وہ ہمیشہ کے لئے اِس دنیا سے رخصت ہو جائے وہ ایک مرتبہ پھر اسے نظر بھر کر دیکھنا چاہتا تھا، اس کے بعد کیا ہو گا، یہ اُسے معلوم نہ تھا غالباً حیرت وخود فراموشی کی انتہا ہو گی جس میں شاید دیپکا کو بھی جگہ نہ مِل سکے۔

اِدھر سپریا اپنی اولین محبوبہ سے آخری بار رخصت ہو رہا تھا۔ اُدھر دیپکا اپنی ساری روح آنکھوں میں لئے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اِس کے دِل میں رہ رہ کر درد اُٹھتا تھا۔ جو اسے نڈھال کئے دیتا تھا، آہ اسے اپنے خاوند کی خدمت وتواضع کی وہ نعمت بھی میسر نہ تھی جس سے وہ اس کے غم وفکر کو تسکین اور آرام سے بدل سکتی۔ گھر کا کام کرنے کے لئے نوکروں کی ایک فوج کی فوج موجود تھی۔ ایسی صورت میں وہ کون سا کام ہو سکتا تھا۔ جو دیپکا کے لئے بچ رہتا۔ پہلے دِن ہی سے جب اس نے اِس گھر میں قدم رکھا اس کے کرنے کو یہاں کوئی کام نہ تھا، مگر پھر بھی وقت اس پر کبھی گراں

نہ گزرا، محبت اور مسرت کے اس سیلاب نے جو اس کے سینہ میں اُمنڈ آیا تھا، اس کے دل کے گوشہ گوشہ کو سیراب کر دیا۔ اس کے بعد غربت آئی، وہ بھی اس کے دل کی خوشی کو نہ مٹا سکی اس کے دروازے پر گرگ و شغال کی آوازیں کبھی اس کے سرورِ دل کی موسیقی سے زیادہ بلند نہ ہوئیں لیکن آج اُسے کیا ہو گیا؛ وہ حیرانی و پریشانی کے اس سنسان صحرا میں کہاں بھٹک آئی۔ جہاں اسے سہارا دینے کے لئے بھی کوئی چیز نہیں۔ سپریا کا وہی کمرہ ہمیشہ اس کی آمد پر سراپا خندہ و تبسم بن جایا کرتا تھا اگر آج وہ یہاں آگئی تو اسی کمرے کی ہر چیز کیوں اس کی طرف گھُور گھُور کر دیکھ رہی ہے۔ آہ وہ یہاں سے جا بھی نہ سکتی تھی کبھی پروانہ کو بھی شمع کی جدائی گوارا ہوئی ہے؛ اس حال میں وہ یہاں کھڑی تھی اور سپریا کو اس کے آنے کی خبر تک نہ تھی۔

دیپکا کی نحیف و نازک کلائی سے اچانک سونے کی چوڑی کھل کر زمین پر گری جس کی آواز نے سپریا کو چونکا دیا۔ اور اس کی آنکھیں دیپکا کی آنکھوں سے جا ملیں +

نادان لڑکی! تیری آنکھوں میں ابھی سے آنسو آنے لگ گئے۔ ابھی تو وہ تیرے سامنے ہے ...... تقدیر کی گڑیا! تو اس وقت کیا کرے گی جب موت اس پر اپنا تصرّف جما لے گی ...... تجھے اس وقت کہاں قرار آئے گا؛

سپریا کے دل نے آنسوؤں کا دریا بہا دیا۔ آہ! اس کی آنکھیں تو مدتوں سے خشک ہو چکی تھیں۔ پھر ذرا مُنہ بنا کر پوچھنے لگا "دیپکا! تم یہاں کیوں آگئیں"؛

کیا اب اس کے آنے کے لئے بھی کوئی وجہ ہونی چاہیئے۔ کیا صرف آنے کی خواہش ہی آنے کی سب سے بڑی وجہ نہیں ہے۔ جواب میں دیپکا صرف "یونہی" کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور وہاں پہنچ کر اپنے آپ کو ٹھنڈے اور سخت فرش پر گرا دیا۔ رنج و غم کی شدت میں اس کی آنکھوں نے آنسوؤں کا دریا بہا دیا ..... بدقسمت بھکارن تو وہاں کیا لینے گئی تھی، تو نے یہ کیوں نہ سمجھا، کہ

تو اُس سپریا کو کھو بیٹھی ہے جو تیرے دِل کی زبان کو تیرے منہ کی زبان سے بہتر سمجھا کرتا تھا؛

دِن کی روشنی آہستہ آہستہ رات کی تاریکی میں جذب ہو رہی تھی۔ بادِ شمال کے سرد جھونکے بے برگ و بار درختوں میں سے چیختے ہوئے گزر رہے تھے، سیاہ بادلوں کے بڑے بڑے انبار اُٹھ اُٹھ کر آسمان مغرب پر چھا رہے تھے اور اپنے کالے کالے لمبے لمبے ہاتھ بڑھا کر روشنی کی بچی کھچی کرنوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رہے تھے۔ دیپکا ابھی فرش سے نہ اُٹھی تھی۔ ایک نوکرانی چراغ ہاتھ میں لے کر آئی تو دیپکا نے اس کو نہایت غصہ کے ساتھ فوراً کمرے سے چلے جانے کا حکم دیا۔ اس نے دروازے پر ذرا تامل کیا، دیپکا کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی، اس نے چلا کر کہا "تم یہاں کس لئے کھڑی ہو؟ کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ یہاں سے دُور ہو جاؤ"؟

لڑکی ڈر گئی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "بی بی! میں اس لئے ٹھہری تھی کہ اگر آپ حکم دیں تو میاں کے کمرے کا چراغ بھی میں ہی جلا دوں۔ اندھیرا بہت چھا گیا ہے"۔

اتنے نوکروں کے ہوتے ہوئے بھی دیپکا سپریا کے کمرے کے چراغ کو خود ہی صاف کیا کرتی اور خود ہی جلایا کرتی تھی۔ یہی وہ کمرہ تھا جس میں وہ دُلہن بن کر آئی تھی۔ اور اس لئے اس کے دِل میں اس کا بڑا احترام تھا، اس نے نوکروں کو کبھی اس میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی تھی۔ ہر شام وہ خود اس کے کمرے کے چراغ کو روشن کرتی اور پھر دیر تک گزرے ہوئے زمانہ کی یاد میں محو ہیں کھڑی رہتی +

لڑکی کی بات ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ دیپکا اُٹھی اور اس کے ہاتھ سے سختی کے ساتھ بتی چھین کر چراغ جلانے کے لئے چلی گئی۔ لڑکی اپنی بیگم کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دیپکا نے ایک لمحہ کے لئے تامل کیا۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی پھر اس نے آہستہ سے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ کھُل گیا اور دیپکا تاریک کمرے کو

منوّر کرتی اندر داخل ہو گئی۔

سپریا کمرے میں موجود نہ تھا۔ دیپکا کی نظر معاً ایک ریشمی رومال پر پڑی، جس میں کوئی چیز لپٹی ہوئی سپریا کی نشست کے قریب حفاظت سے رکھی تھی۔ دیپکا نے جھپٹ کر اُسے اُٹھا لیا۔

زمین اس کے پاؤں تلے سے نکل گئی۔ نامعلوم حسینہ کی شعلہ ریز آنکھوں نے دیپکا پر وہ اثر کیا جو کسی ناگن کی آنکھیں ہی کر سکتی ہیں۔ یہ کون تھی؟ کیا سپریا کے دل کی نئی ملکہ یہی تھی جس کی خاطر اس نے دیپکا کو چھوڑ دیا؟ اے رہزن اور قاتل عورت تیرے غارت گر حسن اور برق پاش تبسم کو اور کہیں جگہ نہ ملی؟ کیا تجھے اس دنیا میں غریب دیپکا ہی کا گھر ویران کرنا تھا؟ اور کیا تجھے اُسی وقت آنا تھا جب اس میں تیرے حُسن کے مقابلہ کی تاب نہیں؟ تو اس وقت کہاں تھی جب حسن کی دیوی کو بھی دیپکا کے ساتھ مقابلہ کی تاب نہ تھی؟

اس وقت اسے اپنے پیچھے کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ تو اس کی کمزور اور ناتواں گرفت سے تصویر چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ یہ اس کی سہیلی بسنتی تھی۔ بسنتی وفورِ شوق میں بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے جواہرات قدم قدم پر ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر موسیقی کی ایک لہر پیدا کر رہے تھے۔ پاس آ کر اس نے دیپکا کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہنے لگی "پیاری بہن دیپکا، اب تم کہیں نظر ہی نہیں آتیں۔ کیا تم نے ہمیں بھلا دیا؟ لیکن ہم تو تمہیں کبھی نہ بھولیں گے۔ خواہ تم کتنی ہی بے پروا کیوں نہ ہو جاؤ۔ دیپکا بہار کے دنوں میں ضرور آنا۔ ساری باتیں تم ہی پر چھوڑتی ہوں۔ تم اپنے خاوند سے مشورہ کر لینا کہ ہمیں دیوتا کی بھینٹ پوجا کے لئے کیا کیا تیاریاں کرنی چاہئیں"۔

دیپکا کے ہونٹوں پر ایک زہر آلود تبسم نمودار ہوا اور اس نے کہا "میری بہن مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ بہار جس کے منانے کے لئے تم مجھے مدعو کر رہی ہو میری وجہ سے خزاں میں تبدیل نہ ہو جائے۔ میرا وجود اب محبت کے دیوتا کی پرستش کے قابل نہیں رہا۔ وہ تو اب موت کے دیوتا کی پرستش ہی کریگا۔

کیا بسنتی کی پُرشوق دعوت کا یہی جواب تھا؟ کیا دیپکا مذاق کر رہی تھی؟ مگر نہیں ایسا مذاق کون کر سکتا ہے؟ بسنتی نے کہا۔ "تمہیں کیا ہو گیا؟ تم کیسی باتیں کہہ رہی ہو؟ تم سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہو سکتا ہے؟"

دیپکا کی آواز بھرا گئی اس نے کہا "اچھا اگر میں خوش قسمت ہوں تو پھر تم اس عورت کو کیا کہو گی" اس نے زمین پر سے تصویر کو اُٹھا لیا اور اُسے اپنی سہیلی کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے لا رکھا۔

بسنتی نے متعجب ہو کر پوچھا "ہیں! یہ کون ہے؟ اچھا میں اب سمجھی یہ تو دربار کی رقاصہ اندریکھا کی تصویر ہے۔ اور کیا تم سچ مچ یہ سمجھتی ہو کہ وہ تم سے زیادہ خوش قسمت ہے؟ تم دیوانی تو نہیں ہو گئیں؟ کیا جس گوہر گرانمایہ کی تم مالک ہو اندریکھا اس سے محروم نہیں ہے؟ کیا صرف اس لئے تم اسے خوش قسمت سمجھتی ہو کہ اس پر ہر طرف سے سونے چاندی کی بارش ہوتی ہے؟ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ وہ دنیا میں انتہا درجہ کی بدقسمت اور بدنصیب عورت ہے"۔

دیپکا نے حقارت سے تصویر کو ایک طرف پھینک دیا اور پھر آنسوؤں کا ایک تار باندھ دیا کل تک وہ ملکہ تھی۔ آج وہ مفلس و نادار ہے۔ آہ لوگ اب بھی اُسے خوش نصیب ہی کہتے ہیں۔

یہ نظارہ دیکھ کر بسنتی کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر گئے۔ اُسے اپنی سہیلی کی مصیبت کا کوئی علم نہ تھا لیکن دیپکا جیسی قابلِ رشک عورت کو اس رنج و غم کی حالت میں دیکھنا ہی اس کو رُلانے کے لئے کافی تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بسنتی نے دھیمی آواز میں پوچھا "دیپکا مجھے بتاؤ تو سہی تمہیں کیا دُکھ پہنچا ہے"۔

دیپکا نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے؛ اس کی خوددار طبیعت دوسروں کے سامنے اظہار رنج میں اپنی خفت محسوس کرنے لگی۔ اس لئے اُس نے اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کر کے کہا "اور تو کچھ بھی نہیں ہوا میری طبیعت ہی کچھ ناساز سی ہے۔ اس لئے میرا مزاج چڑچڑا ہو گیا ہے"۔

لیکن بسنتی کو ان باتوں سے کب تسلی ہوتی تھی۔ اس نے کہا "دیپکا تم بچوں کی سی باتیں کہہ

کر مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔ تمہیں جاننا چاہیئے کہ میں بھی عورت ہوں، مجھ سے چھپا کر تم کیا کروگی کیا مجھے تمہارے رنج کا تم سے کم احساس ہے؛ یقیناً تم بدنصیب ہو، اگر تم خوش نصیب ہوتیں۔ تو تمہارے خاوند جیسا شاندار انسان کبھی ایسی ملعون اور نابکار عورت کے پیچھے نہ ہو لیتا۔"

دیپکا نے کچھ نہ کہا۔ بسنتی نے پھر اپنا سلسلۂ کلام شروع کیا۔ "لیکن کبھی اتنی جلدی ہمت نہ ہار دینی چاہیئے ہم عورتوں کو تو اپنے حقوق کے لئے لڑنا ہی پڑتا ہے۔ میری ایک خالہ زاد بہن ہے، اُسے بھی ایک مرتبہ ایسے ہی حالات پیش آگئے تھے۔ تمہیں معلوم ہے پھر اس نے کیا کیا؛ اِس نے مشہور جادُوگر کامنڈک کے ایک چیلے سے جادو کا ایک گٹکا لے کر اپنے شوہر کو کھلا دیا میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ تین دِن کے اندر اندر اس کا غلط کار خاوند بالکل سیدھا ہو گیا۔ تم جانتی ہو۔ لوگوں کا خیال ہے کہ بھوت پریت کامنڈک کے تابع ہیں، اور کوئی بات اس کے نزدیک ناممکن نہیں۔

یہ سُن کر دیپکا کے چہرے پر ایک حقارت آمیز تبسّم نمودار ہوا۔ آج خدا نے اُسے بھُلا دیا تھا اور شیطان اُسے مدد دینے کے لیئے اپنی طرف بلا رہا تھا۔

چونکہ طوفان کی تُندی ہر لمحہ بڑھ رہی تھی اس لئے بسنتی نے گھر واپس جانے میں جلدی کی۔ اُس کے چلے جانے کے بعد فوراً ہی دیپکا اپنے کمرے میں چلی گئی، اور تمام دروازے بند کر لئے، پھر کسی نوکر کو جرأت نہ ہوئی کہ دیپکا کو بُلا سکے۔

سرد ہوا کے تُند اور تیز جھونکے دریچے سے دیپکا کے کمرے میں آ رہے تھے۔ ابھی مینہ برسنا شروع نہ ہوا تھا، آسمان بادلوں کے بوجھ سے جُھکا پڑتا تھا اور اس کے سیاہ اور غضب ناک چہرے کو دیکھ کر خوف آتا تھا، رات بہت جا چکی تھی۔ گھر میں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی، اس وقت سپربا کہاں تھا؛ دیپکا نے اُٹھ کر اس کے کمرے کے دروازے سے کان لگا دیئے۔

کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔ یہاں سے ہٹ کر وہ اس کمرے میں گئی جہاں سپریا کام کیا کرتا تھا، ایک ہلکی سی بتی سے روشنی نکل رہی تھی۔ دیپکا کے قدم کانپ رہے تھے، جذباتِ فاسدہ کا بڑھتا ہوا سیلاب اس کے دِل کو کھائے جا رہا تھا۔ سپریا اپنی نشست ہی پر سو گیا تھا اور اندرلیکھا کی تصویر اُس کے قریب پڑی ہوئی تھی۔ دیپکا کی آنکھیں اس شیرنی کے مانند چمک رہی تھیں جس سے اُس کے بچے چھن گئے ہوں۔ تباہی اور بربادی کے کنارے آج تک وہ کس طرح آنکھیں بند کئے ہوئے کھڑی رہی اِس کی اُسے سمجھ نہ آتی تھی۔

اِس وقت اس نے ایک خوفناک عزم کیا۔ اِس نے سپریا کے ساتھ شیطانی حربوں سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ کمرے سے باہر آگئی اور پھر مڑ کر بھی پیچھے کی طرف نہ دیکھا، سپریا کا زرد چہرہ نیند کی حالت میں ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ کسی مردہ انسان کا چہرہ ہے لیکن اس وقت دیپکا کے دِل پر نفرت وحقارت کی حکومت تھی۔ اس وقت اُسے اندرلیکھا کے عاشق سپریا کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہ یکایک گھر کے سکوت وسکون سے نکل کر طوفان کے جوش وخروش اور رات کے عمق تاریک میں داخل ہو گئی۔

(۳)

جنگل کے سرسبز راستے کا نقشہ ایسا بدل چکا تھا کہ شناخت ہی نہ ہو سکتی تھی، طوفان کی دستبرد نے اس کی جنگلی شان اور خوبصورتی کو بالکل ضائع کر دیا تھا، ٹہنیوں اور درختوں نے ٹوٹ ٹوٹ کر اور پہاڑ سے بڑے بڑے پتھروں نے لڑھک لڑھک کر راستے کو قریب قریب بند کر دیا تھا جنگل میں ہر طرف سے مہیب اور خوفناک آوازیں آ رہی تھیں، کہیں روشنی کی ایک کرن بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ صرف بجلی کی پیہم چمک جنگل کا یہ ہولناک اور وحشت خیز منظر دکھانے کا کام دے رہی تھی۔

ہولناک منظر کی اس تاریکی میں ایک مبہم سی شکل تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ بجلی کی چمک نے اس کی موجودگی کو اور بھی ظاہر کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی انسان

نہیں، بلکہ خود طوفان ہی عالمِ جسمانیات میں آگیا ہے۔ اس کی آنکھیں اس غار پر گڑی ہوئی تھیں جو پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ وہ آگ جسے لوگ اس زمین کی آگ نہیں سمجھتے۔ اِس وقت بھی جل رہی تھی۔ غار کے مکین کی نسبت یہ مشہور تھا کہ وہ شاہ ظلمات کا بہت گہرا دوست ہے۔

اتنے میں دیپکا کو اپنے پاؤں پر سانپ حرکت کرتا ہوا معلوم ہوا۔ اُس کے مُنہ سے ایک چیخ نِکلی، اور وہ وہیں رُک گئی۔ ایک لحظہ کے لئے ٹھیر کر اس نے پھر وہاں سے آگے بڑھنا شروع کیا، کیونکہ یہ ایسا موقع نہ تھا، کہ وہ بزدلی اور کمزوری سے مغلوب ہو جائے۔ وہ موت کے دیوتا کے ساتھ لڑنے کے لئے نکلی تھی۔ وہ ساوتری کی طرح اپنی مردہ محبت کی روح کو موت کے پنجہ سے چھڑانے کا عزم کر کے آئی تھی۔ پھر اُسے خوف کیونکر روک سکتا تھا؟

اب وہ غار کے مُنہ پر پہنچ چکی تھی۔ اس کے پاؤں لہولہان ہو رہے تھے۔ اور اس کے کپڑوں کے پرخچے ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ غار کے اندر سے ہوا کا ایک برفانی جھونکا آیا، اور اس کے کانپتے ہوئے جسم کو شل کرتا ہوا گزر گیا۔ غار کے ایک کونے میں آگ کے لمبے لمبے شعلے اُٹھ اُٹھ کر رقص کر رہے تھے۔ لیکن باقی تمام غار تاریکی میں تھا، دیپکا کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لیکن اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے اس کے پاس لاتعداد غیر مرئی ہستیاں چل پھر رہی ہیں۔

اس وقت دیپکا کے دِل میں خوف وہراس کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اندر لیکھا کی تصویر اس کی آنکھوں میں تھی۔ اور دیپکا کے ڈگمگاتے ہوئے قدم اس سے قوت حاصل کر رہے تھے اب وہ غار کے بالکل اندر آگئی۔ معاً ایک غیر انسانی آواز زور سے گونجی "اے عورت! تو کیا چاہتی ہے؟"

دیپکا نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو آگ کے سامنے دھوئیں کا ایک تاریک اور بھاری پردہ پڑا ہوا تھا، اور آگ کے شعلے اُسے چیر چیر کر باہر نکلتے اور کھیلتے تھے، اِس آتشیں بارش کے قطروں کے اندر کوئی کھڑا تھا جس کی آنکھیں آگ کے شعلوں سے بھی زیادہ چمک رہی تھیں۔ دیپکا

نے سمجھ لیا کہ شاہِ ظلمات کا ساحر دوست کا منڈک یہی ہے۔ اتنے میں پھر وہی سوال ہوا "تو کیا چاہتی ہے؟"
اس دفعہ دیپکا نے جواب دے دیا۔ اس کی آواز میں ذرا سی لرزش بھی ظاہر نہ ہوتی تھی "اے روحوں پر حکمرانی کرنے والے میں ان تمام چیزوں سے محروم کر دی گئی ہوں۔ جو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز تھیں اور میں ان کو اپنے چور سے واپس لینا چاہتی ہوں"۔
غار ایک غیر انسانی قہقہہ سے گونج اٹھا اور پھر اس پہلی سی ہیبت ناک آواز سے کسی نے کہا، "گویا تم چور کے گھر میں چوری کرنا چاہتی ہو۔ ذرا آگے آجاؤ"۔
دیپکا بڑی دلیری سے آگے بڑھی۔ جب وہ قریب پہنچی تو اس نے دیکھا۔ کہ ہاتھ کا ایک ڈھانچ آگ سے باہر نکلا۔ اور ایک لمحہ کے بعد دیپکا نے اپنے گلے کو اس کی گرفت میں پایا۔ اس کے بعد وہ غار کی ٹھنڈی زمین پر غش کھا کر گر پڑی ٭

(۴)

مینہ کے قطرے چھینٹے دے دے کر اس کو ہوش میں لے آئے۔ وہ اُٹھ بیٹھی اور اس نے دیکھا کہ اب وہ غار کے اندر نہیں ہے۔ بلکہ کوئی اُسے باہر چھوڑ گیا ہے۔ تاریکی اور بڑھ گئی تھی لیکن طوفان کا جوش اب ختم ہو چکا تھا اور بارش زور شور سے ہو رہی تھی۔ دیپکا کھڑی ہو گئی۔ اور غار کی طرف دیکھنے لگی، اندر سے آواز آئی، جاؤ جو تم چاہتی تھیں تمہیں مل چکا ہے"۔
دیپکا کو اس وقت اپنے دل میں خوشی کی ہلکی سے ہلکی جھلک بھی نظر نہ آتی تھی۔ بلکہ اس کے بالمقابل اسے گرانی محسوس ہو رہی تھی۔ اب وہ جلد جلد قدم بڑھاتی ہوئی شہر کی طرف بڑھی۔ جب شہر کے قریب پہنچی تو مینہ ختم ہو چکا تھا۔ اور چاند بادلوں کی سیاہ چادر کو پھاڑ پھاڑ کر جھانک رہا تھا۔ دیپکا نے اپنے مکان پر ایک نگاہ ڈالی۔ وہ اب بھی ویسا ہی خاموش تھا، جیسا وہ اس کو چھوڑ کر گئی تھی، وہ اُچھلتے ہوئے اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے قریب پہنچی۔ اور بیقراری کے ساتھ

کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔

گھر کے تمام آدمی سو رہے تھے۔ دیپکا نے اطمینان کا سانس لیا ابھی اس میں اتنی تاب نہ تھی کہ وہ سب لوگوں کے سامنے کھڑی ہو کر اُن کی نظروں کا مقابلہ کر سکے۔ اس کو سب سے پہلے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا۔

وہ آہستہ سے سپریا کے کمرے کی طرف بڑھی چاند کی روشنی کھڑکی میں سے ہو کر کمرے میں پھیل رہی تھی۔ سپریا زمین پر پڑا ہوا تھا، چاندنی میں اس کا چہرہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سفید کنول کا پھول۔ کیا یہ سچ مچ اسی کا چہرہ تھا۔ جس پر اتنی زردی اور مُردنی چھائی ہوئی تھی؛

دیپکا یہ دیکھ کر لرز گئی۔ اس کے جسم سے کھڑے رہنے کی طاقت زائل ہوگئی۔ وہ خود بھی وہیں گر پڑی۔ اور اپنے آپ کو سپریا کے پہلو میں ڈال دیا، کیا اب وہ کبھی آنکھیں نہ کھولے گا۔ یہ خیال اس کی جان کو کھائے جاتا تھا۔

نسیم صبح کے جھونکے کمرے کے اندر آنے لگے تو سپریا نے آنکھیں کھولیں، سب سے پہلے اس کی نظر دیپکا پر پڑی جو اس پر جھکی ہوئی تھی۔ دیپکا کا سارا جسم سپریا کی ایک پر اشتیاق نگاہ کے انتظار میں تھرا رہا تھا۔

لیکن یہ کیا معاملہ تھا؛ سپریا کیوں ایک یاس آمیز چیخ کے ساتھ اُچھل کر اس سے علیحدہ ہو گیا۔ دیپکا نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کانپتے ہوئے جسم کو سہارا دینے کے لئے پھیلا دیئے۔ لیکن سپریا نے سختی کے ساتھ اس کو ایک طرف ہٹا دیا اور چلا کر کہنے لگا " چلی جا۔ میری نظروں سے دور ہو جا۔ خبیث ناگن! میری اس آخری ساعت میں بھی تو میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ دیپکا! پیاری دیپکا!! آؤ! ایک لمحہ کے لئے آؤ! آہ۔ اب تو میرے پاس تم سے معافی مانگنے کے لئے بھی وقت نہیں مگر آؤ اپنا پیارا چہرہ مجھے ایک دفعہ تو دیکھ لینے دو"

وہ پھر زمین پر گر پڑا۔ دیپکا دیوانہ وار اس سے جا چمٹی، وہ روتی جاتی تھی اور کہتی تھی "ہائے تم مجھے کیوں نہیں پہچانتے۔ میں دیپکا ہی تو ہوں"

اس تھوڑی بہت طاقت سے جو اب اس کے جسم میں باقی تھی۔ سپریا نے اپنے آپ کو دیپکا کی آغوش سے جدا کر لیا۔ اور بیٹھی ہوئی آواز سے پکار کر کہنے لگا "شیطان عورت کیا تو سمجھتی ہے کہ میں تجھے نہیں پہچانتا۔ تو اندر لیکھا ہے۔ میری آنکھوں سے دور ہو جا۔ آؤ دیپکا"......

دیپکا کا نام اس کی زبان پر تھا کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔ دیپکا چیخیں مارتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے سامنے ایک قدِ آدم آئینہ لٹک رہا تھا جب اس کی نظر اس پر پڑی تو اُسے اُس کی صاف شفاف سطح پر اندر لیکھا کی فسوں ساز شکل کا انعکاس نظر آیا۔

"سیتا چٹرجی"

انگلستان

رقاصہ

"اماں[1] رقاصہ غمگین ہے۔ وہ ہر وقت اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر بیٹھی رہتی ہے۔ اور اس کی آنکھیں حیرت اور پریشانی میں گم رہتی ہیں۔ میں اس کی طرف دیکھ کر ڈر جاتی ہوں اماں میں نے اسے بہت دفعہ دُعا مانگنے کو کہا ہے مگر وہ نہیں جانتی کہ دُعا مانگتے کیونکر ہیں۔ اُسے دعا پر ایمان نہیں ہے۔ وہ اپنے گناہوں کا اقرار بھی نہیں کرتی۔ وہ کافر ہے .... مگر وہ کافر ہے اماں مجھے بتاؤ حسرت و یاس کی اِن گھڑیوں میں اُسے خوش کرنے کے لئے کوئی کیا کر سکتا ہے۔ وہ کسی بات کا جواب نہیں دیتی، وہ بیٹھی رہتی ہے، اور اس کی آنکھیں حیرت اور پریشانی میں کھوئی رہتی ہیں۔ اُس کی طرف دیکھتی ہوں تو میرے دل میں ایک ٹیس اُٹھتی ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی بات نہیں جو موت سے پہلے اُسے تھوڑی سی تسکین بھی دے سکے؟ آہ! اس جوانی اس امنگ کے زمانے میں موت کیسی حسرتناک ہے خصوصاً اس کافر کے لئے۔ آہ اُس کی جوانی اُس کا حُسن! کیا یہ گولیوں کا نشانہ بننے کے لئے ہی تھے؟۔ اماں! میں یہ سوچ کر لرز جاتی ہوں"۔

اپنی گفتگو ختم کر کے بوڑھی بہن نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر سینے پر باندھ لئے۔ اس کی

---

[1] گرجا کی ساہبہ عورتیں بہنیں کہلاتی ہیں۔ اور جو بہن منصب میں سب سے بڑی ہوتی ہے اسے تمام بہنیں اماں کہتی ہیں۔ اس مضمون میں بہن اور اماں کے الفاظ اسی مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔

رحم آلود بھوری آنکھیں مستفسرانہ نظروں سے اس زرد چہرے پر جمی ہوئی تھیں جو اس کے سامنے تھا۔ یہ بڑی اماں تھی جس کا سیدھا اور نحیف جسم اس کے بھورے اور سفید لباس میں موجود بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ متفکر تھا۔ جاسوس عورت جو اس وقت اس کی تحویل میں تھی، ایک رقاصہ تھی جو یا تو حبشی قوم میں سے تھی یا حبشی قوم سے۔ اس عورت نے اپنے فرانسیسی عاشق سے میدان جنگ کے راز معلوم کر کے جرمنوں کو بتا دیئے تھے۔ جرم ثابت ہو چکا تھا اور وہ اسے یہ کہہ کر بڑی اماں کی خانقاہ میں چھوڑ گئے تھے کہ" اسے ہماری خاطر پندرہ دن کے لئے یہاں رہنے دو۔ وہ یہاں قیدخانے سے زیادہ اچھی طرح رہ سکے گی۔" عورت! اور اس کو گولی سے اڑا دیا جائے! اس خیال سے ہی بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ جنگ کے ایام تھے اور یہ سب کچھ ملک کیلئے ہو رہا تھا

بڑی اماں نے اپنی بھوری متین آنکھوں سے چھوٹی بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "میری بچی! میں اُسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے اس کے کمرہ کی طرف لے چلو۔"

دونوں برآمدے میں سے گزرتی ہوئیں آہستہ سے اس کمرے میں پہنچیں جہاں رقاصہ اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی رنگ روپ نہ تھا۔ مگر مشرقی خون نے اس کے بدن پر گویا زعفران چھڑک رکھا تھا۔ اس کا چہرہ بیضوی تھا۔ بھویں کمان کی طرح اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے سیاہ بالوں نے اس کی پیشانی کو کناروں سے چھپا رکھا تھا۔ اور اس کے عیاش مگر پتلے پتلے خوبصورت ہونٹوں میں سے اس کے دانت موتیوں کی طرح چمکتے تھے۔ اس نے اپنے دونوں بازوؤں کو اپنے سینے پر لپیٹ رکھا تھا گویا وہ اس آگ کو دبا رہی تھی جو اس کے نازک جسم کے اندر مشتعل تھی۔ اس کی آنکھیں جو انگوری شراب کی طرح مست تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیواروں کو چیر چیر کر گزر جاتی ہیں۔ اس چیتے کی آنکھوں کی طرح جو کسی پنجرے میں بند ہو۔

بڑی اماں نے کہا "میری بچی بتا ہم تیرے لئے کیا کر سکتے ہیں؟"

اس نے اپنی کمر کو ایک عجیب جنبش دی جس سے اس کا نرم و نازک جسم اس کے ریشمی لباس میں سے تھرتھراتا ہوا نظر آیا۔

بڑی اماں نے کہا "تم رنج اٹھا رہی ہو میری بچی، مجھے میری بہنوں نے بتایا ہے کہ تم دعا نہیں مانگتیں۔ میری بچی، یہ نہایت افسوسناک بات ہے"

رقاصہ مسکرائی، اس کی مسکراہٹ میں ایک لطف تھا، ایسا لطف جو کسی چیز کے چکھنے میں یا کسی راگ کے سننے میں یا ایک طویل بوسے میں ہوتا ہے اور پھر اس نے سر کی ایک جنبش سے انکار کر دیا۔

بڑی اماں نے کہا "تجھے دُکھ دینے کے لئے کوئی کچھ نہ کہے گا۔ میری بیٹی تیرے حال پر سب کو رحم آتا ہے۔ سب تیرے غم کو سمجھتے ہیں۔ کیا تو کوئی کتاب پڑھے گی، یا شراب پئے گی، یا کوئی اور ایسی چیز ہے جو تیرا غم غلط کرنے میں مدد دے سکے؟"

رقاصہ نے اپنے ہاتھ کھول دیئے اور ان کو پھر ملا کر اپنی گردن کے نیچے لے گئی۔ اس کی اس حرکت میں ایک عجیب حسن تھا ایک عجیب لچک تھی جسے دیکھ کر بڑی اماں کے مرجھائے ہوئے رخساروں پر بھی ایک ہلکی سی سرخی نمایاں ہو گئی۔

بڑی اماں نے کہا کیا تو رقص کرنا چاہتی ہے۔ میری بچی؟

یہ سُن کر پھر رقاصہ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پیدا ہو گئی۔ جس میں شراب کا سا کیف تھا مگر اس دفعہ یہ مسکراہٹ پہلے کی طرح فوراً ہی ختم نہ ہو گئی۔ اس نے کہا "ہاں خاتون صاحبہ میں آپ کے لئے رقص کرنے کو تیار ہوں۔ اس سے مجھے راحت حاصل ہو گی"

بڑی اماں نے کہا "بہت اچھا بیٹی۔ تیرا رقص کا لباس منگا لیا جائیگا۔ اور آج شام کے وقت کھانے کے بعد ہم تمہیں رقص کے لئے بلائیں گے۔ اور اگر تو چاہتی ہے کہ موسیقی بھی ہو

توہم پیانو بھی مہیا کر سکتی ہیں۔ بہن میتھابیلڈ موسیقی کی بڑی ماہر ہیں۔"

رقاصہ بولی " ہاں! ہاں۔ موسیقی...... اور ایک سادہ رقص۔ مگر خاتون صاحبہ، کیا مجھے سگریٹ پینے کی اجازت ہے؟"

بڑی اماں نے کہا " ہاں بچی۔ میں تیرے لئے ابھی سگریٹ بھیجتی ہوں"۔

رقاصہ نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ **بڑی اماں** کا کمزور تیلا ہاتھ جس کی نیلی نیلی باریک رگیں صاف نظر آرہی تھیں۔ رقاصہ کے نرم نرم ہاتھ کی گرمی سے مس ہوا تو وہ کانپ گئی۔ آہ کل یہی ہاتھ سرد اور سخت ہو جائیں گے۔ اس نے کہا" اچھا اب ہم رخصت ہوتے ہیں میری بیٹی"۔

"رقاصہ آج ہمارے لئے رقص کرے گی"۔ یہی الفاظ تھے جو ہر زبان پر جاری تھے۔ سب **بہنیں** اسی انتظار میں تھیں۔ انہیں یہ ایک عجوبہ معلوم ہو رہا تھا، کوئی پیانو اٹھا لائی، کسی نے موسیقی کی کتاب مہیا کی۔ اور شام کے کھانے پر آ بیٹھیں۔ سب آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں، کوئی تعجب ظاہر کرتی تھی، کوئی کہتی تھی کہ خانقاہ کی مقدس فضا میں یہ ایک عجیب مداخلت ہو گی۔ اور کسی کی نظروں کے سامنے گزرے ہوئے زمانہ کی تصویریں پھر رہی تھیں۔ غرض کہ اس عجیب و غریب واقعہ نے سب کے دلوں میں ایک ہیجانِ عظیم برپا کر رکھا تھا۔ کھانا بہت جلد ختم ہو گیا۔ میزیں صاف کر کے اٹھائی گئیں دیوار کے سامنے لمبے لمبے بنچ بچھا دیے گئے اور اِن پر ساٹھ کنواریاں رقاصہ کے انتظار میں آ کر بیٹھ گئیں درمیان میں **بڑی اماں** بیٹھیں اور پیانو پر میتھابیلڈ۔

کمرے میں پہلے رقاصہ کی محافظ بہن اور پھر رقاصہ داخل ہوئی۔ رقاصہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کھانے کے لمبے کمرے میں جس کی دیواریں سفید براق تھیں اور جس کا فرش سیاہ لکڑی کا بنا ہوا تھا بڑھتی چلی آتی تھی۔ سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ صرف بڑی اماں بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی کہ کہیں یہ رقص نوجوان دلوں اور خام دماغوں میں وسوسہ نہ ڈال دے۔

رقاصہ نے سیاہ ریشم کا لہنگا پہن رکھا تھا۔ اور اس کی جوتی اور موزے چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی کمر میں ایک خوب چوڑی اور چست مطلا پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ اور اس کا سینہ زربفت کے ایک چست کپڑے سے ڈھنپا ہوا تھا۔ جس کے کناروں پر سیاہ رنگ کی گوٹا ٹکی گئی تھی۔ اس کی باہیں برہنہ تھیں۔ اور ایک سرخ پھول اس کے بالوں میں ایک طرف کو لگا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھی دانت کا ایک پنکھا تھا۔ اور اس نے اپنے ہونٹوں کو سرخی لگا رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا اور اس کا چہرہ بالکل ایک مصنوعی چہرہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کمرے کے وسط میں نیچی نگاہیں کئے کھڑی ہو گئی۔ بہن میتھا یلانڈ نے پیانو بجانا شروع کیا۔ رقاصہ نے اپنا پنکھا اُٹھایا۔ اس اندلسی رقص کے دوران میں وہ بمشکل اپنی جگہ سے ہلی ہو گی۔ اس کے ہاتھ کی جنبشیں اس کے بدن کی لرزشیں، اس کی کمر کی لچک ایک ہی مقام پر محدود رہیں۔ صرف اس کی نگاہوں میں ایک حیات مضطرب معلوم ہوتی تھی جو کنواریوں کی لمبی قطار میں سے کبھی اس چہرے پر پڑتی تھی۔ اور کبھی اس چہرے پہ، ان چہروں پر جن میں ہزاروں قسم کے جذبات ظاہر ہو رہے تھے۔ کہیں شکوک و شبہات تھے، کہیں مسرت، کہیں خوف و ہراس، کہیں حیرت و انبساط، بہن میتھا ئیلڈ نے ساز کو خاموش کر دیا۔ رقاصہ ٹھیر گئی، کنواریوں کی صف میں سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کا ایک شور اُٹھا۔ اور رقاصہ نے اُن کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ بہن میتھا ئیلڈ نے پھر پیانو بجانا شروع کیا۔ یہ ایک پولی رقص کی سُر تھی۔ ایک لمحہ کے لئے رقاصہ اس کو سنتی رہی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے موسیقی کی یہ طرز اُسے کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی ہے۔ پھر اس کے پاؤں ہلنے شروع ہوئے۔ اور اس کے ہونٹ ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔ اس وقت وہ بہت حسین اور مسرور معلوم ہو رہی تھی، بالکل ایک تیتری کی طرح، اس وقت اسے کوئی غم نہ تھا۔ دیکھنے والیوں کے چہروں پہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ اور ان کی زبانوں سے جوشِ مسرت میں بعض مبہم سے الفاظ ادا ہونے لگے ....

بڑی اماں بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی - اس کے دونوں پتلے پتلے ہونٹ خوب زور سے ملے ہوئے تھے اور اس کے دونوں ہاتھوں کی نحیف انگلیاں آپس میں گتھی ہوئی تھیں - گزرے ہوئے ایام کی تصویریں اُسے اُبھرتی اور گرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں جیسے کسی جادو کے ڈبے میں سے نظر آیا کرتی ہیں - وہ ان گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر رہی تھی جب اس کا محبوب جنگ میں مارا گیا تھا، اور اس نے اپنی زندگی مذہب کے حوالے کر دی تھی - کافرینا کی یہ گدگدی صورت جس کے سیاہ بالوں میں سُرخ پھول تھا، جس کا چہرہ سفید تھا، جس کی آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا، اس کے دل میں قدیم زمانہ کی یاد تازہ کر رہی تھی، اُس زمانے کی جب اس کی رسیلی اُمنگیں، اس کے مسرور جذبات ابھی مردہ نہ ہوئے تھے، اور جب وہ ابھی ان کو گرجا میں دفن کرنے کے لئے نہ لائی تھی۔

پیانو کی آواز ذرا رُکی اور پھر ایک نئے رقص کے لئے بیدار ہوئی، افسردہ جذبات میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا - سینوں میں راز تڑپنے لگے - دل ایک دفعہ زور زور سے دھڑکے لیکن پھر تاریکی ہی تاریکی چھا گئی بڑی اماں نے دائیں بائیں نظر دوڑائی، اس نے دانشمندی سے کام نہ لیا تھا کتنے ہی خام دماغ، کتنے ہی نوخیز دل تھے جو اس شعلہ جوالہ سے مشتعل ہو گئے تھے مگر کافر رقاصہ کی ان تاریک گھڑیوں میں تسکین کا سامان بہم پہنچانا بھی تو نہایت ضروری تھا - وہ رقص کر کے خوش ہو رہی تھی ہاں وہ خوش ہو رہی تھی - اور اس کی خوشی میں کتنی طاقت کتنا وزن تھا اس سے انسان ڈر جاتا ہے - تمام آنکھیں اس کے سحر سے مسحور ہو رہی تھیں اسی طرح جیسے سانپ ایک خرگوش کی آنکھوں کو مسحور کر لیتا ہے یہاں تک کہ لُوسی بھی اس سحر سے محفوظ نہ رہ سکی - بڑی اماں اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی - آہ غریب لُوسی! لیکن لُوسی کے خوفزدہ چہرے کے پیچھے اُس نے کیا دیکھا، نوجوان ماری! آہ وہ کس غور سے دیکھ رہی تھی ...... آہ! اس کی آنکھیں اس کے ہونٹ! ...... ماری ...... مجسم شباب ...... بیس برس کی عمر ...... اُس کا عاشق جنگ میں پچھلے ہی سال مرا ہے یہ ماری ...... تمام کنواریوں سے زیادہ خوبصورت! اُس کے ہاتھ ...... اُس نے انہیں کس مضبوطی سے سینے پر باندھ

رکھا تھا۔ اور ہاں ...... رقاصہ ماری ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور اس کے گدگدے آتشین جسم کا پیچ وخم اسی کی طرف متوجہ ہو رہا تھا۔ ماری کے لئے رقاصہ کے لبھانے والے سُرخ ہونٹوں پر بار بار ایک عجیب تبسّم نمودار ہوتا تھا، جس میں شہد کی سی حلاوت ہوتی تھی اور رقص میں ماری کو رقاصہ اپنے لئے ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کوئی شہد کی مکھی اپنے مرغوب پھُول کے اُوپر منڈلا رہی ہو۔ بڑی اماں نے اپنے دِل میں سوچا "کیا مقدس مریم عذرا کا یہی کام میں انجام دے رہی ہوں؛ یا یہ شیطان کا کام ہے"؛

رقاصہ اب تیزی سے بہنوں کی قطار کے پاس سے گزر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چمکیں اس کا چہرہ ایک پُر غرور انداز سے تمتما اُٹھا۔ اس کا تمام جسم سراپا شوکت بن گیا۔ آہ ماری! یہ کیا؟ رقاصہ نے اس پر ایک عجیب نگاہ ڈالی اور اپنے پنکھے سے ایک ہلکی سی ضرب لگائی۔ رقاصہ نے ہوا میں ایک بوسہ لیا۔ ایک آگ سی بھڑک اُٹھی .... کہاں؛

رقاصہ جس طرح آئی تھی، اُسی طرح آہستہ آہستہ کمرے سے چلی گئی اور بوڑھی محافظ بہن اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

بہنوں کی طویل قطار میں سے ایک آہ کی آواز آئی اور ...... ہاں ...... کسی نے ایک سسکی بھی لی۔

بوڑھی اماں نے کہا جاؤ میری بچیو۔ اپنے اپنے کمروں میں چلی جاؤ ...... بہن ماری!" نوجوان راہبہ آگے بڑھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

بڑی اماں نے کہا بہن ماری دعا کرو کہ اس غریب کے گناہ معاف کر دیئے جائیں، مگر ہاں میری بچی، یہ اندوہناک ضرور ہے۔ جاؤ اپنے کمرہ میں اور اس کے لئے دُعا مانگو۔

ماری وہاں سے چل پڑی۔ اس کے انداز میں بھی ایک تمکنت تھی۔ اس کے اعضا میں بھی ایک زیبائش اور حسن تھا۔ بڑی اماں نے ایک آہ کھینچی ....،

صبح ہوئی، سردی زوروں پر تھی۔ دھند ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ زمین پر برف کا ایک چھینٹا پڑا ہوا تھا۔ نماز ہو رہی تھی کہ وہ رقاصہ کو لینے آئے...... بندوق چلنے کی آواز آئی۔ بڑی اماں کانپتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اپنے خدا سے رقاصہ کے لئے دعا مانگنے لگی......"

اس شام انھوں نے ماری کو بہت تلاش کیا لیکن وہ نہ ملی۔ دو دن کے بعد ایک خط آیا:۔

"اماں مجھے معاف کر دو۔ میں دنیا کی زندگی میں واپس چلی گئی ہوں۔"

"ماری"

بڑی اماں خاموش رہ گئی۔ زندگی! موت کے بعد! اس کے پردۂ خیال پر نقوش حرکت کرنے لگے...... رقاصہ کا چہرہ اس کے سیاہ بالوں میں سرخ پھول، سیاہ آنکھیں، سرخ لب، پھر ان پر اس کی انگشتِ پا کا ایک مس، اور پھر ایک بوسے کے ساتھ اس کا الگ ہونا، یہ سب مناظر ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے سے گزر گئے۔

"جان گالزوردی"

قیدی

لندن کے ایک باغ میں گرمیوں کی ایک سہانی صبح کا ذکر ہے۔ پرندے ابھی اپنے بہارین نغمے گا رہے تھے اور درخت ابھی پھولوں سے لدے ہوئے تھے، کہ یکایک ہمارے دوست نے کہا "کہیں مینا بول رہی ہے"۔

کستورے یہاں تھے اور تو تی پھدکیاں بھی اکثر نظر آجاتی تھیں، رات کو اُلّو بھی بولتا تھا اور

سال میں ایک دفعہ کوئل بھی کینٹ اور سرے کے علاقوں سے بھول بھٹک کر درختوں کے اِس سرسبز جزیرے میں آنکلتی تھی، مگر مینا ہم نے یہاں کبھی نہ دیکھی تھی۔

ہمارے دوست نے کہا "وہ دیکھو! پھر اُس طرف سے آواز آئی!" وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور گھر کی طرف چل دیا جو پاس ہی واقع تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اپنی جگہ پر بیٹھ کر کہنے لگا "مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ لوگ بھی پنجروں میں جانور رکھنے کے شائق ہیں"۔ ہم نے کہا "یہ بُلبل ہمارے باورچی نے پال رکھا ہے"۔

"ناہنجار" اُس کے مُنہ سے یہ لفظ بے ساختہ نکل گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دِل میں کوئی نہایت زبردست احساس بیدار ہو گیا ہے جس کو ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔

یکایک وہ یوں برس پڑا:۔

"میں کسی چیز کو محبوس دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ پرندے ہوں یا آدمی۔ مجھے اس خیال ہی سے نفرت ہے"۔ پھر ہماری طرف غضب آلود نگاہوں سے دیکھ کر، گویا ہم نے اُس سے یہ باتیں کہلوا کر کوئی فائدہ حاصل کر لیا ہے۔ اُس نے فوراً ہی اپنا سلسلۂ کلام شروع کر دیا:۔

"چند سال کا ذکر ہے کہ مَیں جرمنی کے ایک شہر میں اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھیرا ہوا تھا، جو اُن دنوں تمدنی معاملات کے متعلق کچھ تحقیقات کر رہے تھے۔ ایک دن وہ کسی قید خانے کے معائنہ کے لئے جا رہے تھے کہ انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے اِس سے پہلے کبھی کوئی قید خانہ نہیں دیکھا تھا اس لئے مَیں اُن کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔ اُس دن بھی آج کی طرح مطلع بالکل صاف تھا، ہر چیز پر وہی سرد جگمگاہٹ رقص کر رہی تھی جو صرف جرمنی کے بعض علاقوں میں نظر آیا کرتی ہے۔ قید خانہ جو شہر کے عین وسط میں واقع تھا، اُن قید خانوں میں سے تھا جو پینٹن وِل

کے نقشے کے مطابق ستارے کی شکل کے بنائے گئے تھے۔ قید خانے کا دستور اور نظام وہی تھا جو سالہا سال گزرے یہاں رائج تھا۔ جرمن اُس وقت بھی اور اس میں شک نہیں کہ اب بھی قیدیوں کو کامل تنہائی کی جانکاہ تعذیر میں مبتلا کرنے کے بیہودہ خیال کو اپنے دِل میں جگہ دیئے ہوئے ہیں لیکن اُس زمانہ میں یہ اُن کے لئے ایک نیا کھلونا تھا اور وہ پورے مجنونانہ جوش کے ساتھ اس پر عمل پیرا تھے یہ اُن کی عادت ہے کہ جس کام کو وہ شروع کرتے ہیں، اُس میں ایسا ہی انہماک دکھاتے ہیں۔ میں قید خانے کے متعلق کچھ بیان نہیں کرنا چاہتا۔ نہ یہ کہ ہم نے اُس میں کیا کیا دیکھا۔ جن خوفناک طریقوں اور اصولوں پر ایک ایسا محکمہ چل سکتا ہے اُن سب پر یہاں عمل کیا جاتا تھا۔ بلکہ میں یہ کہنے کی جرأت بھی کروں گا کہ انتظام اچھا تھا۔ اور قید خانے کے حاکم نے بھی ہر موقع پر اپنی ذات کے متعلق مجھ پر اچھا اثر ڈالا میں تمہیں صرف ایک بات بتانا چاہتا ہوں، جس کو میں نہ بھولوں گا۔ اور جس نے مجھے ہمیشہ کے لئے جانداروں کو اسیر کرنے کا احساس کرا دیا، خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان، بڑے ہوں یا چھوٹے"۔

ہمارا دوست یہاں ٹھیر گیا۔ پھر ایک ایسی آواز کے ساتھ جس میں کچھ اور طیش ملا ہوا تھا۔ اور جیسے یہ طیش اُسے اپنی خاموش فطرت کے خلاف بغاوت کرنے پر آ رہا تھا، اُس نے کہا:۔

"جب ہم نے اُس مقام کو جس کے در و دیوار خاکی رنگ کے تھے اچھی طرح دیکھ لیا تو حاکم قید خانہ نے میرے دوست سے دریافت کیا۔ "کیا آپ ایک دو عمر قیدی بھی دیکھنا چاہتے ہیں؟ میں آپ کو ایک ایسا شخص دکھاؤں گا جسے یہاں رہتے ہوئے ستائیس سال ہو گئے ہیں"۔ مجھے اُس کے الفاظ اب تک یاد ہیں۔ اُس نے کہا۔ "وہ تنہائی کی قید سے کچھ فرسودہ سا ہو گیا ہے"۔ جب ہم اس قیدی کی کوٹھڑی کی طرف جا رہے تھے تو انہوں نے ہمیں اُس کی سرگزشت سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی وہ لڑکا ہی تھا کہ ایک فرنیچر بنانے والے نے مددگار کے طور پر اُسے اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ مگر اُس نے نقب زنوں کی ایک ٹولی کے ساتھ مِل کر اپنے آقا کو لوٹنے کا ارادہ کیا، ڈاکے کے دوران میں اُس نے بدحواسی کے

عالم میں ایک ہی ایسا وار کیا ۔ کہ کارخانہ دار اُسی جگہ مرگیا ۔ قاتل کے لئے موت کا حکم دیا گیا ۔ مگر حکومت کی سفارش سے جو اُن دنوں جنگِ ساڈووا کے خونیں نظاروں کو دیکھ دیکھ کر گھبرا گئی تھی ، اُس کی سزا عمر قید میں تبدیل ہو گئی ۔"

جب ہم اُس کی کوٹھڑی میں داخل ہوئے ۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا اپنے کام کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ گو اُس کی عمر چالیس سال سے کسی صورت میں بھی زیادہ نہ ہو گی لیکن وہ ساٹھ سال سے کم کا معلوم نہ ہوتا تھا ۔ اُس کا جھکا ہوا قد اور کانپتا ہوا تباہ شدہ جسم ایک میلے رنگ کی چادر سے جو پوشاک کے بچاؤ کے لئے پہنی جاتی ہے ڈھنپا ہوا تھا ۔ اُس کے چہرے کا رنگ مٹیلا پڑ گیا تھا اور اُس میں وہی انداز آ گیا تھا جو عموماً قیدیوں کی شکلوں میں نمایاں ہو جاتا ہے ، اُس کے نقوش بالکل بدنما ہو گئے تھے ۔ اُس کے رخساروں میں گڑھے پڑ گئے تھے ، اُس کی آنکھیں بڑی بڑی نظر آنے لگی تھیں اُن کا رنگ مجھے بھول گیا ہے ...... مجھے اس میں شک ہے کہ اُن میں کوئی رنگ تھا بھی ۔ جب ہم ایک ایک کمرے کے آہنین دروازے سے اندر داخل ہوئے تو اُس نے تعظیم کے لئے اپنی ٹوپی سر سے اُتاری جو اُن تمام چیزوں کی طرح جو اُس نے پہن رکھی تھیں مٹیالے رنگ کی تھی ۔ اُس کے سر میں بھی جس پر اب بہت تھوڑے بال نظر آ رہے تھے خاک پڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ وہ ہمارے سامنے سیدھا کھڑا ہو گیا اور مسکین نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا ، اسی طرح جیسے ایک اُلو دن کی روشنی کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے ۔ کبھی تم نے کسی چھوٹے بچے کو دیکھا ہے جو پہلی مرتبہ بیمار ہوا ہو ، وہ اپنی حالت کو دیکھ دیکھ کر کتنا حیران اور پریشان ہوتا ہے ۔ بس یہی حالت اُس کی تھی ۔ لیکن اُس کی صورت میں ایک غیر معمولی مسکنت تھی ۔ ہم نے بہت سے قیدیوں کو دیکھا تھا مگر اُن سب میں یہی ایک تھا جس کی طبیعت میں ایک خوفناک حلم تھا ۔ جب وہ اپنی کانپتی ہوئی آواز میں ہاں صاحب ..... نہیں صاحب کہتا تھا ۔ تو اُس کی کمزوری اور نرمی سے عجیب یاس ٹپکتی تھی ۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ اُس میں قوت

ارادی کی ایک رمق بھی باقی نہ رہی تھی۔

ہمارا دوست یہاں رُکا۔ اور اپنے دل میں اس نظارے کا تصوّر لانے پر بھی اُس کی پیشانی پر ایک بل پڑ گیا۔ اُس نے کہا:۔

"اُس کے ہاتھ میں سخت کاغذ کا ایک ورق تھا جس پر وہ بہرے اور گونگے اشخاص کے لئے ایک خاص طرزِ تحریر میں نئے عہد نامہ کی کچھ عبارت نقل کر رہا تھا۔ جب وہ ہمیں یہ بتانے کے لئے کہ گونگے اور بہرے اسے کس آسانی سے پڑھ سکتے ہیں اپنی انگلیاں کاغذ کے حروف پر پھیر رہا تھا۔ تو ہم نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ ایک چکی چلانے والے کی طرح گرد آلود ہو رہے تھے، کوٹھڑی میں گرد کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ گرد نہ تھی جو اُس کے ہاتھوں پر جمی ہوئی تھی۔ بلکہ انسانی پودے کا وہ فضلہ تھا جو بیج پنتے وقت نکل آتا ہے۔ جب وہ کاغذ اوپر کو اُٹھاتا تھا۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی جھینگے کا پر کانپ رہا ہے۔ ہم نے اُس سے پوچھا کہ یہ قاعدہ جس کے مطابق تم لکھ رہے ہو کس کا ایجاد کیا ہوا ہے۔ اور ہم نے کسی کا نام بھی لیا۔ اُس نے کہا "نہیں، نہیں۔" وہ صحیح نام یاد کرنے کی کوشش کی شدت سے کھڑا کانپ رہا تھا۔ آخر اُس نے اپنا سر جھٹکا لیا، اور دھیمی آواز سے کہنے لگا "آہ! میں نہیں بتا سکتا۔" پھر یکایک وہ نام اُس کی زبان پر آ گیا۔ اُس وقت وہ پہلی مرتبہ اپنی ہیئت میں انسان نظر آیا۔ آزادی کی قدر و قیمت، دوسروں سے ہمارے تعلقات کے حقیقی معانی، آواز، دل اور نظروں کے ذریعہ سے لمحہ بہ لمحہ ہمارے دلوں کے انجلا کی غرض کسی بات کو یاد رکھنا اور پھر اُس کے استعمال کی ضرورت، اِن سب کو اس سے پہلے میں کبھی نہ سمجھا تھا۔ اُس شخص کے لئے تم جانتے ہو، اپنی زندگی میں یادداشت کے استعمال کا کوئی موقع نہ تھا۔ وہ اُس پودے کی مانند تھا جسے ایک ایسے مقام پر لگایا گیا ہو جہاں شبنم کا گزر تک نہ ہو سکے۔ وہ کیفیت جو محض ایک نام کے یاد آ جانے سے اُس کے چہرے پر نمایاں ہو گئی بالکل ایسی ہی تھی جیسے کسی سُوکھے ہوئے درخت

پر صرف ایک سبز پتہ باقی رہ گیا ہو۔ سنو! انسان ایک حیرت انگیز چیز ہے، کوئی مخلوق نہیں جو انسان کی طرح مصائب برداشت کر سکے ۔"

ہمارا دوست اپنی جگہ سے اُٹھا اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

"اُس کی دنیا بڑی وسیع نہ تھی۔ ایک ہی کمرہ تھا جو زیادہ سے زیادہ پانچ گز لمبا اور چار گز چوڑا تھا۔ وہ اس میں ستائیس سال گزار چکا تھا۔ بالکل بے مونس و بے یار۔ اِن قید خانوں کا انتظام اتنا زبردست ہوتا ہے کہ کوئی پرندہ تک پاس نہیں پھٹک سکتا۔ ذرا سوچو کہ زندگی کی اس جانکاہ منزل میں سے گزرنے کے لئے اور جسم و روح کا اتحاد برقرار رکھنے کے لئے آدمی کی کتنی قوت صرف ہوتی ہوگی۔"

وہ ہماری طرف مڑ کر کہنے لگا:۔

"تم کیا خیال کرتے ہو کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اُس کے ہوش و حواس کو اِس حد تک بھی برقرار رکھا ہوا تھا؟ میں تمہیں بتاتا ہوں:۔ ابھی ہم اُس کی اس تحریر کو دیکھ ہی رہے تھے کہ اُس نے ہمارے ہاتھ میں لکڑی کا ایک تختہ دے دیا۔ جو ایک بڑی تصویر کے برابر تھا۔ یہ ایک نوجوان لڑکی کی تصویر تھی جو ایک باغ کے عین وسط میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اور جس کے ہاتھ میں رنگ برنگ کے پھول تھے۔ اُس کے پیچھے ایک چھوٹی سی ندی بل کھاتی ہوئی گزر رہی تھی، کچھ گھاس تھی۔ اور ندی کے کنارے پر ایک عجیب و غریب قسم کا پرندہ بیٹھا ہوا تھا جو پہاڑی کوّے سے مشابہ معلوم ہوتا تھا۔ لڑکی کے ایک طرف ایک درخت تھا جو بھاری بھاری پھلوں سے لدا ہوا تھا۔ اِن پھلوں میں ایک ایسا تناسب تھا جو کبھی کسی درخت میں نظر نہیں آیا۔ پھر اس میں ایک ایسی بات بھی تھی جو تمام درختوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اِن پھلوں میں جان ہے۔ اور وہ انسان کے دوست ہیں۔ لڑکی اپنی گول گول آنکھوں سے سیدھا ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ پھول جو اُس کے ہاتھ میں ہیں وہ بھی ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ تمام تصویر

...... میں کیا کہوں ...... ایک معجزہ نظر آتی تھی - خام رنگوں کی نمائش سے یہ بالکل قدیم اطالوی مصوری کا نمونہ معلوم ہوتی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کی تکمیل کے لئے مشکلات پر غلبہ حاصل کرنے میں انتہائی جانفشانی سے کام لیا گیا ہے - ہم میں سے ایک نے اُس سے سوال کیا کہ کیا اُس نے تصویر بنانا زمانہ قید سے پہلے سیکھا تھا - لیکن اُس غریب کو ہمارا سوال سمجھنے میں غلطی ہوئی اور وہ کہنے لگا - نہیں نہیں منتظم صاحب جانتے ہیں کہ میرے پاس کوئی نمونہ نہ تھا - یہ میرا اپنا ہی تخیّل ہے - وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا مگر اُس کی مسکراہٹ شیطان کو بھی رُلا دینے والی تھی - اُس نے اِس تصویر میں وہ تمام چیزیں رکھ دی تھیں جن کے لئے اُس کی روح بے قرار تھی ...... عورت، پھول، پرندے، درخت نیلا آسمان، بہتا ہوا پانی، اور اپنے وہ تمام حسیات و جذبات جو اُس کے دِل میں اِن تمام چیزوں کی دُوری سے پیدا ہوتے تھے - ہمیں بتایا گیا کہ اُس نے اِس تصویر کو اٹھارہ سال میں بنایا ہے - اِس عرصے میں وہ اِسے بار بار مٹاتا رہا اور بار بار بناتا رہا - اور موجودہ تصویر اُس کا سوواں نقش تھا - یہ ایک شاہکار تھا - ہاں - وہ ستائیس سال سے وہاں رہتا تھا - اُس کو زندہ رکھنے کے لئے اِس جیتی جاگتی موت کے مُنہ میں دھکیل دیا گیا تھا - جہاں اُس کے حواس معطّل پڑے ہوئے تھے، دیکھنے، سننے، سُونگھنے اور کسی چیز کو محسوس کرنے کا خیال تک اُس کے حافظہ سے محو ہو چکا تھا - اُس کی بھُوکی روح کا تصوّر صرف اُس لڑکی کی تصویر رہ گئی تھی، جس کی آنکھیں متحیّر تھیں اور جس کے ہاتھ میں پھُول تھے - بیشک یہ تصویر انسانی ولولے اور شوق کی فتح الفتوح تھی - اور کمالِ فن کا عظیم ترین اظہار تھا جو تمام عمر میں پہلی مرتبہ میرے دیکھنے میں آیا

ہمارے دوست کے چہرے پر مختصر سی مسکراہٹ آئی -

"اِنسان کا دِل اتنے پردوں میں محفوظ ہے کہ اُس شخص کی مصیبت کا پورا پورا احساس مجھے تب بھی نہ ہوا گو بعد میں مَیں نے اُسے محسوس کر لیا - جب حاکمِ قید خانہ نے اُس سے اُس کی صحت

کی نسبت کچھ پوچھا اور وہ جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس وقت میں نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ آہ! میں اپنی موت کے دن تک بھی اُن آنکھوں کو نہ بھول سکوں گا۔ وہ حزن مجسم تھیں ...... سکوت و تنہائی کی وہ تمام ابدیتیں جو اُس نے گزاردی تھیں اور سکوت و تنہائی کی وہ تمام ابدیتیں جو ابھی قبر تک پہنچنے کے لئے اُسے گزارنی تھیں اُن آنکھوں میں سے جھانک رہی تھیں۔ مگر اُن تمام آزاد انسانوں کی آنکھوں کی رحم انگیز المناکیاں جن کو میں نے عمر بھر میں دیکھا ہے یکجا جمع کر لی جائیں تو پھر بھی وہ اُن آنکھوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گی۔ میں اُن کی تاب نہ لاسکا۔ اور جلد ہی اُس کوٹھڑی سے باہر آگیا۔ اُس وقت دکھ اور تکلیف کے اُس تقدس کا احساس مجھ میں پیدا ہؤا اور اب تک میں اُسے محسوس کرتا ہوں۔ جو کہتے ہیں کہ روسیوں میں باوجود اُن کے وحشیانہ پن کے موجود ہے۔ اُس وقت مجھے ایسا محسوس ہؤا جیسے ہم سب کو اُس کے سامنے جھک جانا چاہیئے تھا۔ میں بے گناہ اور آزاد تھا، مگر اُس کے سامنے اپنا وجود مجھے مقید اور گنہگار معلوم ہوتا تھا۔ جو جرم بھی اُس سے سرزد ہؤا تھا۔ مجھے اُس کی کوئی پرواہ نہیں۔ اُس برباد شدہ انسان کے خلاف ایسا گناہ کیا گیا تھا کہ مجھے اپنی ذات اُس کے پاؤں کی خاک معلوم ہو رہی تھی۔ جب میں اُس کی نسبت خیال کرتا ہوں تو اپنی نوع کے خلاف میرا جوش دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اُس وقت ساری دنیا کے محبوس جانداروں کا درد میرے ایک سینے میں آکر اُٹھتا ہے۔"

ہمارے دوست نے اپنا مُنہ دُوسری طرف پھیر لیا۔ اور پورے ایک منٹ تک وہ خاموش رہا آخر اُس نے کہا:۔

واپسی پر ہم سٹیڈ پارک میں سے گزرے۔ وہاں آزادی کی پوری شان نظر آتی تھی۔ روشنی کافی تھی، سیب، لیموں، انجیر، شاہ بلوط، صنوبر اور سفیدہ غرض ہر قسم کے درختوں کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔ ہر ٹہنی اور ہر پتا خوشی سے چمک رہا تھا۔ پرندے جو آزادی کا نشان ہیں۔ اِدھر اُدھر اُڑتے پھرتے

تھے۔ اور انھوں نے اپنی نغمہ ریزیوں سے سارے چمن کو سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ تمام خطہ ایک مسحور سرزمین معلوم ہوتا تھا۔ اور مجھے اچھی طرح یاد ہے، مجھے اُس وقت خیال آیا کہ صرف انسان اور مکڑی ہی دو ایسی مخلوقات ہیں جو دوسرے جانداروں کو اس طرح عذاب دے دے کر ہلاک کرتے ہیں۔ اور دونوں میں سے پھر صرف انسان ایسا ہے۔ جس کا دِل اپنی نوع کو تباہ کرنے پر بھی نہیں پسیجتا۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ تاریخِ فطرت کی ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے اور میں تم سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس شخص کی آنکھوں کو اور اُن آنکھوں کے دُکھ اور درد کو ہمیشہ کے لئے ایک مرتبہ دیکھ لینے سے، جس طرح میں نے انہیں دیکھا اپنی نوع کے متعلق اِس قسم کا خیال تک ہمارے دِل سے محو ہو جاتا ہے۔ اُس رات میں ایک قہوہ خانے کی کھڑکی کے پاس بیٹھا ہؤا تھا، مختلف قسم کے ساز بج رہے تھے، لوگ ہنس رہے تھے۔ اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بازار میں سے ہر قسم کے آدمی —— دوکاندار، سپاہی، تاجر، دفتروں میں کام کرنے والے، پادری، بھیک مانگنے والے، خوش رہنے والی عورتیں گزر رہے تھے۔ روشنی کھڑکیوں میں سے چھن چھن کر باہر نکلتی تھی۔ اور درختوں کے پتے گہرے نیلے آسمان کے نیچے جھوم رہے تھے۔ لیکن میں نہ کچھ سُنتا تھا نہ دیکھتا تھا۔ میرے سامنے صرف وہ مسکین اور غریب چہرہ تھا۔ اُس کی پُر درد آنکھیں تھیں۔ اُس کے کانپتے ہوئے ہاتھ تھے۔ اور وہ تصویر تھی جو اُس نے اُس جہنم میں تیار کی تھی اور اُس کے بعد جب کبھی میں نے کسی قیدی کو دیکھا ہے یا کسی قیدی کے متعلق کچھ سنا ہے۔ میرے سامنے یہی نقشہ آگیا ہے۔"

ہمارا دوست خاموش ہو گیا۔ ذرا سی دیر کے بعد وہ اُٹھا اور عذر خواہی کرتا ہؤا چلا گیا۔

"جان گالزوردی"

امیر عبدالرحمٰن کا فیصلہ

۱۸۸۷ء

اعلیٰ حضرت عبدالرحمٰن خان جی ۔سی ۔ایس ۔آئی امیر افغانستان ۔ علیا حضرت ملکہ انگلستان و قیصرِ ہند کے وفادار دوست ایک ایسے عالی مرتبہ انسان ہیں جن کی عزت تمام صحیح الدماغ لوگوں کے دلوں میں ہونی چاہیے ۔ اکثر والیانِ سلطنت کی طرح وہ بھی ویسی حکومت نہیں کر سکتے جیسی وہ کرنا چاہتے ہیں ۔ کیونکہ ان کی قبائے سلطنت ایک ایسی قوم کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے ۔ جو دنیا کی سب قوموں سے زیادہ سرکش تصور کی جاتی ہے ۔ افغان کے دل سے ملک کے قانون اور بادشاہ کا تمام احترام اس وقت اُٹھ جاتا ہے ۔ جب اُسے خود اپنا نفس بغاوت پر آمادہ کرتا ہے ۔ وہ طبعاً چور ہے ۔ وہ موروثی طور پر قاتل ہے بلکہ اُسے تربیت ہی ایسی دی جاتی ہے کہ وہ آزادانہ اور وحشیانہ طریق پر بد اخلاق ہو ۔ اس کے باوجود عزت اور غیرت کے معاملہ میں اس کا کج مج تصور ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کی سیرت مطالعہ کے لئے ایک حیرت انگیز چیز ہے ۔ بعض اوقات وہ بغیر کسی وجہ کے لڑ پڑتا ہے خواہ پھر اُس کے پرخچے ہی اڑ جائیں مگر بعض اوقات وہ لڑنے سے اس وقت تک محترز رہتا ہے ۔ جب تک دُوسرا اُسے دھکیلتا دھکیلتا کسی کونے کے اندر نہ ڈال دے ۔ جس واقعہ کا مجھے یہاں ذکر کرنا ہے اُس میں افغان کی اس بے دلیل منطق کا ذکر ہے جو بھیڑیئے کو غریب جانوروں کے پھاڑ کھانے پر مجبور کرتی ہے +

کچھ اس قسم کے لوگ ہیں جن پر اعلےٰ حضرت اس ایک ہی حربہ کو ہاتھ میں لے کر حکومت کرتے ہیں جسے ان کی قوم کے لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔ یعنی موت کا خوف جو بعض مشرقیوں کے نزدیک عقل و دانش کا سرچشمہ ہے ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ امیر کا بس وہیں تک چلتا ہے ۔ جہاں تک بندوق کی گولی مار کرتی ہے

لیکن چونکہ ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ کب ان کا بادشاہ ان کے درمیان آموجود ہوگا۔ اس لئے ان پر ہر وقت ایک قسم کا خوف مسلط رہتا ہے۔ اور چونکہ زمامِ سلطنت تمام تر اعلیٰحضرات ہی کے ہاتھ میں ہے اس لئے اُن کی عزت تمام لوگوں کے دلوں میں غیر معمولی طور پر بڑھی ہوئی ہے۔ غلام حیدر سے جو افغان فوج کا کمانڈر ان چیف ہے۔ لوگ بجا طور پر خائف ہیں۔ کیونکہ اسے سُولی دینے کے اختیارات حاصل ہیں۔ کابل کا تمام شہر گورنر سے ڈرتا ہے۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں بھی موت و زیست کی قدرت ہے لیکن امیر افغانستان کی ذات ان وحشی قبائل کے لئے رئیس یا گورنر سے بہت زیادہ باہیبت واقع ہوئی ہے۔ ان کے الفاظ سُرخ قانون کا حکم رکھتے ہیں۔ ان کے غصہ کی آندھی کے آگے انسان کی زندگی اپنے شجر سے پتے کی طرح ٹوٹ پڑتی ہے۔ اور ان کا انعام و اکرام خطرناک ہے۔ انہوں نے بڑی بڑی مصیبتیں برداشت کی ہیں اور تخت نشینی سے پہلے وہ مدتوں حیران و بے خانماں پھرے ہیں اسی لئے وہ اپنی رعایا کے ہر طبقہ کے حالات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ مشرق کے دستور کے مطابق ہر وہ مرد یا عورت جسے کوئی شکایت ہو یا جسے دشمن سے کوئی بدلہ لینا ہو حق رکھتا ہے کہ دربار میں حاضر ہو کر بادشاہ سے بالمشافہ گفتگو کرے۔ یہ شخصی حکومت ہے، ایسی حکومت جیسی ہارون الرشید کی حکومت تھی جس کا آئین دنیا میں اب تک دائر و سائر ہے۔ اور اس وقت بھی دائر و سائر رہے گا، جب انگریزوں کا دور گزرے مدتیں ہو چکی ہونگی۔

لیکن بادشاہ سے آزادانہ گفتگو کا حق بھی یقیناً خطرہ سے خالی نہیں۔ بادشاہ ایک آدمی کو اس کی صاف گوئی پر خوش ہو کر اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا سکتا ہے۔ لیکن اسی وقت ایک دوسرے شخص کی آزادہ روی اس کو تلوار کے گھاٹ اُتار سکتی ہے۔ وہ تلوار جس کی دھار اسی کام کے لئے چمکتی رہتی ہے اور لوگ اُسے دیکھنا بھی یوں ہی چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ اُن کا حق ہے۔

ایک دِن کا واقعہ ہے کہ امیر نے اپنا روزانہ کام انجام دینے کے لئے بابر باغ کو منتخب کیا

جو شہر کابل سے کچھ فاصلہ پر واقع ہے۔ ان کے سامنے ایک ہلکی سی میز رکھی تھی۔ اور اس کے ارد گرد کھلی ہوا ہیں تمام اُمرا وزرا درجہ بدرجہ جمع تھے۔ درباری اور جاگیردار ـــــــ خاندانی لوگ، وہ لوگ جو دوسروں کا خون چُوس چُوس کر پلتے ہیں! اور پھر جن کا خون بادشاہ کی طرف دیکھ دیکھ کر خشک ہوتا ہے۔ ایک بے قاعدہ سا حلقہ باندھے میز کے گرد کھڑے تھے، اور کابل کے باغوں کی ہوا ان کے سروں پر چلتی تھی۔ تمام دن پسینہ میں شرابور ہرکارے خط لے لے کر آتے رہے کہ فلاں ضلع میں بغاوت ہو گئی فلاں مقام پر ایک سازش نشوونما پا رہی ہے۔ فلاں جگہ قحط پڑ گیا۔ فلاں رئیس نے قرضہ ادا نہیں کیا۔ یا فلاں مقام پر سڑک کے اوپر خزانہ پایا گیا۔ دن بھر اعلیحضرت ان پیغامات کو پڑھتے رہے۔ ان میں سے ایسے خطوط جن کا زیادہ مخفی رکھنا ضروری نہ ہوتا اسی وقت ان عمال کے حوالے کر دیئے جاتے جن سے وہ متعلق ہوتے یا کبھی کبھی کسی رئیس کو بلا کر اس سے بعض امور کے متعلق جواب طلب کیا جاتا۔ پھر وہ پُرہیبت سر جس پر سیاہ رنگ کی استرخانی ٹوپی رکھی ہوتی ایک خوفناک انداز سے جنبش میں آتا اور وہ رئیس پھر اپنی جگہ پر جا کھڑا ہوتا۔ اسی دن سہ پہر کے قریب ایک عورت آئی اور اس نے اپنے خاوند سے طلاق حاصل کرنے کا مطالبہ کیا۔ وجہ یہ بتائی کہ اس کے سر پر بال نہیں ہیں۔ امیر نے دونوں کے بیانات سُنے اور عورت کو حکم دیا کہ وہ اپنے خاوند کے سر پر دہی ڈالے اور پھر اُسے اِس وقت تک چاٹتی رہے کہ اس کے سر پر بال اُگ آئیں۔ اور اُسے طلاق لینے کی ضرورت نہ پڑے اس پر تمام دربار ہنس پڑا اور وہ عورت اپنے بادشاہ کو زیر لب صلواتیں سناتی ہوئی رخصت ہو گئی، لیکن جب شفق نمودار ہو رہی تھی اور دربار کی کارروائی سُست سی پڑ گئی تھی۔ اس وقت بادشاہ کے سامنے ایک کانپتے ہوئے وحشی کو لایا گیا۔ مکّوں اور گھونسوں سے لوگوں نے اُس کا بُرا حال کر رکھا تھا۔ لیکن وہ مضبوط اور طاقتور آدمی تھا۔ اس نے تین روپے چُرائے تھے۔ یہ معمولی بات تھی مگر اعلیحضرت اس قدر چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے خود مواخذہ کرتے ہیں،

اعلیحضرت۔ تم نے چوری کیوں کی؟

چور۔ میں غریب تھا اور مجھے کسی نے کچھ نہ دیا۔ میں بھوکا تھا۔ اور میرے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔

اعلیحضرت۔ تم نے مزدوری کیوں نہ کرلی؟

چور۔ اے غریبوں کو پالنے والے! مجھے مزدوری نہیں ملی اور میں بھوک سے مر رہا تھا۔

اعلیحضرت۔ تم جھوٹ کہتے ہو۔ تم نے شراب کے لئے نفس پرستی کے لئے سُست رہنے کے لئے چوری کی۔ بھوک کے لئے چوری نہیں کی۔ کیونکہ جو شخص چاہے، اِسے اپنے قوت لایموت کے لئے مزدوری مِل سکتی ہے۔

قیدی نے اپنی آنکھیں جھکالیں۔ وہ ایک مرتبہ پہلے بھی دربار میں حاضر ہوچکا تھا۔ اور وہ اس لہجے کو خوب پہچانتا تھا۔ جو موت کا حکم دیتے وقت امیر کی گفتگو میں پیدا ہوجایا کرتا تھا۔

اعلیحضرت۔ ہر شخص کو مزدوری مِل سکتی ہے۔ اس حقیقت کو مجھ سے بہتر کون جانتا ہے۔ اِسلیئے کہ میں خود بھوکا رہا ہوں۔ مگر تمہاری طرح نہیں۔ حرامی پلے۔ بلکہ قسمت کے انقلاب اور خدا کی مرضی کے ماتحت ایک شریف اور دیانت داراں ان کی طرح۔

امیر کو اور طیش آگیا اور اس نے اپنی تلوار کے دستے کو اپنی کہنی سے ایک طرف ہٹا کر اپنے عمائدِ سلطنت سے جو ایک قطار کے اندر کھڑے تھے مخاطب ہوکر کہا:۔

تم نے اس ابن الکذب کی باتوں کو سن لیا؟ سنو میں تمہیں ایک سچی کہانی سناتا ہوں۔ میں بھی ایک مرتبہ بھوکا مر رہا تھا۔ بھوک کی شدت سے میری آنتیں سکڑ رہی تھیں اس لئے میں نے اپنی پیٹی کو پیٹ پر کس کر باندھ رکھا تھا۔ اور میں اکیلا بھی نہیں تھا کیونکہ میرے ساتھ کوئی اور بھی تھا جس نے میرے ان بُرے دنوں میں میری رفاقت سے کبھی مُنہ نہ موڑا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب دشمن میری جان کے درپئے پھرتے تھے اور جب میں ابھی اس تخت پر متمکن نہیں ہؤا تھا۔ بلکہ قندھار

کی گلیوں میں ایک بے خانماں کتے کی طرح بھٹکتا پھرتا تھا۔ جو نقدی میرے پاس تھی۔ وہ برف کے تودے کی طرح گلتی گئی، گلتی گئی، گلتی گئی۔ یہاں تک کہ........ امیر نے اپنی ہتھیلی حاضرین کے سامنے کھول دی۔ اور روز بروز میں زار و نزار ہو ہو کر اپنے اس مصیبت و ابتلا کے رفیق کے پاس واپس جاتا رہا اور خدا ہی جانتا ہے کہ ہم دونوں یہ دن کیونکر کاٹتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن میں نے اپنا بہترین لحاف لیا...... ریشم، اور اس پر ایران کا اعلےٰ درجہ کا کام بنا ہوا۔ ایسا جیسا آج کل کوئی کبھی نہیں بنا سکتا۔ گرم، اور دو آدمیوں کے اوڑھنے کے قابل۔ اور یہی ایک چیز تھی جو ہمارے پاس موجود تھی۔ میں اس کو ایک ساہوکار کے پاس لایا جو پاس ہی ایک گلی میں رہتا تھا اور اس پر تین روپے مانگے۔ اس نے مجھ سے کہا...... "میں جو آج بادشاہ ہوں، تم چور ہو"۔ میں نے کہا: "مگر ایک عالی خاندان کا فرد۔ ایک شہزادہ مگر بھوکا ہوں"۔ اس نے کہا: "ہاں! ہاں۔ آوارہ گرد منگتوں کا شہزادہ۔ مگر میری جیب میں اس وقت کچھ نہیں۔ میرے محرّر کے ساتھ جاؤ اور وہ تمہیں میرے گھر سے ڈھائی روپے دے دیگا۔ اور اس سے زیادہ میں تمہیں ہرگز نہ دونگا۔ میں محرّر کے ساتھ ساہوکار کے گھر پر گیا۔ ہم دونوں راستے میں باتیں کرتے رہے اور اس نے مجھے ڈھائی روپے دے دیئے۔ ہم کچھ دن تک اس پر گزران کرتے رہے۔ مگر جب ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہ رہا تو ہم پر نہایت سختی گزرنے لگی۔ اس کے بعد اس محرّر نے مجھ سے کہا —— اور وہ ایک نیک دل نوجوان تھا: "میرا خیال ہے کہ ساہوکار اس لحاف پر ابھی تمہیں کچھ اور بھی دے دیگا"۔ اور اس نے خود مجھے دو روپے اور پیش کئے۔ میں نے ان کو واپس کر دیا اور کہا: "نہیں ان کے بدلے تم مجھے کچھ کام مہیا کر دو۔ اور میں۔ ہاں میں۔ عبدالرحمٰن امیر افغانستان روزانہ ایک قلی کی طرح کام کرتا رہا۔ اپنی پیٹھ پر بوجھ اٹھاتا رہا۔ اپنے ہاتھوں کو زخمی کرتا رہا اور اپنا خون پسینہ ایک کر کے چار آنے روز کماتا رہا۔ لیکن یہ حرامخور اسے چوری کے سوا چارہ ہی نہیں؟ کامل ایک سال اور چار مہینے تک میں یوں

ہی کام کرتا رہا اور کسی میں جرأت ہے کہ وہ یہ کہے کہ میں جھوٹ بولتا ہوں؟ کیونکہ میرے پاس شہادت موجود ہے۔ اور وہ شہادت اسی محررکی ہے جو اب میرا دوست ہے۔

اس کے بعد امیر کے بجائے رئیسوں اور سرداروں میں سے ایک شخص کھڑا ہوا جس کا تمام لباس حریر کا تھا اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "خدا کی قسم یہ سچ ہے۔ کیونکہ میں جو خدا تعالےٰ کے فضل و کرم سے اور امیر کی عنایات سے تمہارے جیسا ہی ایک سردار ہوں۔ ایک زمانے میں اس ساہوکار کا محرر رہ چکا ہوں۔

کچھ دیر کے لئے خاموشی چھاگئی۔ پھر امیر نے ایک غضب ناک آواز میں قیدی کو جھلا کر بلایا اور اس پر نفرت بھیجی۔ یہاں تک کہ "دار آرید" کی ہیبت انگیز آواز نے عدالت کا فیصلہ سُنادیا +

چور کو وہاں سے لے گئے۔ اور اس کے بعد پھر اُسے کسی نے نہ دیکھا۔ دربار کا سکوت ٹوٹ گیا۔ لوگ آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔ "خدا اور رسول شاہد ہیں۔ یہ شخص کامل انسان ہے" +

"رڈیارڈ کپلنگ"

خوابِ حشر

(۱)

برُو، آ، آ، آ

کچھ اس قسم کی آواز تھی جو میرے کانوں میں پڑی مگر میں کچھ نہ سمجھا،

دا، را، را، را، را

"میرے اللہ!" میں نے نیم خوابی کی حالت میں کہا۔ "یہ شور تو میرے پردہ ہائے گوش کو پھاڑ دیگا۔"

را، را، را، را، را، را، را، را، را، را، ٹا، را، ررا، را۔

"بس۔ بس میری نیند کو غارت . . . ." میری زبان یکایک رُک گئی۔ میں کہاں تھا؛

ٹا، ررا، رارا، آواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔

"یہ یا تو کوئی نئی ایجاد ہے یا . . . ."

ٹُررا، ٹُررا، ٹُررا . . . . . کان پھٹ گئے۔

"نہیں! یہ صورِ اسرافیل ہے۔" میں نے زور سے کہا تاکہ اپنی آواز ہی کو سُن سکوں۔

(۲)

صور کی آخری صدا نے مجھے قبر سے یوں نکال پھینکا جیسے کانٹے کے ساتھ کوئی چھوٹی سی مچھلی اٹک کر ایک ہی جھٹکے کے ساتھ دریا سے باہر آ پڑے۔

میں نے اپنے سنگِ مزار کو دیکھا (جو در اصل ایک حقیر و بے حقیقت سی بات ہے اور میرے دل میں اس شخص کے معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جس نے اُسے نصب کیا تھا) پھر میرے دیکھتے دیکھتے یہ سنگِ مزار اور ایک قدیم درخت اور سمندر کا نظارہ جو میرے سامنے تھا اس طرح غائب ہو گئے جیسے دھوئیں کا ایک مرغولہ ہوا میں مل جائے۔ اور اس کے بعد میرے آس پاس تمام ایک ازدحام تھا، جسے کوئی انسان نہیں گن سکتا، قومیں، زبانیں، سلطنتیں، لوگ، ہر زمانے کے لوگ ایک وسیع و عریض پنڈال میں جس کی وسعت آسمان کی وسعت کی مثال تھی اکٹھے ہو رہے تھے۔ اور اوپر ہمارے بالمقابل سفید بادل کے ایک نورانی تخت پر خدائے بزرگ و برتر جلوہ گر تھا۔ اور اُس کے آس پاس اُس کے فرشتوں کی فوجیں تھیں۔ میں نے عزرائیل کو اُس کی درشتی سے، اور میکائیل کو اُس کی تلوار سے اور اُس عظیم الشان فرشتے کو جس نے سوتوں کو جگایا تھا اُس نرسنگے سے پہچانا جو ابھی

تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔

(۳)

ایک پست قد کا آدمی جو میرے پاس ہی کھڑا تھا کہنے لگا "کس قدر مستعد اور آمادہ ہے تم نے کتاب والے فرشتے کو دیکھا، تامل و توقف کا شائبہ تک اُس کی صورت سے نمایاں نہیں"۔

وہ اپنی لمبی گردن اُٹھا اُٹھا کر اور جھکا جھکا کر اُن تمام روحوں کا جایزہ لے رہا تھا جو ہمارے ارد گرد جمع تھیں، "ہر شخص حاضر ہے" اُس نے کہا، ہر شخص، اور اب دیکھیں گے کہ......"

"ابن سینا وہ ہے۔ اور پرے ...... دیکھتے ہو، وہ بلند و بالا قد کا معتبر سا آدمی جو خدا سے آنکھ ملانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ ایک نواب ہے۔ لیکن یہاں کروڑوں لوگ ایسے ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے"۔

"وہ دیکھو خسرو ناشر کتب۔ میں ہمیشہ مالکان مطابع کی سخن سازیوں پر حیران ہوا کیا ہوں، خسرو ہوشیار آدمی تھا مگر ٹھیرو آج اُس کی ہوشیاری بھی معلوم ہوئی جاتی ہے"۔

"آہا! میں بہت کچھ دیکھ سکوں گا۔ لوگوں کے حشر کا میں بہت سا لطف اُٹھا سکوں گا، میرا نام حرف س سے شروع ہوتا ہے۔ اور وہ سب کو ردیف وار بلائیں گے"۔

اُس نے بر سبیل استعجاب اپنے دانتوں کے نیچے سے ہوا اندر کھینچتے ہوئے کہا:۔

"دیکھا؛ بعض تاریخی ہستیاں بھی یہاں موجود ہیں۔ وہ ہارون الرشید ہے۔ آہ، زبردست حساب و کتاب ہوگا۔ اوہ! یہ ضبیث مقنع ہے"۔

اُس نے دھیمی آواز سے کہا "اس چھوکرے کی طرف دیکھو، جو ہمارے سامنے ہے۔ جس کے بدن پر بال ہی بال ہیں۔ یہ ابن شعیر ہے، اسے جانتے ہو اور وہ پرے......"

میں نے اُس کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ کی کیونکہ میں خداوند جل و علا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

(۴)

"بس"۔ خدائے بزرگ و برتر نے کہا۔

کتاب والے فرشتے نے ہم پر ایک نظر ڈالی اور ایسا معلوم ہوا جیسے اس ایک لمحہ میں اُس نے سب کو گن لیا ہے۔ اور پھر کہنے لگا:۔

"بس اے خدا، بس یہ ایک بہت ہی چھوٹا سیارہ تھا۔"

علیم و حکیم خدا کی نگاہ نے ہم سب کا جائزہ لیا۔

"اب شروع کیا جائے"۔ خدائے قدیر کا ارشاد ہوا۔"

(۵)

فرشتۂ کتاب نے کتاب کھولی اور ایک نام پڑھا۔ اِس نام میں الف ہی الف تھے۔ اور اُس کی آواز کی صدائے بازگشت دیر تک فضا کے بُعد ہائے بعید سے آتی رہی۔ مگر اس نام کو میں ٹھیک طور پر نہ سمجھ سکا۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ عین اُس وقت وہ پست قد آدمی جو میرے پہلو میں کھڑا تھا بول اُٹھا "وہ کیا ہے؟"

معاً ایک چھوٹا سا سیاہ رُو شخص خدا تعالے کے قدموں میں ایک ہوا آمیز بادل پر اُٹھا لیا گیا۔ اُس کی صورت سے سختی نمایاں تھی۔ اُس نے بدیسی کپڑے پہن رکھے تھے۔ اُس کے سر پر تاج تھا اور وہ تیوری چڑھائے اکڑ کر کھڑا تھا۔

خدا نے نیچے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا؟"

جواب سننے کی ہمیں اجازت تھی اور سچ یہ ہے کہ اس جگہ کی باتیں بھی سننے کے قابل تھیں۔

بونے نے کہا "میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں"۔

خدا نے حکم دیا۔ کہ اِن لوگوں کو بتاؤ تم دنیا میں کیا کیا کرتے رہے۔

اس نے کہا: "میں ایک بادشاہ تھا، ایک عظیم الشان بادشاہ، اور میں نفس پرست، مغرور اور ظالم تھا۔ میں نے بارہا آتش جنگ مشتعل کی میں نے ملکوں کے ملک تباہ کر دیئے، میں نے محلات تعمیر کیئے۔ اور انسانوں کے خون سے گارے اور چونے کا کام لیا۔ اے خدا میرے خلاف گواہی دینے والوں کو سُن، جو تجھ سے انتقام کا مطالبہ کر رہے ہیں، سینکڑوں اور ہزاروں گواہوں کو،" اُس نے اپنے ہاتھ سے ہماری طرف اشارہ کیا۔ "اور میری سب سے بڑی سیاہ کاری! میں نے ایک پیغمبر کو گرفتار کیا ...... تیرے ایک پیغمبر کو۔ اور چونکہ وہ میرے آگے سربسجود نہ ہوا میں نے اُسے چار دن اور چار راتیں عذاب میں مبتلا رکھا۔ جس کے بعد وہ مرگیا۔ میں نے اسی پر بس نہ کی، اے خدا میں نے تیری بے ادبی کی۔ میں نے تیری عزت کی حرمت کا لحاظ نہ کیا .... میں نے تیری بجائے اپنی پرستش کرائی۔ کوئی بدی نہ ہوگی جسے میں نے نہ کیا ہو۔ اور آخر کار اے خدا تو نے مجھے موت دی۔ میں میدانِ جنگ میں قتل ہوا اور اب تیرے سامنے کھڑا ہوں۔ جہنم کے اسفل السافلین میں جگہ پانے کے لئے کھڑا ہوں۔ تیری عظمت و شوکت کے آگے میری مجال نہیں کہ جھوٹ بولوں یا کوئی عذر تراشوں۔ میں نے اپنے ظلم و جور کی کہانی ساری نوع انسان کے روبرو تجھ سے کہدی ہے"

وہ چپ ہو گیا، میں اُس کے چہرے کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ اس سے ہیبت غرور اور وقار ٹپک رہا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے شیطان کا وہ نقشہ آگیا۔ جو انگریز شاعر ملٹن نے اپنی ایک نظم میں کھینچا ہے۔

یکایک خداوند آگے کی جانب جھکا اور اُس نے اس شخص کو پکڑ کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا جیسے وہ اُسے اچھی طرح دیکھنا چاہتا ہے۔ خدا کی ہتھیلی کے درمیان میں وہ ایک چھوٹے سے سیاہ دھبے کی مانند معلوم ہو رہا تھا۔"

خدا نے پوچھا۔ کیا اُس نے دنیا میں یہی کچھ کیا تھا؟

اعمال نگار فرشتے نے کتاب اپنے ہاتھ سے کھولی اور بے پروائی سے جواب دیا۔ "قریباً قریباً"

اب جو میں نے اس شخص کو دیکھا تو اُس کے چہرے پر ایک عجیب تبدیلی نمایاں تھی۔ وہ اعمال نگار فرشتے کی طرف عجیب اندیشہ ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اور اضطراب کی حالت میں اُس کا ایک ہاتھ مُنہ کی طرف اُٹھ گیا تھا۔ اُس سے عجیب و غریب حرکات سرزد ہونے لگیں، اُس کے مقابلے کا تمام وقار خاک میں مِل گیا۔

خداوند تعالےٰ نے کہا "پڑھو"۔

اور فرشتے نے نہایت احتیاط اور تفصیل کے ساتھ ظالم شخص کے تمام ظلم بیان کرنے شروع کئے۔ ہمارے لئے یہ بالکل ایک دماغی ضیافت تھی۔ . . . . . .

(۶)

ہر شخص ہنس رہا تھا۔ یہانتک کہ خدا کے جس پیغمبر کو اُس نے عذاب دے دے کر ہلاک کیا تھا اُس کے چہرے پر بھی تبسّم تھا۔ کیونکہ اُس کی شکل ہی کچھ ایسی لغو اور مضحکہ خیز ہو رہی تھی۔

فرشتے نے مُسکرا کر کہا اور اُس کے تبسُم نے ہمارے دِلوں میں سننے کے شوق کو دہ چند کر دیا" اور پھر ایک دِن جب پیٹ بھر کر کھانا کھا چکنے کے بعد اُس کے مزاج میں کچھ تیزی سی پیدا ہو گئی تھی وہ . . . . "

ظالم آدمی نے چِلّا کر کہا " اِس کے متعلق کچھ نہ کہو . . . . اِس کا کِسی کو علم نہیں"۔ پھر چیخ چیخ کر کہنے لگا " یہ واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔ میں بُرا تھا . . . . . یقیناً میں بُرا تھا، میں بہت ہی بُرا تھا۔ مگر یہ حماقت مجھ سے نہیں ہوئی . . . . ایسی ادنےٰ درجہ کی حماقت . . . . "

فرشتہ پڑھتا گیا

ظالم آدمی نے کہا " اے خدا! ان لوگوں کو اس واقعہ کا عِلم نہ ہونے دے۔ میں اپنے

کیئے پر پشیمان ہو جاؤں گا، میں تجھ سے معافی مانگ لوں گا۔"

وہ خداوند کے ہاتھ پر ناچنے لگا اور رونے لگا۔ یکایک شرم اُس پر چھا گئی۔ وہ وحشت زدہ ہو کر دوڑا اور خداوند کے ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی کے سرے پر پہنچ کر چھلانگ لگانے کے لئے تیار ہو گیا مگر خداوند نے جلدی سے اپنی کلائی کو موڑ کر اُسے روک لیا۔ پھر وہ ہاتھ اور انگوٹھے کے درمیان جو خلا ہے اُس کی طرف دوڑا لیکن انگوٹھا بند ہو گیا۔ فرشتہ اس تمام عرصہ میں پڑھتا گیا ...... پڑھتا گیا۔ ظالم انسان خداوند کے ہاتھ پر کبھی اِدھر کبھی اُدھر دوڑتا رہا۔ اور آخر کار بھاگ کر خدا کی آستین میں گھس گیا۔

میرا خیال تھا کہ خداوند اُسے وہاں سے نکال دے گا مگر اُس کا رحم و کرم بے پایاں ہے اعمال نگار فرشتہ خاموش ہو گیا۔

خدا نے کہا "آگے"، اور قبل اس کے کہ فرشتہ اگلے آدمی کا نام پکارے خدا کی ہتھیلی پر پھٹے ہوئے میلے کپڑوں میں ایک شخص نظر آیا۔

(۷)

میرے ساتھی نے کہا "کیا خدا کی آستین میں دوزخ ہے"؟

میں نے پوچھا "اچھا یہاں دوزخ بھی ہے"؟

اُس نے فرشتوں کے پاؤں کے درمیان سے جھانک کر کہا "بظاہر اس کی کوئی خاص نشانی تو نظر نہیں آتی۔"

"ہش" ایک عورت نے تیوری چڑھا کر کہا "اس مقدس آدمی کی بات سنو۔"

(۸)

مقدس آدمی نے کہا "وہ زمین کا بادشاہ تھا مگر میں آسمانوں کے خدا کا نبی تھا۔ اور تمام

لوگ تیری نشانیوں کو دیکھ کر حیران تھے۔ اے خدا میں تیری بہشت کی عظمت و شوکت سے واقف تھا۔ کوئی درد نہ تھا، کوئی مصیبت نہ تھی جو مجھ پر نہ پڑی ہو۔ چھریوں سے میرے بدن کو زخمی کیا گیا، میری انگلیوں میں کیل ٹھونکے گئے، میرے گوشت کے پرخچے اڑائے گئے اور یہ سب تیری عزت و شان کے لئے ہوا، اے خدا!"

خداوند نے تبسم کیا۔

(۹)

خداوند نے کہا "اب کہ تم مجھ کو اور اپنی نوع میں سے ایک دوسرے کو پہلے کی بہ نسبت بہتر طریق پر سمجھنے لگے ہو۔ تمہیں موقع دیا جاتا ہے کہ تم ایک مرتبہ اور زندگی بسر کرو اور اس زندگی میں نیکی کو اپنا شعار بناؤ۔"

پھر اس نے ہمیں ایک ایسی سرزمین میں ڈال دیا جو سورج کی بجائے شعری یمانی کے گرد گھومتی تھی۔ جو تمام کرۂ فلک میں کل ستاروں سے زیادہ بڑا اور زیادہ روشن ہے۔

اس کے بعد خدا اور اس کے فرشتوں نے دوسری طرف رخ کیا اور یکایک نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ایک لمحہ کے بعد عرش بھی نظروں سے غائب ہو گیا۔

میرے آس پاس ایک وسیع خوبصورت سرزمین پھیلی ہوئی تھی، ایسی خوبصورت جیسی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اور میرے اردگرد پاک و صاف روحیں ننگے اور اجلے اجسام میں ملبوس چل پھر رہی تھیں +

"اتچ، جی، ویلز"
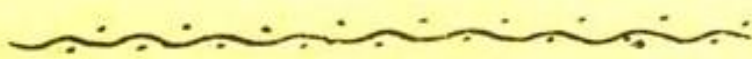
لالۂ صحرا

ڈوبتے ہوئے دن کے پُراسرار دھندلکے میں ایک سبک رفتار اونٹنی پر سوار ہوا اپنی
بندوق کو سر سے ذرا بلند رکھ کر میں تیزی کے ساتھ فریب آفرین ریت کے عظیم الشان ٹیلوں [illegible]
سے گزر رہا تھا۔ ایک دفعہ میں نے نکیل کو ذرا کھینچا۔ اور اپنی بائیں طرف مڑ کر ایک [illegible] لگا
پہاڑ کی چوٹیاں آری کے دندانوں کی طرح اپنے سر اٹھائے کھڑی تھیں لیکن جب میں نے دیکھا صحرا
کی ہیبت افزا خاموشی کو توڑنے والی یہاں کوئی چیز موجود نہیں تو میں پھر روانہ ہو گیا۔ ایک چھوٹے
سے نخلستان کے پاس پہنچ کر میں نے اونٹنی کو بٹھا دیا اور خود نیچے اُتر آیا۔

میں آہستہ آہستہ سیدی اکبر کے سنسان مقبرے کی جانب چلنے لگا۔ یہ ایک چھوٹی سی گنبددار
عمارت ہے جس کی دیواریں کچی ہیں۔ اور جس کی چھت کے نیچے ہمارے ایک نہایت معزز بزرگ محو
آرام ہیں۔ چادر جو میں نے اوڑھ رکھی تھی میلی شکستہ اور سفر کی وجہ سے داغدار ہو چکی تھی۔ نقاب
جو ہمارے گروہ کا ہر آدمی پہنتا ہے پھٹا ہوا اور گرد آلود تھا اور میرے پاؤں میں ایک سخت اور بوجھل
جوتا تھا۔ جوتا میں نے مقبرے کے قریب پہنچ کر اُتار دیا۔ اور پھر آفتاب زدہ دیوار کے قریب جھک کر میں
نے ریت کی ایک چٹکی اُٹھائی اور تبرکاً اپنے اوپر ڈال لی۔ مقبرے کی پاک زمین کو چُوما۔ اور دونوں ہاتھ
اُٹھا کر دعا مانگنے لگا۔ نہایت خضوع وخشوع کے ساتھ میں بار بار جھک رہا تھا۔ رفتہ رفتہ میری آواز
بلند ہونی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ مقبرے کی پُرسکون فضا میں اس کا ایک ایک لفظ صاف صاف سنائی
دینے لگا۔

”اے رحیم، اے رحمٰن، اے التجاؤں کو قبول کرنے والے، اے یوم الدین کے مالک! اکل کا آفتاب

طلوع ہونے سے پہلے ہم کو اس راستے کی طرف ہدایت کر جو سیدھا ہو، جو ہمارے دشمنوں کے شہر ایبا کی طرف جاتا ہو۔ ہمارے بازوؤں میں قوت دے، رات کی تاریکیوں میں اور دن کی روشنی میں ہماری رہنمائی کر۔ ہمارے دشمنوں کو تباہ کر اور ان کو الہاویہ سے ہم کنار کر۔ وہی ہاویہ جسے تو نے کافروں کے لئے تیار کر رکھا ہے، جہاں اُن کا کھانا زہریلے سانپ ہوں گے، اور جہاں اُن کی پیاس کھولتی ہوئی رال سے بجھائی جائے گی۔"

یکایک مجھے ایک آہٹ نے چونکا دیا۔ میں نے سانس روک کر کان اس طرف لگا دیئے۔ مجھے خیال پیدا ہوگیا کہ ضرور میرے الفاظ کو کسی جاسوس نے سُن لیا ہے۔ بے اختیار میرا ہاتھ "جنبیہ" پر جا پڑا۔ جسے میں نے اپنے پہلو میں پیٹی کے اندر لٹکا رکھا تھا۔ یہ وہی لمبا تیز خنجر ہے جسے میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ ایک مرتبہ پھر سکوت ٹوٹا اور ایسا معلوم ہوا جس طرح کوئی گہری لمبی آہ کھینچتا ہے۔ میں اُٹھا اور دوڑتا ہوا عمارت کی دوسری طرف پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ہوا میں لہراتی ہوئی سفید قبا کی ایک آخری جھلک عمارت کی تاریکی میں غائب ہو رہی ہے۔ میں بجلی کی طرح اس کے پیچھے جھپٹا اور کوئی بیس قدم کے فاصلے پر پہنچ کر میں نے اپنے دشمن کو پکڑ لیا۔ جو ایک ہلکی سی چیخ مار کر میرے بوجھل ہاتھ کے نیچے زمین پر گر پڑا۔

میں نے درشتی کے ساتھ گھسیٹ کر اُسے اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ اور کہا اُٹھ اے ابلیس کے بچے! اُٹھ۔

دوسرے ہی لمحے میں مجھے معلوم ہوگیا کہ میرا قیدی ایک عورت ہے۔ اس کے چہرے پر نقاب تھا وہ ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ اور اس نے وہ پھولا ہوا سفید پاجامہ پہن رکھا تھا، جو عرب کی عورتوں کو جب وہ یہ لباس پہن کر باہر نکلتی ہیں نہایت کریہہ منظر بنا دیتا ہے۔

میں نے اپنا خنجر کھینچ کر کہا "تو نے میری دُعا سُن لی ہے۔ بول! ...... بول! ورنہ سچ کہتا

ہوں کہ ابھی خنجر تیرے سینے سے پار کر دوں گا۔"

لیکن پُراسرار عورت نے کوئی لفظ اپنے مُنہ سے نہ نکالا۔ اور میں نے دیوانوں کی طرح اس کے چہرے کا نقاب پھاڑ ڈالا۔

میں حیران و ششدر کھڑا رہ گیا۔ خنجر میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ نقاب میں سے جو شکل ظاہر ہوئی وہ حیرت انگیز طور پر خوبصورت تھی۔ اس کے فتنہ خیز حسُن کو دیکھ کر میں ایک لمحہ میں مسحُور ہو کر رہ گیا۔ گویائی کی قوت مجھ سے سلب ہو گئی۔ اور پشیمانی مجھ پر چھا گئی۔

اس کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ اس کے اعضا متناسب تھے اور اس کا رنگ سفید تھا۔ اس کی دونوں چمکتی ہوئی سیاہ آنکھوں میں سُرمہ لگا ہُوا تھا۔ اور اس کی کشادہ پیشانی کا نصف حصہ سونے کی اشرفیوں کے دھاگوں سے ڈھکا ہُوا تھا۔ اور جب کبھی وہ اپنے سر کو ذرا سی جُنبش بھی دیتی تھی تو ان میں سے موسیقی کی ایک لہر پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کے سر پر ایک بھڑکیلی سُرخ ٹوپی رکھی تھی جس کے کنارے بے شمار چھوٹے چھوٹے موتیوں کے بوجھ سے جُھکے پڑتے تھے۔ اس کی لمبی گردن کو نیم تراشیدہ یاقوت اور فیروزہ کے ہار زینت دے رہے تھے۔ اور اس کی ریشمیں چادر کے شکنوں میں عنبر کی لطیف خوشبو بسی ہوئی تھی۔

آہستہ سے اس نے اپنی نرگسیں آنکھیں اوپر اُٹھائیں جن میں آنسو ابھی اٹک رہے تھے۔ میرے غصہ کے خوف سے وہ کانپ رہی تھی۔ اور اس کا جلد جلد اُبھرتا اور گرتا ہُوا سینہ لہروں کے مدوجزر سے مشابہ معلوم ہوتا تھا۔

آخر میں نے اپنے درشت اور سخت ہاتھ سے اس کی سفید نازک کلائی کو پکڑا اور کہا کہ اپنی زبان کو ذرا ڈھیلا کر اور مجھے بتا کہ تو مدینۃ السمارہ آ نوسے آئی ہے؟ اور تجھے ہمارے حملے کے متعلق بھی علم ہو گیا ہے؟"

اس نے لرزتی ہوئی زبان سے کہا "اے اجنبی تو درست کہہ رہا ہے"

میں نے استعجاب آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "لیکن تو اپنے گھر سے جو سامنے پہاڑ کی چوٹی پر نظر آرہا ہے تن تنہا اتنی دور کیسے آگئی"؟

اس نے اپنی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ اور نہایت متانت سے جواب دیا۔ "میں بھی یہاں اسی مقصد سے آئی ہوں جس مقصد سے تو یہاں آیا ہے۔ میں بھی خدا کی نصرت کو ڈھونڈ رہی ہوں"

میں نے کہا "کیا تو اقلیم عجم کی بسنے والی ہے کہ تو نے اپنی جان کی پرواہ نہ کر کے اکیلے یہاں تک آنے کی جرأت کی ہے"۔

وہ ہچکچائی۔ اور پھر گھبراہٹ میں عطر کی اس شیشی کو جو اس کے سینے پر لٹک رہی تھی اور جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے اِدھر اُدھر ہلا کر اس نے جواب دیا "میں ۔۔۔۔۔ میری منگنی ایک ایسے شخص سے ہوئی ہے جس سے مجھ کو نفرت ہے اور اب صرف اسی رحیم وکریم خدا کا فضل وکرم ہے جو مجھے اس مصیبت سے نجات دے سکتا ہے۔ جسے میں موت سے بدتر سمجھتی ہوں"

میں نے کہا "وہ کون ہے۔ جو تجھے اس نارضامندی کے عقد پر مجبور کرتا ہے۔ کیا وہ تیرا باپ ہے"؟

اس نے کہا "ہاں! وہ میرا باپ ہی ہے اور اس کا نام عبدالجلیل بن سیف النصر سلطان ابیا ہے"

میں حیرت زدہ لہجے میں بول اٹھا "سلطان! اور تم خیرا ہو" کیونکہ سلطان ابیا کی اکلوتی بیٹی خیرا کا غیر معمولی حسن تمام صحرائے اعظم میں ضرب المثل ہو چکا تھا۔

اس نے کہا "ہاں اور تمہاری باتوں سے اور تمہارے لباس سے مجھے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم قبیلۂ ازجر سے ہو جو ہمارے جانی دشمن ہیں"۔

میں نے کہا "سچ ہے کل میرے قبیلے کے دس ہزار آدمی جو اس وقت وفورو کی وادی میں چھپے بیٹھے ہیں تمہارے مستحکم اور ناممکن التسخیر شہر پر اجتماع کریں گے۔ اور ـــــــــــ "

اس کا رنگ زرد ہو گیا اور وفور اضطراب میں وہ بول اُٹھی "دس ہزار! اور تم میرے باپ کو قتل کر دو گے؟ اور ہماری رعایا کو غلام بنا لو گے؟ آہ نہیں! اے اجنبی! ہمیں بچا لے۔ ہماری فوجیں پچھلے چاند پر جنوبی علاقوں سے لگان وصول کرنے گئی تھیں اور ابھی تک واپس نہیں ہوئیں۔ اس لئے اِس وقت ہم بالکل بے کس اور بے بس ہیں۔ آہ میں کیا کروں۔ میں اپنے باپ کو کیسے بچاؤں؟"

میں نے کہا "کیا اگر وہ تمہیں اس ناخوشگوار شادی پر مجبور کرے تب بھی تم اسے بچاؤ گی؟"

اس نے کہا "یقیناً۔ میں . . . . میں مدینتہ السماء کو اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر بھی بچاؤں گی۔"

میں نے اس کا ہاتھ آہستہ سے اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور پوچھا "تمہارے باپ نے تمہیں کس شخص سے منسوب کر رکھا ہے؟"

اس نے کہا "آغا حسن راوی سے جو ناناگا ما پہاڑیوں کے پار صغرا میں رہتا ہے۔ اسکی عمر ستر سال کے قریب ہے اور سنا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیویوں سے نہایت بے رحمانہ سلوک روا رکھتا ہے خود اس کی ایک لونڈی نے بھی مجھ سے یہی بات کہی تھی۔"

میں خاموش ہو گیا۔ طرح طرح کے خیالات نے مجھ پر غلبہ پا لیا گو میں ایک ایسے قبیلے کا فرد تھا جس کی گزران صرف کاروانوں اور آس پاس کے شہروں کی لوٹ مار پر ہوتی تھی۔ پھر بھی سلطان کی بیٹی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میرے دل میں اُسے قتل کر کے اپنا راز چھپانے کا خیال تک نہ رہا۔ اور میں نے اپنے آپ کو اس کی محبت میں سرشار پایا۔

میں نے کہا "اے آفتاب کی بیٹی، آج رات ہم دوستوں کی طرح ملتے ہیں۔ کل ہم ایک دوسرے کے دشمن ہونگے۔ ہمارے مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ تمہارا شہر اس وقت مقابلہ کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور آہ! ہمارے آدمی تمہاری قوم کے خون کے پیاسے ہیں۔ اور تمہاری قوم ہماری جان کی دشمن ہے۔ اِس لئے جب ازجر کی فوجیں تلوار اور آگ لے کر تمہارے شہر میں داخل ہونگی تو ان

کی بے پناہ تباہ کاری سے بہت ہی تھوڑے لوگ بچیں گے، کیا تم ہمارے قبیلے کے لوگوں کے ساتھ رہ کر اس بربادی سے بچنا چاہتی ہو؟"

اس نے پُرغرور انداز سے کہا: "نہیں۔ میں آفو کی رہنے والی ہوں۔ اور اپنے لوگوں میں ہی واپس جاؤں گی۔ خواہ تمہاری بے رحم تلواریں کل کا آفتاب غروب ہونے سے پہلے میرے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔"

جب وہ یہ باتیں کہہ رہی تھی اس وقت اس کا ایک ہاتھ اس کی نازک کمر پر تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے وہ اس بلند سایہ دار چوٹی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ جس پر وہ عظیم الشان سفید قلعہ واقع تھا جسے مدینۃ السمار کہتے ہیں۔

میں نے اپنی چادر کو اپنے کندھوں پر لپیٹتے ہوئے کہا: "مگر تم جو تاروں میں چاند کی طرح ہو ہمارے ارادوں سے واقف ہو چکی ہو اور یہ میرا فرض ہے کہ میں تم کو قتل کر دوں۔"

اس نے کہا: "میں تمہارے ہاتھوں میں ہوں۔ اگر تم ان کو میرے خون سے آلودہ کرو گے تو تمہارے ضمیر کی لوح پر ہمیشہ کے لئے اس امر کی یاد باقی رہے گی کہ تم نے ایک ایسی عورت کی جان لی تھی جو کسی سازش یا کسی فریب کی آلودگی سے قطعاً پاک تھی۔ اور اگر تم مجھ کو آزاد کر دو گے تو مجھے اپنے لوگوں کے درمیان آرام اور آسودگی کی کم از کم ایک آدھ مختصر ساعت اور مل جائے گی۔ اور اس کے بعد معلوم نہیں کہ ...."

اور اس نے جملہ پورا کئے بغیر ایک آہ کھینچی۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "مگر تمہارے لئے جو سرچشمۂ حیات کا ایک شگفتہ پھول ہو۔ دو انجام انتظار کر رہے ہیں۔ کل کی شکست اور نئے چاند کے طلوع پر شادی کی تقریب اپنے دل کو تکلیف نہ دو کیونکہ میں تمہیں الزام دینے کے لئے ہرگز اپنی زبان نہیں کھولوں گا۔ قبیلۂ ازجر

کے احمد کو تم آئندہ اپنا بہترین دوست پاؤ گی۔ جو شاید کسی ایسے طریقہ سے تمہاری مدد کرے گا جس کا تمہیں خواب و خیال بھی نہیں۔ اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور جتنی جلدی تم آفو پہنچ سکتی ہو پہنچ جاؤ۔ نہیں نہیں، لیکن اس سے پہلے نہ جاؤ کہ تم مجھے اس عجیب و غریب ملاقات کی کوئی نشانی نہ دے لو۔"

اس نے کہا "تم نے شفقت اور مروت کے زلال سے میری پیاس کو بجھا دیا ہے۔ مجھے تمہاری طرف دیکھتے ہی خیال پیدا ہوا تھا کہ تم میرے دوست ہو۔"

"دوست؟ ــــــ نہیں۔ تم سے محبت کرنے والا۔" یہ الفاظ میرے منہ سے مشتاقانہ انداز سے نکلے اور میں نے اس کا نرم و نازک ہاتھ پکڑ کر اس کی حنا آلود انگلیوں پر بوسہ دیا۔ حیا کی سرخی اس کے رخساروں پر دوڑ گئی۔ اس نے میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا۔ آخر اس نے اپنی کلائی سے سونے کی ایک چوڑی اتار کر مجھے پہنا دی۔

پھر اس نے ہنس کر کہا اور اس کی ہنسی میں موجِ چشمۂ آبِ حیات کی جنبش تھی۔ "لو اب تم میرے حلقہ بگوش ہو گئے ہو۔"

میں نے کہا "میں خوش ہوں کہ میں دنیا کی سب سے زیادہ حسین خاتون کا غلام ہوں۔" پھر میں نے اس کو سمجھا دیا کہ وہ سلطان کو از جر کے ارادوں سے متنبہ کر دے اور پھر آخری مرتبہ اپنے ہونٹوں کو اس کے ہونٹوں سے ملا دیا اس کے بعد میں نے اس کو سہارا دے کر اس کے آراستہ و پیراستہ گھوڑے پر سوار کرایا۔ اس نے اپنے چہرے سے پھٹا ہوا نقاب ہٹا کر مجھ پر سلام بھیجا۔ اور اس خبر کو لے کر جو کوہستان کے استحکام میں بھی زلزلہ ڈال دے ایک سبک پرواز تیر کی طرح رات کی تاریکی میں غائب ہو گئی۔

جب اس کے گھوڑے کے سموں کی ٹاپ ختم ہو گئی تو میں نے کہا آہ! مجھے اس سے

محبت ہوگئی ہے مگر میں اُسے کیسے بچا سکتا ہوں۔ کل جب ہم آفو میں داخل ہونگے اور محلات کو ڈھونگے تو اُسے غلام بنا لیا جائے گا۔ نہیں! نکاتے کے وحشی ہاتھ اسے کبھی نہ چھوئیں گے ـــــ کبھی نہیں جب تک میرے دم میں دم ہے۔"

اسی وقت کسی کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھنا شروع کیا جہاں کچھ جھاڑیوں نے اندھیرا کر رکھا تھا۔ ایک لمحہ کے بعد میں نے اپنے قبیلے کے کچھ آدمیوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔

کسی نے چلاّ کر کہا "مخبر کتے تو نے ہمیں دھوکا دیا" میں نے فوراً اس آواز کو پہچان لیا۔ یہ میرا دشمن اور رقیب محمد السفنکی تھا۔

اس کے بعد سب نے بیک آواز کہا "ہاں ہم نے اس حرام کے بچے کو اس عورت سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ اور ہم نے اُسے یہ کہتے ہوئے سُن لیا ہے۔ کہ سلطان کو ہمارے ارادوں سے مطلع کردے۔"

السفنکی نے چلاّ کر کہا "جاؤ ہوا کے پروں پر سوار ہو کر جاؤ اور اس کو مار ڈالو کیونکہ صرف موت ہی اس فاحشہ کے مُنہ پر سکوت کی مُہر لگا سکتی ہے"۔

دو سیاہ نقاب پوشوں۔ نے رکاب میں پاؤں رکھا اور اڑتے ہوئے اس طرف روانہ ہو گئے جس طرف خیرا گئی تھی۔

السفنکی جس نے اپنے دوسرے ہمراہیوں سمیت اب مجھے گھیر لیا تھا، کڑک کر بولا "بتا! کیا تو جانتا ہے کہ غدار کی کیا سزا ہے"؟

میں نے بھاری آواز سے کہا "ہاں"۔

اس نے کہا "یہ کون عورت تھی جس کے مکر و فریب نے تجھے مسحور کر لیا تھا"؟

اتنے میں دور سے تین دفعہ بندوق چلنے کی آواز آئی۔ ظاہر تھا کہ ہمارے آدمیوں نے سلطان کی بیٹی کو جالیا ہے اور اسے مار ڈالا ہے۔

میں نے اپنا سانس روک لیا۔

میں نے فیصلہ کن طریقہ سے کہا ”میں اس بات کا جواب دینے سے انکار کرتا ہوں۔“

اس نے کہا ”خدا کی قسم تو ہمارے سردار اور ہمارے قبیلہ کا غدار ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تو خود بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے اس لئے تیری سزا موت ہے۔“

پھر دوسروں کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا ”چلو ہمارے پاس شیطان کے اس ملعون بیٹے کے ساتھ بحث کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔ اِسے سامنے درخت کے ساتھ باندھ دو تاکہ گدھ اس کے مردار گوشت کو مزے لے لے کر کھائیں۔

سب کے سب مجھ پر لعنتیں ڈالتے ہوئے پل پڑے۔ انہوں نے میرا نقاب پھاڑ ڈالا میرا جُبّہ اُتار لیا اور ایک کھجور کے درخت سے مجھے اس طرح مضبوط باندھ دیا کہ میری نظروں کے سامنے سوائے صحرا کی ویرانی اور وسعت کے اور کچھ نہ تھا۔ پھر ظلم و جور کے اس مظاہرہ کے لئے جو بادیہ گرد ازجر کی جدت طراز طبیعت کا طرۂ امتیاز ہے، انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں اور چہرے پر کھجور کا رس مل دیا۔ تاکہ کیڑے مکوڑے اور چیونٹیاں مجھے کاٹ کاٹ کر کھا جائیں۔ پھر مجھے ابدی تباہی اور دائمی تعذیب میں گرفتار کر کے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ اور ہنستے ہوئے مجھے اپنے انجام کا انتظار کرنے کے لئے چھوڑ گئے۔

خاموش اور طویل رات کی بھیانک تاریکی میں بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کے ساتھ میں سلطان کی خوبصورت بیٹی کے خوفناک انجام کو سوچتا رہا جس نے میری دعا کے الفاظ سُن لئے تھے۔ میرے قبیلے کے دو آدمی جو اس کے پیچھے گئے تھے ابھی تک واپس نہ ہوئے تھے۔ میں جانتا تھا۔ کہ وہ

اعلےٰ درجہ کے سوار ہیں۔ اِس لئے انہوں نے بہت جلد اِسے جا لیا ہو گا۔ اپنے متعلق میں بالکل نا اُمید ہو چکا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ بہت جلد صحرا کی آگ برسانے والی دھوپ میرے جسم کو جلا ڈالے گی اور کیڑے مکوڑے میرے جسم کو نوچ نوچ کر کھا جائیں گے۔ لیکن میں ہر آواز کے سننے کے لئے چوکنا ہو رہا تھا اور مشرق میں ریگستان کے کنارے پر ایک زعفرانی شعاع طلوعِ آفتاب کا اعلان کرتی ہوئی نمودار ہوئی میں دیکھتا رہا کہ وہ رفتہ رفتہ تمام آسمان پر محیط ہو گئی۔ یہ میں جانتا تھا کہ ہر وہ لمحہ جو گذر رہا ہے مجھے میرے المناک انجام کے قریب ترلے جا رہا ہے۔ میں نے اپنی آواز کو خدا کی استعانت کے لئے بلند کر دیا اور اس مہم کے لئے جس پر میرے قبیلے کے لوگ آج جانے والے تھے۔ ہزاروں لعنتیں بھیجنے لگا۔ خیرا کا زرد حسین چہرہ ایک پل کے لئے بھی میری آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتا تھا۔ وہ اِسی طرح میرے سامنے تھی جیسے کوئی دھندلا سا خواب ہو۔ اس کا حسن مجھے مسحور کئے دیتا تھا۔ اور اس سحر کے اثر سے میں صبح کی ان خوفناک گھڑیوں کی ہیبت کو بھول رہا تھا۔ جو میرے لئے موت کا پیغام لا رہی تھیں۔

ابھی تمام صحرا زعفران زار بنا ہوا تھا۔ ابھی وہاں گلاب کھلنے لگا اور پھر گلاب کی جگہ زردسرخ نے لے لی یہاں تک کہ آفتاب اپنی پوری تابانی سے بے جادہ صحرا پر چمکنے لگا۔ مکھیاں جو اب ہُشیار ہو چکی تھیں آ آ کر مجھے دِق کرنے لگیں۔ اور میں نے جان لیا کہ سُورج کی بے رحم شعاعیں اپنی گرمی سے میرے دماغ کو مختل اور مجھے مجنون بنا دیں گی۔ جوں جوں دوپہر قریب آتی گئی دھوپ کا آتشدان تیز ہوتا گیا۔ روشنی کی شدت نے میری آنکھوں کو چُندھیا دِیا۔ اِسلئے مجبوراً میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

یکایک میرے کانوں میں شور کی سی آواز آئی پہلے تو ایسا معلوم ہُوا جیسے دُور سے کوئی ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی لیکن میرے عادی کانوں نے جلد ہی سمجھ لیا کہ یہ بندوقوں کے سر ہونے کی آواز ہے۔

مدینۃ السما پر حملہ ہو رہا تھا۔ انجر نے اسی وقت حملہ کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ لیکن جس بات سے مجھے حیرت ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ بار بار توپوں کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ اور اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ آنو والے مدافعت کر رہے ہیں۔

لیکن جس مقام پر میں بندھا ہوا تھا۔ وہاں سے مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی آٹھ میل کا رستہ تھی اور شہر تک جو اس چوٹی کے اوپر آباد تھا۔ دوسری طرف سے ایک دشوار گذار راستہ جاتا تھا۔ تاہم ساعت بہ ساعت توپوں اور بندوقوں کے شدید حملوں کی آوازیں آتی رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نہایت زبردست جنگ جاری ہے۔ اور اس بات نے مجھے حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ کیونکہ خیرا نے کہا تھا کہ شہر قطعاً مدافعت کے قابل نہیں۔ بہر حال جنگ کے ہنگامے نے مجھے بالکل بدحواس ہو جانے سے بچا لیا۔ اور جب تک آفتاب نے خونِ شفق میں ایک ڈبکی نہ لگالی توپیں اور بندوقیں آگ برساتی رہیں اس کے بعد پھر ایک عالمگیر خاموشی چھا گئی۔ صحرا کی جھلس دینے والی سموم سے کھجور کے درختوں کی ٹہنیاں ماتمی طروں کی طرح لہرانے لگیں۔ اور رات کا سایہ بڑھنے لگا۔ چیونٹیوں کے عذاب، دماغ پر دھوپ کی گرمی کے اثر، بھوک، پیاس، اور اعصاب پر مسلسل بوجھ پڑنے سے میں بہت مغلوب ہو گیا۔ اور جب مجھے نیند آئی تو مجھے متوحش خواب نظر آنے لگے اور اپنے ناگزیر انجام کی ہیبت نے مجھے ذرا دم نہ لینے دیا۔ وہی ہیبت جو دوسرے الفاظ میں موت کا پیغام تھی۔

دوسری رات اسی حال سے گزری یہاں تک کہ پھر آفتاب طلوع ہوا لیکن میری آنکھیں اب تک نہ کھلیں، جلتی ہوئی دوپہر کی گرمی سے مجھے کیا کام تھا۔ اور ان گدھوں سے بھی مجھے کیا کام تھا، جو میرے سر پر منڈلا رہے تھے۔ یکایک مجھے کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز آئی۔ اور میں نے اس وقت نظر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

ایک آواز جو دوسری تمام آوازوں سے بلند تھی خدا کا شکر بجا لا رہی تھی۔ میں اس کو سنتا

رہا۔ پھر میں نے اپنی تمام اس طاقت کے ساتھ جو مجھ میں باقی تھی اس ایک رحیم و کریم خدا کے نام پر ان کو مدد کے لئے بلایا۔

مجھے ان لوگوں کے تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد حیرت و استعجاب کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پھر ایک عورت کی چیخ سنائی دی۔ آس پاس کی تمام چیزوں کی ہیئت مجھے تبدیل ہوتی ہوئی نظر آئی۔ تمام صحرا مجھے گھومتا ہوا معلوم ہوا اور پھر مجھے کسی بات کی خبر نہ رہی۔

جب میں نے دوسری مرتبہ اپنی تھکی ہوئی بخار آلود آنکھیں کھولیں تو میں نے اپنے آپ کو ایک عالیشان کمرے میں ایک نرم ریشمیں بستر پر دیکھا۔ میرے آس پاس کتنے ہی خدام کھڑے تھے جو میری ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تیار تھے۔ میں نے ایک بلورین گلاس میں سرد پانی کے دو گھونٹ ان سے لے کر پیئے اور پھر اُٹھ کر اُن سے پوچھا کہ میں کہاں ہوں۔ خدام نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ جُھک کر مجھے سلام کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔ چند منٹ کے بعد ریشم کے فرو فرو نے مجھے چوکنا کر دیا۔ اور ایک دُوسرے لمحے میں میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ انتہائے مسرت میں میرے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور میں نے دوڑ کر خیرار کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

حرم کے زرق برق لباس میں جو گلابی ریشم سے بنا ہوا تھا، وہ نہایت دلفریب معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی اس کی آنکھوں کے گرد گزشتہ چند روز کی کوفت کے باعث سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے، اتنے میں ایک بلند بالا قامت کا شخص جس کی وضع و قطع نہایت شاندار تھی کمرے میں داخل ہوا، اس نے اعلےٰ درجہ کی ریشمیں قبا پہن رکھی تھی اور اس کی دستار میں ایک بہت بڑا ہیرا چمک رہا تھا۔ خیرار اسے دیکھتے ہی میری آغوش سے الگ ہو گئی اور اپنے باپ سلطان ابیا سے میرا تعارف کرایا۔

سلطان نے پرجوش مصافحہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا "میری زندگی اور میری سلطنت تمہارے

ہی احسان کی بدولت ہے ۔خیرا نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے اس کے ساتھ کیسا رحیمانہ سلوک کیا ۔ اور یہ تمہاری ہی تنبیہ کا نتیجہ ہے کہ ہم ازجر کو شکست دے کر اپنے ملک سے نکالنے کے قابل ہو گئے ۔"

میں نے خیرا سے مخاطب ہو کر کہا " اے دریائے لطافت کی موج ! کیا تو ان سے بچ کر نکل گئی تھی ؟"

خیرا نے کہا " ہاں مجھے تمہارے دو سواروں نے آہی لیا تھا ۔ مگر میں نے خفیہ راستہ اختیار کر لیا ۔ اور وہ بھٹک کر دوسری طرف نکل گئے ۔"

سلطان نے کہا " تقدیر کے مالک خدا نے ہمارے سپاہیوں کے دلوں کو ہماری نازک حالت سے آگاہ کر دیا اور وہ اسی رات واپس آ گئے ۔ خدا کی نصرت کی ہوا چلی ، اس کی مہربانیوں کا آفتاب چمکا ۔ جو خبر خیرا لے کر آئی تھی ، اس پر فوراً عمل درآمد کیا گیا ۔ اور شہر کی مدافعانہ تدابیر اس قدر مستحکم ہو گئیں ، کہ دوپہر کے وقت جب حملہ ہوا ۔ تو ہماری توپوں نے تمہارے قبیلے کے آدمیوں کو اس طرح اُڑا دیا ، جس طرح باد تند و تیز ریت کے ذروں کو اڑا لے جاتی ہے ۔ پورے چھ گھنٹے تک وہ لڑتے رہے ۔ لیکن شہر کے دروازوں کو توڑنے کے متعلق ان کی تمام کوششیں ناکام رہیں بیشمار قتل ہوئے ۔ مٹھی بھر آدمی جو بچ رہے تھے ۔ مقابلہ ترک کرنے پر مجبور ہو گئے ۔ پانچ سو کے قریب قیدی ہمارے ہاتھ آئے جن میں تمہارا شیخ بھی تھا ۔"

میں نے مختصر طور پر اپنی سرگزشت انہیں سنائی کہ کس طرح میری اور خیرا کی گفتگو سن لی گئی تھی ۔ اور پھر پوچھا کہ اس قیدِ جانکاہ سے آخر میری خلاصی کیونکر ہوئی ۔

خیرا نے کہا " لڑائی کے دوسرے دن ہم سب سیدی اکبر کے مقبرے پر خدا کا شکر ادا کرنے گئے تھے اور وہاں ہم نے تمہیں تپش اور پیاس کی شدت سے دم توڑتے ہوئے دیکھا ۔ تم نے ہمارے بادشاہ اور شہر کو بچانے کے لئے قربانی کی تھی ۔ اس لئے ہم تمہیں یہاں لے آئے ۔"

سلطان نے میرے ہاتھوں کو پکڑ لیا اور کہا "یہ تیرے قبضے میں زندگی کے سبزہ زاروں کی شادابی ہے۔ خدا تجھے مصیبت سے بچائے۔ اور تجھے کامل آرام و آسایش کے ساتھ سالہا سال تک زندہ رکھے۔ اور تجھے مسرت و شادمانی کے ہمیشہ رہنے والے باغات مرحمت فرمائے۔ درد و کلفت کا زنگ اپنے دِل کے آئینہ سے صاف کر دے۔ اور میرے ساتھ آ کہ اس فتح کی خوشی میں ایک دعوت تیار ہے۔"

اور ہم محلات کی عظیم الشان بارہ دریوں میں سے گزرتے ہوئے جو سنگ مرمر اور سونے سے تیار کی گئی تھیں ایک رفیع و عظیم دیوان میں پہنچ گئے۔ جہاں شاہی شامیانے کے نیچے کھڑے ہو کر جو زرد رنگ کے زربفت سے بنا ہوا تھا۔ سلطان ابیا نے مجھے اپنی عنایات سے سرفراز کیا۔ اور میرے نام کا اعلان یوں کیا:۔ "احمد۔ قوم ازجر کا ایک فرد اور مدینۃ السماء کا نجات دہندہ۔"

آخو میں کئی ماہ تک مقیم رہنے کے بعد میں نے اپنی قوم کے لوگوں سے صلح کر لی۔ اور ان کے پاس واپس چلا گیا۔ کیونکہ ریت کے ناپیدا کنار سمندر کی آزاد زندگی مجھے محلات کے آرام و آسایش اور شاہوں کے لطف و عنایات سے زیادہ بھاتی تھی۔

"ولیم لی کیو"

سراب نظر

وہ تھیئٹر کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔

رائیلے نے اُسے پکڑ لیا اور اندر داخل ہونے سے باز رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس نے

کہا، نہیں برونو! یہاں نہیں! طرب گاہوں میں اُس کی تلاش بے سود ہے۔"

مگر شکستہ دل ملاح نے جو اپنی بیوی کی جدائی میں دیوانہ ہو رہا تھا، نہایت روکھے پن سے اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے چھڑا لیا اور ایک عزم آہنی کے ساتھ یہ کہکر آگے بڑھ گیا "تم چاندی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا گنوا کر اُسے اِدھر اُدھر ڈھونڈتے پھرتے ہو اور میں جس کا خزانہ لُٹ گیا اُس کو تلاش نہ کروں؟"

برونو اپنی بیوی کو عصمت کی دیوی اور نیکی کا فرشتہ سمجھتا تھا وہ اُسے تمام گرجوں اور خانقاہوں میں، آبادی کے ہنگاموں اور جنگل کی عزلتوں میں ڈھونڈھ رہا تھا۔ برونو کا دوست رائیلے اُسکے اِس جنون میں اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ رائیلے کو معلوم ہو چکا تھا کہ میڈیلون اسی تھیٹر میں ایکٹریس کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اور اِس لئے وہ برونو کو ہر ممکن طریقے سے وہاں جانے سے روک رہا تھا۔ رائیلے کو یقین تھا کہ برونو اُس بیوی کو جس پر اُسے اس قدر حسن ظن ہے، اِس پست حالت میں دیکھ کر بالکل ہی دیوانہ ہو جائے گا۔

لیکن قبل اس کے کہ وہ اُسے دوبارہ روک سکے برونو نے ٹکٹ والے کی طرف ایک سکّہ پھینکا اور تماشائیوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا اِس طرح دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے

روشنی کے طوفان، موسیقی کے شور، زر و جواہر اور رنگ و زیبائش کے وفور سے برونو کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں اور اُس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ وہ ہجوم کے درمیان جہاں خود اُس نے اپنے آپ کو لا پھنسایا تھا ایک ستون کی مانند کھڑا تھا۔ اُس کا بلند و بالا قد سب سے اونچا نظر آ رہا تھا، اُس کی وحشت آمیز، دردمند آنکھیں ایک زخمی شیر کی طرح ہر طرف دیکھ رہی تھیں، اُس کی قمیص کا گریبان کھُل کر پیچھے کی طرف ہٹا ہوا تھا۔ اُس کے لمبے لمبے سیاہ بال لہریں لیتے ہوئے اُس کے گندمی چہرے کے پُرشکوہ اور سخت و درشت نقوش کی مخالف سمت چلے گئے تھے۔ وہ لوگوں کے

ہنستے ہوئے ہجوم کے درمیان بالکل ایک صحرائی درندے کی مانند گھرا ہوا تھا۔

سٹیج پر پریوں کے ملک کا ایک نظارہ پیش کیا جا رہا تھا اور لوگ اُسی کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے اور تالیاں بجا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک اور گھنٹی بجی۔ اِس دفعہ ایک ایسا نظارہ سامنے آیا کہ جس میں جنگل اور پانی، سیمین چشمے اور گلاب کے تختے دکھائے گئے۔ سفید پروں والی پریاں درختوں کی ٹہنیوں پر اُڑتی پھرتی تھیں۔ اور دوشیزہ لڑکیوں کی جماعتیں جن کے لباس دنیا کے ایک ایک پھول کی طرح ترتیب دیے گئے تھے، موسیقی کی ہر ہر لے کے ساتھ مِل مِل کر رقص کر رہی تھیں۔

ریویرا کے ماہی گیر کے لئے یہ سب کچھ حقیقی حیثیت رکھتا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی بھوری آنکھیں حیرت آمیز خوف کے ساتھ اس نظارے کو دیکھ رہی تھیں۔ اُس کے کُند دماغ میں جادو کی وہ کہانیاں چکر لگا رہی تھیں جو اُس نے اپنے بچپن میں سنی تھیں جو اُن ملکوں کے متعلق تھیں، جہاں اُس کے خیال کے مطابق کسی فانی انسان کے قدم نہیں پہنچ سکتے۔ وہ بالکل سیدھا کھڑا تھا حیران بے حس و حرکت، آواز کے زیر و بم، حرکات کی ہم آہنگی، اور روشنی کی جوت نے جو رات کی تاریکی میں سے یہاں آ کر اُس کی نظر کو خیرہ کر رہی تھی اُس کے سر کو چکرا دیا۔

اِس تمام عرصہ میں اُس کی نظر رقص کرنے والی ہزاروں لڑکیوں کے مجموعی حُسن میں سے ایک ایک کے چہرے پر متجسّسانہ پڑ رہی تھی ———— اُس چہرے کے تجسّس میں جس کو وہ آج تک نہ پا سکا تھا۔

پھولوں کی کیاریوں کو پھاندتی ہوئی اور مخملیں جادوں کو طے کرتی ہوئی ایک عورت کی سراپا شوکت صورت نظر آئی جس کا لباس کنول کے پھول کی طرح سجایا گیا تھا۔ اُس کا جسم "لباس کے پھول" کی سفید اور سبز پنکھڑیوں میں بمشکل چھپ رہا تھا۔ اُس کے سنہری بال ایک جوئے زریں کی طرح لہرا رہے تھے اور اُس کی نیلی نیلی آنکھیں مسرت و انبساط سے ہنس رہی تھیں۔

کوریالس جب لپک کر "پھول لڑکیوں" کے حلقہ میں آئی تو ایسا معلوم ہوا گویا وہ ابھی اپنے اُٹھتے ہوئے شباب کی فصلِ بہار میں ہے۔ اور جب اُس نے گانا شروع کیا تو اُس پر کسی بلبلِ خوش نوا کے ہلکے ہلکے اور بیٹھے میٹھے نغموں کا گمان ہونے لگا۔

معاً اُس کے نغموں کو چیرتی ہوئی ایک آواز آئی "یہ وہی ہے"۔

ایک لمحہ کے لئے وہ بالکل سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اُس کی آنکھیں روشنی سے چمک رہی تھیں اُس کا سینہ اُبھرتا تھا اور گرتا تھا۔ پھر وہ ایک ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا ہوا لوگوں کے سروں پر سے پھاندتا ہوا اور ایک نشست سے دوسری نشست پر کودتا ہوا اُس جگہ پہنچ گیا جہاں وہ کھڑی تھی۔

کوریالس کے لبوں کی موسیقی گُنگ ہوگئی۔ "پھول لڑکیوں" کا حلقہ اُسے اکیلے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اُس کی چمکتی ہوئی آنکھیں مجرمانہ ہراس سے بھر گئیں۔ وہ بے قوت اور بے حرکت اُس شخص کی طرف دیکھنے لگی جس کی عزت کو اُس نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اُدھر سازندوں پر اور حاضرین پر ایک خوف آمیز خاموشی چھا گئی۔

برونو نے اپنی باہیں اُس کے لئے پھیلادیں اور اُس کی آواز خاموشی کو لرزاتی ہوئی نکلی۔

"میڈیلون! میڈیلون!! تم جنت میں ہو اور مجھے بھلا چکی ہو۔ کیا یہ حقیقت ہے؟"

اُس کا سارا جسم مرجھا گیا، اُس کے اعضا کی قوت سلب ہوگئی، وہ کانپ اُٹھا اور پھر ایک سکتے کے عالم میں اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ ہجوم کے شور و غل اور متحیر حاضرین کی چیخ اور پکار میں کیا طاقت تھی کہ وہ اُس کے کانوں تک پہنچ سکیں۔ وہ صرف اُس عورت کی طرف دیکھ رہا تھا جسے اُس نے اس سُنسان دنیا میں ڈھونڈھ پایا تھا ——— اُس عورت کی طرف جو اُس سے اجتناب کر رہی تھی اور اُس سے خوف کھا رہی تھی۔

وہ مجرمانہ دہشت جو برونو نے اُس وقت اپنی بیوی کی آنکھوں میں دیکھی اُس کے دل و جگر کو

ایک خنجر کی طرح چیر گئی۔ اُس لرزا دینے والے خوف وہراس کے ساتھ جو اس وقت تک اُس کے حواس میں رواں دواں تھا ایسا معلوم ہوا کہ اُس کے ہوش پھر بجا ہو رہے ہیں۔ اُس نے اپنا سر اُوپر کو اُٹھایا اِس طرح جیسے کوئی شیر ایک جانکاہ زخم کھا کر بس آخری بار اپنے دشمن کو دیکھنا چاہے، اُس نے ایک نگاہ غصے سے بھرے ہوئے اور طیش سے وارفتہ تماشائیوں پر ڈالی۔ اور پھر ایک دفعہ اور اپنی بیوی کو دیکھا ——— اُس کے برف جیسے سفید اعضا، کو اُس کے سینے کو جو اُس کی زریں پوشاک میں سے کھُلا ہوا اُبھر اور گر رہا تھا، اُس کے زنگ آلود حسُن کو جو زہ دیگ سے شباب کی تمام رعنائیوں سے معرّا نظر آتا تھا۔

اُس وقت اُس پر روشن ہوا کہ یہ جنت نہیں بلکہ دوزخ ہے اور اس روشنی نے اُس سراب نظر کو جو اُس کی آدھی زندگی تک اُسے دھوکا دیتا رہا چیر کر دو ٹکڑے کر دیا۔ اُس نے اُسے پکڑ لیا، اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، پھر اُس کے نرم و نازک جسم کو بھینچ ڈالا۔ اور ایک چیخ کے ساتھ جو تمام لوگوں کے دلوں سے اس طرح گزر گئی جیسے وہ سب یک دل و یک رُوح تھے اُس نے اُسے دھکا دے کر ایک طرف پھینک دیا۔

"تم میری بیوی نہیں ہو گو تمہاری شکل و صورت ویسی ہی ہے! آہ، اے نابکار ظالم شیطان! تُو میرا مُنہ چڑاتا ہے۔ آہ! تُو نے اس کے ساتھ کیا کیا جس سے میری روح محبت کرتی تھی؛ تو اُس کے اعضا سے ضیاں کاروں کی آنکھوں کی دعوت کرتا ہے، تو اُس کا حُسن شہوت پرست ہجوم کے درمیان لُٹاتا ہے اور وہ ہونٹ جو صرف میرے چُومنے کے لئے تھے تُو ان تماشائیوں کے سامنے پیش کرتا ہے مجھے بتا! وہ رُوح کہاں ہے جس کی میں پرستش کرتا تھا؟ وہ زندگی کہاں ہے جس سے مجھے محبت تھی؛ وہ خدا کی تھیں۔ تو اُن پر اپنا تصرّف نہ کر سکتا تھا! وہ اُسی کے ہاتھ میں ہیں۔ تو اُن پر اُس کے جسم کی طرح قبضہ نہ کر سکتا تھا!"

ایک پل کے لیئے وہ اس طرح کھڑا رہا جیسے ایک جوانمرد سینے میں گولی کھا کر کھڑا رہتا ہے۔ پھر اُس کی شعلہ بار آنکھیں جنہیں اب کچھ نظر نہ آتا تھا اُن گروہ در گروہ تماشائیوں پر اُٹھیں جو اب اپنی نشستیں چھوڑ چکے تھے۔ اُس کے چہرے پر اس وقت نامرادی و ناکامی کی ناقابلِ اظہار شان نمایاں تھی۔ اُس کے ٹوٹے ہوئے دِل سے ایک زور کی چیخ نکلی، پھر وہ اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنے سر کی طرف لے گیا اور دھڑام سے زمین پر گر پڑا، اُس کی پیشانی اُس کی بیوی کے سینے پر آ رہی۔ اُس کے مُنہ سے لہو جاری ہو گیا اور اس خون سے نرگس کے وہ پھول جو اُس کی بیوی کے لباس میں پروئے گئے تھے سُرخ ہو گئے۔ جب لوگوں نے اُسے اُٹھایا تو وہ مر چکا تھا ـــــ وہ بیس سال سے مر رہا تھا +

"اویڈا"

دولت یا محبّت

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامّل نہیں کہ محبت کرنا روپیہ کمانے سے کہیں زیادہ مشکل ہے روپیہ تو ایک احمق بھی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن ایک ایسا آدمی نہایت ہی کمیاب ہے جو اپنے کلبۂ احزان میں پڑا پڑا اوم توڑ دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اور شاید کسی کلبی ہی کو اس پر اصرار ہو گا کہ کوئی بیوقوف بھی محبت کر سکتا ہے۔ کیونکہ اِس صورت میں ہمیں دنیا کا شیرازہ منتظم نظر نہ آتا! آپ عدالت ہی میں جا کر طلاقوں کی فہرست دیکھ لیجئے کہ کتنوں نے اپنی حماقت سے محبت کو مکدر کر دیا ہے۔

آلیور ہیل بران ایک کامیاب مصنف ہے جو اپنے پُرتکلف دار المطالعہ میں بیٹھا ایک ناول کے ابتدائی ابواب اپنی ٹائپسٹ جیبیدا کاکس سے لکھوا رہا ہے۔ ہیل بران اپنی عمر کے ساٹھ برس گزار

چکا ہے مگر محبت کے افسانوں کا اثر ہے کہ اس کا دل ابھی جوان ہے، کامیابی کی گرمی اُس کے خون میں جوش پیدا کرتی ہے اور وہ ہر سال نہایت باقاعدگی سے پچیس ناول لکھ ڈالتا ہے۔ اُس کے رقیب جو ابھی نوجوان ہیں اس پر طیش بھی کھاتے ہیں مگر تخیل کی رسائی پر کس کا زور چلتا ہے۔

جبیبکا کا سن صرف اکیس برس کی ہے، مگر چونکہ سترہ برس کی عمر سے کمانے کا بار اُس کے سر پر پڑ چکا ہے اس لئے اب وہ اچھی خاصی عورت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یتیم ہے ہمیشہ اکیلی رہی ہے اور اُس کی واقفیت بہت کم ہے۔ اُس کا جسم مختصر سا ہے مگر اُس میں کام کرنے کی غیر معمولی قوت ہے۔ اور اس کی ایک خاص ادا ہے جو بعض اوقات اسے بے اندازہ خوبصورت بنا دیتی ہے۔

ہیل بران نے کہا "میری یہ کہانی پہلی تمام کہانیوں سے مختلف رنگ رکھتی ہے"۔

تجربہ کار جبیبکا نے جواب دیا "ہاں سب مصنف یوں ہی کہا کرتے ہیں۔ میں نے جس کسی کی کتاب بھی لکھی ہے اُسے اسی زعم میں دیکھا ہے کہ اُس کی یہ کتاب صدی کی بہترین کتاب ہے"

مصنف نے کہا مگر یہ کہانی اُس مقام سے شروع ہوتی ہے۔ جہاں لوگ ختم کرنے کا خیال کر رہے ہوتے ہیں"۔

جبیبکا نے کاغذ کے صاف تختے پر موٹے حرفوں میں "پہلا باب" لکھا اور کہنے لگی "اچھا تو میں تیار ہوں۔ آپ شروع کیجئے"۔

ہیل بران نے کہا "افسانے کا نام ہے" دولت یا محبت"۔ ہیروئن ایک مصیبت زدہ لڑکی ہے۔ اور میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اُس کی تصویر کھینچنے میں میرے مدِ نظر تمہاری ذات ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا"۔

جبیبکا نے رنجیدہ آواز میں جواب دیا "نہیں بالکل نہیں۔ اب مجھے اِن باتوں کی کچھ عادت سی ہو گئی ہے، اور جب تک مجھے ہر جمعہ کے دِن اپنی مزدوری مل جاتی ہے۔ میں نے ایسی باتوں

کا خیال کرنا چھوڑ دیا ہے"۔

"آؤ پھر شروع کریں"۔

"بہت اچھا"۔

ہیل بران نے لکھوانا شروع کیا "دوپہر کا وقت تھا، باغ میں تپتی ہوئی دھوپ میں ایک آدمی اور ایک لڑکی کھڑے تھے۔ لڑکی کا سر سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ سٹیفن ریسٹ نے حریص نظروں سے خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھا جو ایک آرام کرسی میں لیٹی ہوئی تھی۔ 'نیا پارہ'۔ یکایک وہ اُس طرف مڑا "گلوریا! مجھے تم سے محبت ہے، بے اندازہ محبت، تمہاری محبت میرے دل میں مدت سے بسی ہوئی ہے تم دنیا میں اکیلی ہو، مجھے اپنی تنہائی کا مونس بنا لو۔ گلوریا! تم مجھ سے شادی کرو گی!" "نہیں" اُس نے جواب دیا "تم مجھ پر بڑی مہربانی کرتے ہو مگر میں تم سے شادی نہیں کر سکتی"۔

مس کاکس نے جو خاموش لکھ رہی تھی پنسل ہاتھ سے رکھ دی اور ہیل بران کی طرف دیکھنے لگی "معاف کیجئے گا۔ لیکن آپ حقیقت سے ذرا دُور چلے گئے ہیں۔ ایک لڑکی جو مجھ جیسی بے یار و مددگار ہو ——— گلوریا جیسی ——— وہ شادی کے پیغام کو اس آسانی سے رد نہیں کر سکتی، یہ فطرت کے خلاف ہے"۔

ہیل بران وقت ضائع نہیں کیا کرتا تھا مگر بولنے سے پہلے اس نے کوئی دس سیکنڈ تک جیسیکا کی طرف غور سے دیکھا۔

اُس نے کہا "عام طور پر محبت کے متعلق کچھ کہنے کا حق جوانوں ہی کے لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ میرا شمار اب بوڑھوں میں ہے۔ مگر مجھے اُمید ہے کہ میں ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا کہ محبت کی نسبت میرے خیالات کو غلط سمجھا جائے ——— گو لوگوں نے اب نئے نئے انداز اختیار کر لئے ہیں اور تہذیب بھی بہت ترقی کر گئی ہے"۔

جیسیکا کی ہنسی سے کمرہ گونج اٹھا۔

اُس نے جواب دیا۔ "بڑھاپے کی تو خیر کوئی بات نہیں، لیکن آپ کے خیالات ضرور دقیانوسی ہیں۔ آج کل ہم لوگ زندگی کو تجارتی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں ——— ہر شخص اور ہر چیز آج کل دنیا میں ایک مالی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے اس کا تجربہ تو نہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ لڑکیاں محبت کی بجائے دولت پر زیادہ فریفتہ ہو جاتی ہیں۔"

ہیل بران نے آہستہ سے کہا "کلبیت"۔

لڑکی نے کہا۔ "کلبیت ہی تو تہذیبِ حاضر کا پروانہ ہے۔"

ہیل بران نے کہا۔ "میں اِس سے انکار نہیں کر سکتا۔ مگر یہ اس بات کا صرف نظریاتی پہلو ہے اور عملی نقطۂ نظر سے مجھے یقین ہے کہ کوئی اس زمانے کی لڑکی بھی کسی کروڑپتی سے شادی کا فیصلہ کرنے میں اُسی قدر متامل ہوگی جتنی آج سے دو پشت پہلے کی لڑکی ہوتی تھی، بجز اس کے کہ اُسے اُس سے محبت ہو۔"

"میں آپ کے اس دعوے سے متفق نہیں۔ جب آپ مانتے ہیں کہ نظریاتی پہلو سے میں درست کہتی ہوں۔ تو آپ کو یہ بھی ماننا چاہیئے کہ گلوریا یقیناً سٹیفن کو بغیر کسی غور کے قبول کر لیتی۔"

ہیل بران نے پُرغرور انداز سے کہا۔ "میرے افسانے حقیقی زندگی پیش کرتے ہیں۔ اگر میرے ناولوں کی بنیاد نظریوں پر ہو تو وہ بک نہیں سکتے۔ گلوریا، جیسا میرا اُس کا ——— تمہارا ——— تصوّر ہے، کسی شخص سے محض اس لئے شادی کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہیں کر سکتی کہ وہ اتفاق سے بڑا امیر ہے۔"

جیسیکا نے جواب دیا۔ "آپ کا خیال غلط ہے۔ چونکہ آپ مجھے اس افسانے میں گھسیٹ رہے ہیں۔ اِس لئے میں کہہ سکتی ہوں کہ اگر مجھ سے بدصورت سے بدصورت آدمی بھی شادی کرنے

کو کہے۔ تو میں انکار نہ کر سکوں۔ بشرطیکہ اُس کے الفاظ کی پشت پر چوکھا سونا کھنکھنا رہا ہو۔"

ہیل بران نے کہا "کچھ بھی ہو تمہارا خیال غلط ہے۔"

"نہیں، غلط نہیں ـــــ کام، کام، کام ـــــ اور کس لئے؟ کیا میں اتنا کما لیتی ہوں کہ زندگی کا لطف اُٹھا سکوں؟ میں آپ کو ایسی لڑکیاں دکھا سکتی ہوں جو عسرت کے مصائب سے تنگ آ کر آرام کے اُن اوقات کی حسرت دِل میں رکھتی ہیں جنہیں دولت خرید سکتی ہے۔"

ہیل بران نے مایوسانہ لہجہ میں کہا "دنیا میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں، جنہیں دولت نہیں خرید سکتی۔"

جیسیکا نے کہا "سچ ہے، مگر موجودہ حالت میں میرے پاس کیا ہے ـــــ حالانکہ روپیہ ہو تو......"

"بعض ایسے افکار بھی ہو سکتے ہیں جن کا فی الحال تمہیں علم نہیں۔"

جیسیکا نے ہنس کر کہا "ایک وقت میں مَیں ایک ہی خاوند سے شادی کر سکتی ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ بالکل کافی ہے۔"

ہیل بران لڑکی کے اس سبک سرانہ طرزِ گفتگو پر چیں بہ جبیں ہو گیا۔ پھر یکایک اُس کے چہرے کی کیفیت بدل گئی، وہ اس کیطرف بڑھا اور اُس نے جیسیکا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

"مِس کاکس ـــــ جیسیکا ـــــ جو کچھ تم کہہ رہی ہو مجھے اس میں امید کی ایک کرن چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے ـــــ بے اندازہ محبت ـــــ تمہاری محبت میرے دِل میں مدت سے بسی ہوئی ہے ـــــ تم دنیا میں اکیلی ہو ـــــ مجھے اپنی تنہائی کا مونس بنا لو ـــــ جیسیکا، تم مجھ سے شادی کرو گی؟" اُس نے یہ الفاظ نہایت پُر ارمان نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ختم کئے اور اُس کی آواز میں ایک غیر معمولی تڑپ تھی۔

"شادی کروں!" جیسیکا نے گھبرا کر کہا۔ پھر بولی "نہیں، آپ مجھ پر بڑی مہربانی کرتے ہیں مگر میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے آپ سے محبت نہیں ——— ایک طرح مجھے آپ سے محبت ہے ——— مگر میں جوان ہوں اور آپ بوڑھے ہیں ——— اور ——— اور سخت ...." اور اُس نے اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔

ہیل بران نے بے تاب ہو کر کہا "سٹیفن بریسٹ بھی ایسا ہی تھا۔ چلو اب لکھو۔ کھانے سے پہلے پہلے میں افتتاحی باب کو ختم کرنا چاہتا ہوں"

سٹینلے جے رابن سٹین
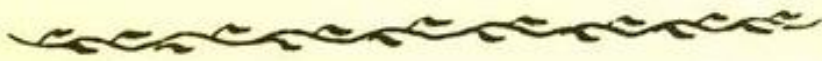
روس

خزاں کی ایک رات

موسمِ خزاں کی ایک رات کا ذکر ہے میں عجب بے اطمینانی اور بے چینی کی حالت میں تھا جس قصبہ میں مَیں ابھی ابھی وارد ہُوا تھا اور جہاں میں کسی ایک متنفس سے بھی واقف نہ تھا میں نے اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ میری جیب میں ایک پائی نہ تھی اور رات بھر کا بسیرا بستر نہ تھا۔

پہلے چند روز میں میں نے اپنے لباس کا ہر وہ حصہ بیچ کھایا جس کے بغیر میں اِدھر اُدھر جا آسکتا تھا۔ پھر شہر کو چھوڑ کر اُس حصہ میں چلا آیا جہاں دُخانی جہازوں کے گھاٹ بنے ہوئے ہیں ...... وہ حصہ جو جہاز رانی کے زمانے میں زندگی کی جد وجہد کا مرکز بنا رہتا ہے لیکن جواب خاموش اور سنسان تھا۔ کیونکہ یہ ماہِ اکتوبر کے آخری دِن تھے۔

گیلی گیلی ریت پر اپنے پاؤں کو گھسیٹتے ہوئے کہ شاید اس میں کسی قسم کی خوراک کا کوئی ٹکڑا دبا ہُوا ہو میں تن تنہا خالی مکانوں اور گوداموں میں گھوم رہا تھا۔ اور دِل ہی دِل میں یہ خیال کر رہا تھا کہ کیا اچھا ہو جو پیٹ بھر کر کھانے کو مِل جائے۔

موجودہ تہذیب و تمدن کو دیکھ کر ہمارا دِل تو سیر ہو جاتا ہے لیکن ہمارا جسم بھوکا ہی رہتا ہے بازاروں میں جاؤ، تم عالی شان عمارتوں میں گھِر جاؤ گے۔ اور اُن کا نظارہ فنِ تعمیر، ترقی معاشرت اور ایسے ہی بلند پروازی کے دوسرے موضوعات پر تمہارے خیالات کے لئے تقویت بخش ثابت ہو گا

مت کو عمدہ عمدہ گرم لباسوں میں لپٹے ہوئے لوگ ملیں گے —— بڑے نرمی سے بات کرنے والے، بڑی حکمت سے کنّی کترا کے نکل جانے والے، تمہارے ننگِ زمانہ وجود سے نامعلوم طریقے پر نظریں پھیر لینے والے۔ ہاں، ہاں۔ ایک بھوکے آدمی کا دل ہمیشہ اُس شخص سے زیادہ تندرست اور توانا ہوتا ہے جسے پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا ہو اور عسرت ہی وہ صورتِ حالات ہے جس میں ہمیں اُن لوگوں کی بہبود کا خیال آتا ہے جن کا وقت فاقہ مستی میں کٹتا ہے۔

شام کا سایہ بڑھا چلا آتا تھا، مینہ برس رہا تھا اور شمال کی تیز و تند ہوا چل رہی تھی۔ خالی بیٹھکوں اور دوکانوں میں اُس کے گزرنے سے چیخوں کی سی آواز پیدا ہوتی تھی اور دریا کی لہریں جو شور مچاتی ہوئی ریتیلے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں اُس کے طمانچوں سے کف آلود ہو جاتی تھیں اُچھل اُچھل کر گرتی تھیں، ایک کے پیچھے ایک ہو کر دھندلی دوریوں کی طرف بھاگی جاتی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دریا جاڑے کی شکل دیکھتے ہی بے تحاشا بھاگا ہے کہ کہیں شمال کی برفانی ہوا اپنی بیڑیاں آج ہی رات اُس کے پاؤں میں نہ ڈال دے۔ آسمان بوجھل اور تاریک ہو رہا تھا اور اُس پر سے مینہ کے باریک باریک قطرے لگاتار گر رہے تھے۔ فطرت کا غم انگیز ماتمی گیت بیدِ مجنوں کے دو بدشکل درختوں اور ایک اوندھی پڑی ہوئی اور اِن درختوں سے بندھی ہوئی کشتی کی موجودگی سے اور بھی مؤثر ہو گیا تھا۔

اُلٹی ہوئی کشتی جس کا پیندا اپھٹا ہوا تھا اور خراب و خستہ بوڑھے درخت جن کے برگ و ساز سرد ہوا لوٹ لے گئی تھی بلکہ ہر وہ چیز جو میرے ارد گرد پھیلی تھی مفلوک الحال، ابتر اور بے جان نظر آتی تھی۔ اور اس نظارے کو دیکھ دیکھ کر آسمان کے آنسو نہ تھمتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر چیز بتیرہ و تار ہو رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز مر چکی ہے اور صرف میں اکیلا زندہ رہ گیا ہوں اور میرے لئے بھی موت کا یہ زہر برا انتظار کر رہا ہے۔

اُس وقت میری عمر اٹھارہ برس کی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ہی زمانہ تھا؛

میں سرد گیلی ریت پر دُور تک چلا گیا۔ سردی اور بھوک کے اعزاز میں میرے دانت ایک ساز کی طرح بج رہے تھے۔ ایک جگہ خالی الماریوں کے پیچھے میں کوئی کھانے کی چیز تلاش کر رہا تھا کہ یکایک میری نظر ایک انسانی صورت پر پڑی۔ اُس کا نسوانی لباس بارش کی وجہ سے تربہ تر ہو کر اُس کے جھکے ہوئے کندھوں سے پیوست ہو گیا تھا۔ میں چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا کہ وہ کیا کرتی ہے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ریت میں کوئی خندق کھود رہی ہے۔

"تم یہ کیا کر رہی ہو"؟ میں نے اُس کے قریب جا کر کہا۔

ایک ہلکی سی چیخ اُس کے منہ سے نکلی اور وہ کھڑی ہو گئی۔ اب کہ وہ خوف سے بھری ہوئی بڑی بڑی نیلی نیلی آنکھیں کھولے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہ ایک لڑکی ہے میری ہی عمر کی، جس کے روشن چہرے کو تین بڑے بڑے نیلے داغوں نے گہنا رکھا ہے۔ گو ان داغوں کی تقسیم اُس کے چہرے پر نہایت موزونیت اور تناسب کے ساتھ ہوئی تھی پھر بھی اُنہوں نے اُس کے حسن کو چھپا دیا تھا۔ تینوں اپنی اپنی جگہ اکیلے اکیلے نمایاں تھے۔ سب جسامت میں تقریباً برابر تھے ——— دو آنکھوں کے نیچے اور ایک جو ذرا بڑا تھا پیشانی پر ناک کے عین اُوپر بلا شبہ یہ کام تھا کسی اُس حسن کار کا جو انسانی صورتوں کے بگاڑنے کا خُوگر ہو۔

وہ میری طرف دیکھتی رہی اور اُس کی آنکھوں میں سے وحشت آہستہ آہستہ مفقود ہوتی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس نے ہاتھوں پر سے ریت جھاڑی، اپنے سر کے سوتی رومال کو ترتیب سے باندھا۔ پھر ذرا جھجکی اور کہا:

"میں سمجھتی ہوں کہ تمہیں بھی کھانے کے لئے کچھ چاہیئے؛ تو پھر اس جگہ کو کھودو! میرے ہاتھ تھک گئے ہیں۔ یہاں" ——— اُس نے اپنے سر کی جُنبش سے ایک دوکان کی طرف

اشارہ کیا ــــــ "یہاں روٹی کا مِل جانا یقینی ہے۔ . . . . اور سالن کا بھی۔ . . . یہ دوکان اِن دِنوں بھی کاروبار کر رہی ہے۔"

میں کھودنے لگا۔ کچھ دیر ٹھہر کر اور میری طرف دیکھنے کے بعد وہ میرے قریب بیٹھ گئی اور مجھے مدد دینے لگی۔

ہم خاموشی کے ساتھ کام کرتے رہے۔ میں اب نہیں کہہ سکتا کہ اُس وقت جرم، قانون ملکیت اور ایسی ہی وہ تمام دُوسری باتیں جن کے متعلق تجربہ کاروں کی رائے ہے کہ زندگی کے ہر لمحہ میں ملحوظ رہنی چاہئیں میرے خیال میں تھیں یا نہیں۔ صداقت کے انتہائی قریب رہتے ہوئے میں اِقرار کرتا ہوں کہ میں کھودنے میں اتنا منہمک تھا کہ اس ایک بات کے سِوا کوئی دوسری بات میرے وہم وخیال میں بھی نہ آتی تھی کہ اِس الماری کے اندر کیا ہو گا؟

شام کا سایہ پھیلتا گیا۔ چاروں طرف گہری تاریکی بڑھتی گئی۔ موجوں کا شور بھاری ہوتا گیا اور مینہ کے چھینٹے الماری کے تختوں پر پہلے سے بلند آواز کے ساتھ گِرنے لگے۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر پہرہ داروں کی آوازیں آنے لگیں۔

"اِس کی کوئی تہ بھی ہے؟" اُس نے آہستہ سے پوچھا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ اُس نے کیا کہا۔ اِس لئے میں خاموش رہا۔

"میں کہتی ہوں۔ اِس الماری کی کوئی تہ بھی ہے؟ کہیں یہ نہ ہو کہ ہم کھودتے کھودتے ایک خندق بنادیں اور نتیجہ یہ ہو کہ الماری کے نیچے بھی لکڑی کے مضبوط تختے لگے ہوں۔ ایسی صورت میں ہم کیونکر انہیں اُکھاڑ سکیں گے؟ بہتر ہو کہ تالے کو توڑ ڈالیں ــــ اِس ناکارہ تالے کو۔"

عورتوں کو عمدہ خیالات شاذو نادر ہی سُوجھتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی سُوجھ ضرور جاتے ہیں۔ میں نے عمدہ خیالات کی ہمیشہ قدر کی ہے۔ اور ہمیشہ جہاں تک ممکن ہو سکے اُن سے مستفید ہونے

کی کوشش کی ہے۔

میں نے تالے کو پکڑ کر اس زور سے مروڑا کہ وہ کنڈی سمیت اُکھڑ آیا۔ وہ جھپٹ کر آگے بڑھی اور الماری کا جائزہ لیتی ہوئی مجھ سے یوں کہنے لگی "تم تو پتھر ہو پتھر!"

آج کسی عورت کا ایک چھوٹا سا تعریفی فقرہ میرے لئے اُس مرد کے بڑے سے بڑے قصیدے سے بھی زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے جس میں تمام قدیم اور جدید لسانوں کی لسانیاں جمع ہوں لیکن اُس وقت میرے مزاج میں اکھڑپن تھا اور اب اُس کی اصلاح ہو چکی ہے۔ چنانچہ اُس کی تحسین و تعریف پر کان نہ دھرتے ہوئے میں نے بے تابانہ اُس سے سوال کیا۔

"اِس میں کچھ ہے بھی؟"

وہ ایک بے کیف آواز کے ساتھ سب چیزوں کو گِننے لگی۔

"ٹوکری بھر بوتلیں ——— پوستینیں ——— ایک چھتری ——— لوہے کی ایک گڑوی"

اِن میں کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ میری تمام اُمیدیں مٹ گئیں .... لیکن یکایک وہ شگفتہ خاطر ہو کر بولی:۔

"اہا! یہ لو!!"

"کیا؟"

"روٹی ...... ایک روٹی ...... صرف بھیگ رہی ہے .... یہ لو!"

اُس نے اُسے میری طرف پھینک دیا اور پھر خود بھی چلی آئی۔ اُس کے آنے تک میں نے ایک بڑا سا لقمہ دانتوں سے توڑ کر اپنا منہ بھر لیا تھا اور اب اُسے چبا رہا تھا ......

"آؤ! اس میں سے مجھے بھی تھوڑی سی دو ...... اور ہمیں یہاں ٹھیرنا نہیں چاہیے ...... لیکن ہم کہاں جائیں" وہ ہر طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے لگی ...... فضا

میں تاریکی، نمی اور شور تھا۔

”دیکھو وہ ایک اُلٹی ہوئی کشتی پڑی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آؤ وہاں چلیں“۔

”چلو!“ اور ہم چل پڑے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے مالِ غنیمت کے حصے بخرے کرتے ہوئے اور اُس کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے اپنے کلّوں کو بھرتے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بارش اور تیز ہو گئی، دریا رعد کی طرح گرجنے لگا۔ کہیں نہ کہیں ایک مسلسل مضحکہ اڑانے والی سیٹی بج رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی بالا و برتر ہستی جسے کائنات میں کسی کا خوف نہ ہو تمام زمینی سرگرمیوں کی خزاں کی، اس ہیبت ناک رات کی اور ہماری جو اس طوفانی رات کے ہیرو ہیں ہنسی اُڑا رہی ہے۔ اِس ہنسی کو سُن کر میرا دِل پارہ پارہ ہو گیا، مگر اس کے باوجود میں اپنی روٹی حریصانہ کھاتا رہا۔ اور یہ لڑکی جو میرے بائیں جانب ساتھ ساتھ چل رہی تھی اس معاملہ میں بھی میرے قدم بہ قدم جا رہی تھی۔

میں نے ابھی تک اُس کا نام دریافت نہ کیا تھا، اب میں نے کہا ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”نٹاشا“ اُس نے جھٹ جواب دیا۔

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ میرے دِل میں درد کی ایک ٹیس اُٹھی، اور پھر میں نے اپنی نظریں رات کی تاریکی کی طرف پھیر لیں اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری قسمت کی بداندیش صورت میری طرف دیکھ دیکھ کر عجب پُر اسرار اور بے رحمانہ انداز سے مُسکرا رہی ہے۔

مینہ کشتی کے تختوں پر تازیانوں کی طرح مسلسل پڑ رہا تھا، اس کی ہلکی ہلکی ٹپ ٹپ غم و الم کے خیالات برانگیختہ کر رہی تھی اور ہوا جب کشتی کی ایک درز میں سے اس کے ٹوٹے ہوئے پیندے میں داخل ہوتی تھی تو اس میں سے ایک عجب اضطراب انگیز اور اُداس آواز اُٹھتی تھی۔ دریا کی لہریں آ آ کر ساحل سے ٹکراتی تھیں تو اُن میں سے ایک بھیانک اور مایوس کن صدا پیدا ہوتی تھی اس طرح جیسے وہ کوئی رنج دِہ اور ناقابلِ برداشت کہانی سُنا رہی ہیں۔ جو خود اُن کی ہمتوں کو

توڑتوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ایسی کہانی جس کو سنائے بغیر وہ بھاگ جانا چاہتی ہیں لیکن جس کے سنانے پر وہ مجبور ہیں۔ بارش کی آواز دریا کی آواز سے مِل کر ایک آہِ مسلسل بن جاتی تھی جو اندھی کشتی کے اوپر تیرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی ——— جفاکش، زخمی دِل اور خستہ و ماندہ زمین کی وہ بے اختتام آہ جو تابان و درخشاں بہاریں سے نکل کر سرد، کہر آلود اور تاریک خزاں کی منزل سے گزرتے وقت اُس کے سینے میں سے نکلتی تھی، ہوا سنسان اور کف انگیز دریا پر چل رہی تھی ——— چل رہی تھی اور اپنے المناک راگ گائے چلی جاتی تھی۔

کشتی کی اوٹ میں ہم بالکل بے آرامی کی حالت میں پڑے تھے۔ یہ تنگ تھی اور بھیگ رہی تھی۔ ٹوٹے ہوئے پیندے میں سے بارش کے چھوٹے چھوٹے سرد قطرے ٹپکتے تھے اور ہوا کے سرد جھونکے اندر داخل ہوتے تھے۔ ہم خاموش بیٹھے تھے اور سردی سے کانپ رہے تھے۔ پھر مجھے نیند کا خیال آیا۔ نتاشا کشتی سے سہارا لگائے گچھم گچھا ہو کر ایک چھوٹی سی گیند بنی بیٹھی تھی۔ اپنی باہوں کو اپنے گھٹنے کے گرد لپیٹے ہوئے اور اپنی ٹھوڑی کو گھٹنوں پر ٹکائے ہوئے اپنی کشادہ آنکھوں سے وہ دریا کی طرف گھور رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں اُس کے زرد چہرے پر نیلے داغوں کی وجہ سے اور بھی بڑی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ بالکل بے حرکت ہو رہی تھی اور یہ سکون سکوت ——— میں محسوس کرنے لگا کہ میرے اندر رفتہ رفتہ اُس کی طرف سے ایک خوف پیدا کر رہا ہے ——— میں اُس سے گفتگو کرنا چاہتا تھا مگر یہ سوچ رہا تھا کہ کیونکر شروع کروں۔

آخر اُسی نے ابتدا کی:۔

"زندگی کیسا دُکھ ہے!" اُس نے نہایت صفائی، محویّت اور یقین کے لہجے میں کہا۔

لیکن یہ شکایت نہ تھی۔ اِن الفاظ کو کچھ ایسی بے اعتنائی سے ادا کیا گیا تھا کہ ان میں شکایت کا شائبہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس سادہ اور بے لوث روح نے زندگی پر اپنی سمجھ کے مطابق

غور کیا تھا ـــــ غور کیا تھا اور ایک نتیجہ پر پہنچ کر اُسے بلند آہنگی سے بیان کر دیا تھا۔ اور میں اُس کی تردید نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ اگر میں ایسا کرتا تو یہ میری اپنی تردید ہوتی۔ اِس لئے میں خاموش رہا اور وہ اُسی طرح بے حرکت بیٹھی رہی۔

"کیا ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر ہم زندگی کو بُرا بھی کہہ دیں"؟ نٹاشا نے پھر کہا۔ اس دفعہ بھی اُس کے لہجہ میں شکایت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ زندگی کے متعلق ان خیالات کے اظہار کے وقت اُس کے پیشِ نظر اُس کی اپنی ذات تھی، اور اُسے یقین ہو چکا تھا کہ اپنے آپ کو زندگی کی تضحیک و استہزا سے بچانے کے لئے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی کہ اُس کی تحقیر کرے۔

یہ سلسلۂ خیالات میرے لئے ناقابلِ بیان طور پر غم انگیز اور پُر درد تھا اور میں نے محسُوس کیا کہ اگر میں اب بھی خاموش رہا تو عجب نہیں کہ میں ظاہرا طور پر رونے لگوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ایک عورت کے سامنے یہ حرکت کیسی شرمناک معلوم ہوتی، خصوصاً ایسی صورت میں کہ وہ خود رو نہ رہی تھی۔ میں اُس سے باتیں کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

" اور وہ کون تھا جس نے تمہیں پیٹا تھا"؟ میں نے جھٹ کہہ دیا، کیونکہ میں اِس سے کسی زیادہ دقیق اور لطیف بات کے سوچنے کا انتظار نہ کرنا چاہتا تھا۔

" یہ سب پاشکا کی مہربانی ہے"۔ اُس نے سادہ لوحی سے کہا۔

" اور وہ کون ہے؟"

" اُسے مجھ سے محبت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ نان بائی کا کام کرتا ہے"۔

" کیا وہ اکثر تمہیں مارتا ہے؟"

" جب کبھی شراب کے نشے میں ہوتا ہے۔ وہ مجھے مارتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکثر"۔

اب یکایک اُس نے میری طرف مڑ کر اپنے متعلق پاشکا کے متعلق اور اپنے باہمی تعلقات

کی نسبت باتیں شروع کردیں کہ وہ ایک نانبائی تھا۔ اُس کی مونچھیں سُرخ تھیں اور وہ ستار بہت اچھی بجاتا تھا۔ اور وہ اکثر اُس سے ملنے آتا تھا اور اُسے اُس سے مِل کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کیونکہ یہ خوش طبع چھوکرا عمدہ اور نفیس لباس پہنتا تھا۔ اُس کے پاس ایک واسکٹ تھی جس پر اُس کے پندرہ روبل خرچ ہوئے تھے اور ایک بہت خوبصورت مخملی بوٹ بھی تھا۔ یہ تھیں وہ تمام باتیں جنہوں نے اِس سیدھی سادھی لڑکی کا دِل موہ لیا تھا۔ اور اُس کی نظروں میں اعتبار پیدا کر لیا تھا۔ اور اِسی اعتبار پر وہ اُس سے وہ تمام نقدی اُڑا لے جاتا تھا جو اُسے گھر سے ملتی تھی، لیکن اس کی وہ ذرہ برابر بھی پرواہ نہ کرتی اگر وہ اُس کی آنکھوں کے سامنے دوسری لڑکیوں کے پیچھے نہ بھاگتا پھرتا۔

اُب کیا یہ میری توہین نہ تھی؛ میں دوسری لڑکیوں میں صورت شکل میں تو کم نہیں۔ یقیناً اِس کے یہی معنی تھے کہ وہ مجھ سے مذاق کرتا ہے، نابکار، کل کی بات ہے میں اپنی مالکہ سے تھوڑی دیر کی اجازت لے کر اُس کے پاس گئی، اور وہاں میں نے دیکھا کہ ڈِمکا شراب پی کر بدمست ہو رہی ہے اور پاشکا کی عقل بھی سمندر پار پہنچی ہوئی ہے۔ میں نے کہا "او ذلیل کمینے"۔ اِس پر اُس نے مجھے خوب سزا دی۔ وہ مجھے لاتوں اور مکوں سے مارتا رہا۔ اور بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا رہا۔ لیکن یہ سب اُس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھا جو بعد میں ہوا۔ اُس نے میرا سارا لباس اُتار لیا اور جب چھوڑا تو میں اِسی حالت میں تھی جو میری اب ہے! اب کیسے میں اپنی بیگم کے سامنے جا سکتی تھی؟ اُس نے میری تمام چیزیں چھین لیں ...... میرا جاکٹ بھی لے لیا یہ ابھی بالکل نیا تھا، ابھی چند روز ہوئے میں نے اس پر ایک پنجہ خرچ کیا تھا ..... اُس نے میرے سر سے رومال بھی اُتار لیا .....

او میرے خدا! میرا اب کیا انجام ہوگا؟ وہ یکا یک ایک آزردہ اور دردمند آواز میں چلا اُٹھی۔

ہوا چیخیں مارتی ہوئی چلنے لگی اور اور زیادہ سرد اور نم آلود ہو گئی ...... میرے دانت پھر اُچھل اُچھل کر رقص کرنے لگے۔ وہ سردی سے بچنے کے لئے میری جانب چلی آئی۔ اور میرے جسم سے

لگ کر مجھ سے اتنی قریب ہوگئی۔ کہ اندھیرے میں مجھے اُس کی آنکھوں کی چمک نظر آنے لگی۔

"کیسے کم بخت ہو تم تمام مرد! میرا بس چلے تو تم سب کو بھٹی میں ڈال کر جلا دوں۔ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ اگر تم میں سے کوئی مر رہا ہو تو اُس کے مُنہ میں تھوکوں اور اُس کی پشہ برابر بھی پرواہ نہ کروں۔ کمینہ کُتّے! تم خوشامدیں اور چاپلوسیاں کرتے ہو کتوں کی طرح دُمیں ہلا ہلا کر ہماری طرف آتے ہو اور ہم نادان اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دیتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی ہستی کو کھو بیٹھتے ہیں! پھر ذرا سی دیر بھی نہیں گزرتی کہ تم ہمیں اپنے پیروں تلے روندنا شروع کر دیتے ہو، بدنصیبو، بدبختو!"

وہ ہمیں بُرا بھلا کہہ رہی تھی لیکن اُس کے اِس بُرا بھلا کہنے میں کوئی طاقت، کوئی دشمنی کوئی نفرت نہ تھی۔ اُس کی گفتگو کا لہجہ کسی طرح بھی اُس کے موضوع کا ہم آہنگ نہ تھا کیونکہ اُس میں کامل سکون تھا اور اُس کی آواز کی سرگم خطرناک حد تک دھیمی تھی۔

مگر ان سب باتوں نے مجھ پر اتنا اثر کیا کہ قنوطیت کی وہ فصیح ترین کتابیں اور تقریریں بھی نہ کر سکیں جن کا معتدبہ حصہ میں پڑھ چکا تھا اور جنہیں آج تک میں پڑھ رہا تھا۔ اور یہ اس لئے کہ ایک مرتے ہوئے انسان کا درد و کرب اپنے اندر بہت زیادہ حقیقت اور قوت رکھتا ہے بہ نسبت موت کی اُس تصویر کے جسے کسی نے اپنے الفاظ کے باریک قلم سے کھینچ کر رکھ دیا ہو۔

مَیں اپنی حالت کو حقیقت میں ابتر محسوس کرنے لگا۔ نتاشا کی گفتگو سے متاثر ہو کر نہیں، بلکہ سردی کی شدت کی وجہ سے میں کراہنے لگا اور اپنے دانت پیسنے لگا۔

اُسی وقت دو چھوٹے چھوٹے ہاتھ میری طرف بڑھے ——— ایک میری گردن کے گرد حمائل ہو گیا اور دوسرا میرے چہرے پر آ لگا ——— اور ساتھ ہی کسی نے فکرمند، نرم اور شیریں اور دوستانہ آواز میں پوچھا:۔

"تمہیں کیا چیز دُکھ دے رہی ہے؟"

میں یہ یقین کر لینے پر تیار تھا کہ مجھ سے یہ سوال کرنے والا اُس نتاشا کے سوا کوئی دوسرا ہے جس نے ابھی ابھی تمام مردوں کو بے حمیت ظاہر کیا تھا۔ اور اُن کو تباہ و برباد کر دینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لیکن یہ وہی تھی اور اب وہ جلد جلد اور تیزی سے بولنے لگی تھی۔

"تمہیں کونسی چیز دُکھ دے رہی ہے؟ کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے؟ کیا تم ٹھٹھر رہے ہو؟ آہ! تم یوں ایک ننھے سے اُلو کی طرح بیٹھے ہوئے کیسے عجیب معلوم ہو رہے ہو۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟ کہ تمہیں سردی ستا رہی ہے۔ آؤ...... یہاں لیٹ جاؤ اور میں تمہارے ساتھ لیٹ جاؤنگی...... ہاں یونہی! اب اپنی باہیں میرے گرد لپیٹ لو...... اور کس کر! اب بتاؤ؟ اب تم بہت جلد گرم ہو جاؤ گے...... اور پھر ہم ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے سو جائیں گے...... رات بہت جلد گزر جائے گی...... تم دیکھنا یہ کتنی جلدی گزر جائے گی۔ میں کہتی ہوں...... کیا تم بھی شراب پیا کرتے تھے...... کیا تم سے بھی کام چھین لیا گیا ہے؟...... تم قطعاً پرواہ نہ کرو"

اور اُس نے مجھے آرام پہنچایا...... میری ہمت بڑھائی۔

لعنت ہو میری اس زندگی پر! میری اس ایک مصیبت میں مصائب کی ایک دنیا بستی تھی! ذرا تصور کرو! میں جو انسانیت کے انجام پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنے میں مصروف رہتا تھا، نظامِ تمدن کو از سرِ نو ترتیب دینے کی تجویزیں سوچا کرتا تھا سیاسی انقلابات کے خیالات اپنے دماغ میں بسایا کرتا تھا اُن کتابوں کو پڑھا کرتا تھا جنہیں شیطان صفت حکمت و فراست سے لکھا گیا تھا اور جن کی اتھاہ گہرائی تک خود مصنفین کا دماغ بھی نہ پہنچ سکا ہو گا——میں جو اپنی تمام قوت سے کوشش کر رہا تھا کہ اپنے آپ کو ایک ذی اختیار عملی اشتراکی طاقت بناؤں، بلکہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ میں نے ایک حد تک اپنے مقصد کی تکمیل کر لی ہے۔ میں جو اپنے خیال میں اُس مقام تک پہنچ چکا تھا جہاں میں نے سمجھ رکھا تھا کہ مجھے زندہ رہنے کا ایک امتیازی حق حاصل ہے اور مجھ میں وہ عظمت موجود ہے جو

اس حق کو ثابت کرتی ہے ۔ اور میں دنیا کے عظیم الشان تاریخی کارناموں میں ایک اور کارنامہ کا اضافہ کرنے کے بالکل قابل ہوں یہاں پڑا تھا اور ایک عورت مجھے اپنے جسم کی حرارت سے گرما رہی تھی ایک مفلوک الحال بے سرو سامان ، ستائی ہوئی ہستی جس کی عرصۂ حیات میں کوئی قدر و قیمت نہ تھی ۔ اور جس کی مدد کرنے کا مجھے خیال تک نہ آیا تھا یہاں تک کہ اُس نے خود میری مدد کی اور اگر مجھے مدد کا خیال آبھی جاتا تو یقیناً میں یہ نہ جان سکتا کہ وہ کیونکر ہو سکتی ہے ۔

میں یہ مان لینے پر تیار تھا کہ یہ کوئی خواب ہے جو مجھ پر گزر رہا ہے —— ایک ناخوشگوار اور اندوہگین خواب ۔

لیکن آہ ! میرے لئے یہ خیال کرنا ناممکن تھا ، کیونکہ بارش کے سرد سرد قطرے مجھ پر پڑ رہے تھے ۔ وہ مجھے سردی سے چھپا رہی تھی اور اُس کی گرم گرم سانس میرے مُنہ سے چھُو رہی تھی ۔ ہوا شور و غل مچا رہی تھی ، بارش کے قطرے تیروں کی طرح کشتی پر پڑ رہے تھے ، لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں ، اور ہم دونوں سردی سے اکڑے ہوئے اور کانپتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے ۔ اِس ساری کیفیت پر مجاز کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا اور مجھے یقین ہے کہ آج تک کسی نے ایسا گراں بار اور ہولناک خواب نہ دیکھا ہوگا جیسی یہ حقیقت تھی ۔

مگر نتاشا لگاتار اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی —— ملاطفت اور ہمدردی کی باتیں ، جیسی صرف عورتیں کر سکتی ہیں ۔ اُس کی آواز اور الفاظ کے تاثرات ایک ہلکی سی آگ کی طرح میرے سینے میں سلگنے لگے اور میرا دِل پگھلنے لگا ۔

پھر آنسو میری آنکھوں سے طوفانِ باراں کی طرح گرنے لگے ۔ جنہوں نے بہت سی بدیوں بہت سی حماقتوں ، بہت سے غموں کی گرد کو میرے دِل سے دھو ڈالا جو اس رات سے پہلے اُس پر جم رہی تھی ۔ نتاشا مجھے تسلی دے رہی تھی ۔

"بس، بس، ننھے میاں اب چُپ ہو جاؤ! جانے بھی دو! اب چُپ ہو جاؤ! خدا انہیں اور موقع دے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم اپنی اصلاح کر لو گے اور اپنے حقیقی مقام پر پھر کھڑے ہو گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور سب کام اچھے ہو جائیں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اور وہ مجھے چومتی جاتی تھی، جس طرح ایک ماں اپنے بچے کو چومتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بے نفس اور بے غرض ہو کر۔

"بس اب چپ ہو جاؤ، مجھے تمہاری صورت دیکھ کر ہنسی آ رہی ہے۔ صبح ہونے دو، میں تمہارے لئے آپ کوئی جگہ تلاش کروں گی اگر تم نہیں کر سکے"۔ اُس کی یہ پُر سکون اور ہمت افزا سرگوشیاں میرے کانوں میں اس طرح گونج رہی تھیں جیسے یہ کوئی خواب ہو۔

صبح ہونے تک ہم وہیں پڑے رہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور جب صبح ہوئی ہم کشتی کے نیچے سے نکلے اور شہر کو چلے گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ہم نے ایک دوسرے سے دوستانہ طریق پر رخصت حاصل کی اور اُس کے بعد کبھی نہ مل سکے، گو پورے چھ ماہ تک میں نے اُس ہمدرد نتاشا کے لئے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ جس کے ساتھ میں نے خزاں کی یہ رات گذاری تھی۔

اگر وہ مر چکی ہے، اور اُس کے لئے اچھا ہے اگر وہ مر گئی ہو ——— تو وہ یہ ابدی نیند امن کے ساتھ سوئے! اور اگر وہ زندہ ہے تو پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ اُس کی رُوح پر سلام ہو اور اُس کی رُوح کو کبھی دنیا کی پستی کا احساس نہ ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیونکہ اگر زندہ رہنا ہے تو یہ احساس زندگی کا ایک بے مصرف اور بے حاصل دُکھ ہے+

"میکسم گورکی"
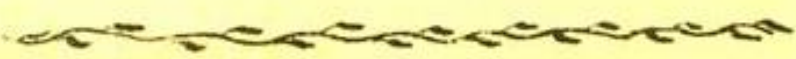
جھوٹ

"تم جھوٹ بولتی ہو! میں جانتا ہوں تم جھوٹ بولتی ہو"!

"تم نے شور کیوں مچا رکھا ہے! لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے"؟

یہ اُس نے ایک اور جھوٹ بولا۔ کیونکہ میں شور نہیں مچا رہا تھا۔ میں نہایت آہستگی کے لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ میں اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی نرمی اور آہستگی سے باتیں کر رہا تھا جب یہ زہر آلود لفظ "جھوٹ" سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا نمودار ہوا۔

اُس نے کہا "مجھے تم سے محبت ہے اور تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیئے۔ کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں آتا؟" اور اُس نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں سے ملا دیئے۔ لیکن جونہی میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے گلے سے لگانا چاہا وہ مجھے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ تاریک برآمدے کو طے کر کے وہ کمرے میں داخل ہوئی جہاں ایک مسرور محفل برخاست ہو رہی تھی۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے گیا۔ میں یہاں کیونکر آیا تھا! اُس نے مجھ سے اس جگہ آنے کو کہہ رکھا تھا اور اسی لئے میں یہاں موجود تھا۔ میں تمام رات لوگوں کو رقص کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میری طرف کوئی نہ آیا نہ مجھے کسی نے مخاطب کیا۔ میں سب کے لئے اجنبی تھا اور ایک کونے میں سازندوں کے پاس بیٹھا ہوا تھا پیتل کے ایک بہت بڑے باجے کا منہ سیدھا میری طرف تھا۔ اور کوئی اس باجے میں چھپ کر مجھ پر ٹھٹھا اُڑا رہا تھا اور بار بار ایک کرخت اور ہتک آمیز قہقہے کے ساتھ ہنستا تھا "ہو! ہو!! ہو!!!"

وقتاً فوقتاً ایک سفید اور خوشبو سے مہکتا ہوا بادل میرے قریب آ کر چلا جاتا تھا۔ یہ وہ تھی میں نہیں جانتا کہ وہ کس طرح دوسروں کی نظریں بچا کر مجھ سے ہم آغوش ہوتی تھی، لیکن ایک

اُڑتے ہوئے مختصر لمحے کے لئے اُس کا کندھا میرے کندھے سے آ کر چھُو جاتا اور اسی اُڑتے ہوئے مختصر لمحے کے لئے میں اپنی آنکھیں نیچی کر کے اُس کی سفید نورانی گردن کو دیکھ لیتا تھا۔ جب میں نظریں اُوپر اُٹھاتا تو مجھے ایک ایسی سفید سنجیدہ اور پُر صداقت یک رُخی تصویر نظر آتی کہ اُس پر ایک معصوم و دلگیر فرشتے کا دھوکا ہوتا۔ میں اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھتا جو بڑی بڑی، روشنی کے لئے حریص، خوبصورت اور پُرسکون تھیں، اُن کی نیلاہٹ میں پتلیوں کی سیاہی چمکتی اور جب کبھی میں اُن میں جھانکتا وہ سیاہ ہو جاتیں اور اُن کی گہرائی اتھاہ معلوم ہونے لگتی شاید وہ لمحہ جس میں میں اُن کی طرف دیکھتا اس قدر مختصر ہوتا کہ میرے قلب کی حرکت کے وقفے بھی اُس سے طویل ہونگے لیکن خوف اور درد و کرب سے مجھے ایسا محسوس ہوتا۔ جیسے میری ساری زندگی کھنچ کر اُس کی آنکھوں میں سما گئی ہے یہاں تک کہ میں اپنے آپ سے اجنبی ہو جاتا، خاموش، تنہا، مردے کی طرح ÷ پھر وہ رقص کی ایک گردش کے ساتھ مجھے چھوڑ جاتی، میری زندگی مجھ سے چھین کر اپنے ساتھ لے جاتی اور اپنے بلند قامت، مغرور لیکن حسین و جمیل شریک کے ساتھ رقص کرنے لگتی۔ میں اُس شخص کی ہر چیز کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ اُس کی جوتیوں کی طرز و وضع کا، اُس کے متناسب اعضاء کا، اُس کے پُر پیچ و سرکش بالوں کی لہروں کا، مگر اُس کی بے پروایانہ انداز اُس کی کم نگہی مجھے ذہن میں پیوست کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور مجھے خاک کی طرح باطل اور بے معنی بناتی ہوئی نظر آتی تھی۔

جب انہوں نے شمعیں بجھانی شروع کیں تو میں اُس کے پاس گیا اور اُس سے کہا۔

"اب جانے کا وقت ہے۔ میں تمہیں گھر چھوڑ آؤنگا۔"

اُس نے حیرت زدہ ہو کر جواب دیا۔ "مگر میں تو اُس کے ساتھ جا رہی ہوں اور اُس نے اُسی شخص کی طرف اشارہ کیا جو میری طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی اور اُس نے مجھے چوم لیا۔

"یہ سب جھوٹ ہے" - میں نے آہستہ سے کہا۔

اُس نے جواب دیا "ہم کل ملیں گے - تم ضرور میرے ہاں آنا"

جب میں گھر کی طرف جا رہا تھا - تو کہرے سے بھری ہوئی زمردین صبح کی شعاعیں اونچے اونچے مکانوں کی چھتوں پر پڑ رہی تھیں - سڑک پر صرف ہم دو شخص تھے - گاڑی والا اور میں - وہ تیز و تند ہوا سے اپنے چہرے کو بچانے کے لئے آگے کو جھک گیا - اور اُس کے پیچھے میں نے اپنے چہرے کو آنکھوں تک ڈھانپ لیا - گاڑی والے کے دِل میں اپنے خیالات تھے اور میرے دِل میں اپنے، اُدھر مکانوں کی پختہ دیواروں کے پیچھے ہزاروں لوگ سوئے پڑے تھے، اور اُن کے اپنے اپنے خواب اور اپنے اپنے خیالات تھے - میرے دِل میں اُس کا خیال تھا اور اُس کے جھوٹ کا خیال تھا - میں نے موت کا خیال کیا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ دیواریں جو صبح کا نور جذب کر رہی ہیں مجھے ابھی سے مردہ تصور کر کے میری طرف دیکھ رہی ہیں - شاید یہی وجہ تھی - کہ وہ اتنی بے رُخی اور سرد مہری سے کھڑی تھیں - میں نہیں جانتا کہ گاڑی والے کے خیالات کیا تھے نہ مجھے اُن لوگوں کے خوابوں کا علم ہے - جن کو دیواروں نے چھپا رکھا تھا - مگر وہ بھی تو میرے خیالات اور خواب نہ جانتے تھے -

پس ہم بازار کی لمبی سیدھی سڑک پر سے گزرتے گئے - صبح مکانوں کی رفیع و بلند چھتوں پر طلوع ہو رہی تھی اور ہمارے چاروں طرف سکون برس رہا تھا - ایک خوشبو سے لدا ہوا بادل میرے قریب آیا اور کسی غیر مرئی ہستی نے سیدھا میرے کانوں میں قہقہہ لگایا - "ہو! ہو! ہو!"

(۲)

اُس نے جھوٹ کہا تھا - وہ نہ آئی اور میں بے فائدہ اُس کا انتظار کرتا رہا، تیرہ فام آسمان سے ایک دھندلا منجمد اندھیرا سا اُتر کر زمین پر مستولی ہو گیا - اور میں نے نہ جانا کہ کب شفق شام میں

تبدیل ہوئی اور کب شام سے رات ہوگئی۔ مجھے یہ تمام کا تمام عرصہ ایک طویل رات معلوم ہو رہا تھا،
میں انتہائے افسردگی میں برابر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اپنے ہموار اور یکساں قدم اُٹھاتا رہا
میں اس رفیع الشان مکان سے دور ہی دور رہا۔ جس میں میری محبوبہ رہتی تھی۔ میں ڈیوڑھی کے اُس
دروازے کے قریب بھی نہ گیا جس کی دہلیز پر سنہری چھت کا عکس پڑ رہا تھا۔ بلکہ میں بازار کی مقابل والی
طرف اختیار کر کے اسی ایک چال سے پھرتا رہا —— آگے اور پیچھے، پیچھے اور آگے۔ جب
میں آگے بڑھتا تو میری آنکھیں اُس آبدار دروازے پر جم جاتیں اور جب میں واپس ہونے لگتا تو میں
اکثر ٹھہر جاتا اور پیچھے مڑ کر دیکھتا، تب برف کی تیز تیز سوئیاں میرے چہرے پر گر گر کر اُسے چھلنی کر
ڈالتیں اور وہ سوئیاں اتنی لمبی، اتنی تیز، اتنی ظالم ہوتیں کہ میرے سینے میں اُتر جاتیں اور میرے دِل
کو میرے اس یاس آمیز انتظار پر پژمردگی اور غصے کے تیروں سے پاش پاش کر دیتیں۔ برفانی ہوا
چیختی چلاتی ہوئی روشن شمال سے تاریک جنوب کو چل رہی تھی۔ وہ مکانوں کی برفانی چھتوں کے ساتھ
کھیلتی ہوئی نیچے اترتی تھی اور میرے چہرے پر برف کے چھوٹے چھوٹے تیز گالوں کے تھپیڑے
لگاتی ہوئی سنسان کوچے کی ان شمعوں کے شیشوں سے جا کر ٹکراتی تھی جن میں تنہا زرد شعلہ سردی
سے کانپ کانپ کر تند و تیز ہوا کے آگے جھک جھک جاتا تھا۔ اِس بے کس و بے نوا شعلہ کو دیکھ
کر میں بہت رنجیدہ ہوا۔ اُس کی زندگی بس رات کی رات تھی اور میں نے خیال کیا کہ اگر میں چلا
جاؤں گا تو اس کوچہ میں حیات کی ایک رمق بھی باقی نہ رہ جائے گی اور صرف برف کے گالے
خالی فضا میں اُڑتے اُڑتے پھریں گے اور زرد زرد شعلہ اِس تنہائی اور سردی میں کانپتا اور ٹھٹھرتا رہیگا۔
میں اُس کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ نہ آئی۔ اُس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ تنہا شعلہ
اور میں ایک ہی جیسے ہیں، سوائے اِس کے کہ میرا فانوس اُس کی طرح خالی نہ تھا کیونکہ کبھی کبھی
کوئی انسان اُس مقام پر آنکلتا تھا جسے میں اپنے قدموں سے ناپ رہا تھا، وہ چپ چاپ میرے

پیچھے پیچھے بڑھتے چلے آتے۔ میرے پاس سے گزر جاتے اور یکایک کسی خیالی تصویر کی طرح اُس سفید عظیم الشان عمارت کے کسی کونے کے پیچھے غائب ہو جاتے۔ پھر دوبارہ وہ اس کونے کی اوٹ سے نمودار ہوتے میرے قریب پہنچتے اور پھر آہستہ آہستہ کہرے لدی ہوئی وسیع فضا میں، جسے خاموشی سے گرنے والی برف نے پیدا کر رکھا تھا، جذب ہو جاتے۔ لپٹے لپٹائے بے وضع وقطع اور خاموش، وہ ایک دوسرے سے اور مجھ سے ایسی مماثلت رکھتے تھے کہ ایسا ظاہر ہوتا جیسے بیسیوں آدمی میری ہی طرح اِدھر سے اُدھر پھر رہے ہیں۔ انتظار کر رہے ہیں، کانپ رہے ہیں، خاموش ہیں اور اپنے پیچ در پیچ اور الم انگیز خیالات میں منہمک ہیں۔

میں اُس کا انتظار کرتا رہا اور وہ نہ آئی۔ میں نہیں جانتا کہ میں اس درد و کرب میں چیخ چیخ کر کیوں نہ رو دیا۔ میں نہیں جانتا کہ میں اُس وقت کیوں ہنستا تھا اور خوش تھا، اور اپنی انگلیوں کو اِس طرح بند کرتا تھا جیسے وہ کسی خونخوار جانور کے پنجے ہیں۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن کے فشار میں مَیں اُس زہریلے سانپ کو پیس رہا ہوں جس کا نام "جھوٹ" ہے۔ وہ میری باہوں سے لپٹا ہوا تھا اور میرے قلب کو ڈس رہا تھا یہاں تک کہ میرا سر اُس کے زہر سے چکرانے لگا۔ دنیا کی ہر بات ایک "جھوٹ" تھی۔ اُس وقت جب میں ابھی پیدا نہ ہوا تھا اور اُس وقت کے درمیان جب مجھے یہ زندگی ملی ایک حدِ فاصل تھی جو اُٹھ گئی اور میں نے خیال کیا کہ میں ہمیشہ سے زندہ ہوں اور اگر یہ نہیں تو پہلے کبھی نہ تھا اور ہمیشہ میری زندگی سے پہلے اور میری زندگی کے دَور میں اُس نے مجھ پر حکومت کی ہے اور یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی تھی کہ اُس کا کوئی نام اور کوئی جسم بھی ہے اور اُس کے وجود کی کوئی ابتدا اور کوئی انتہا بھی ہے۔ اُس کا کوئی نام نہ تھا۔ وہ ہمیشہ وہ تھی جس نے جھوٹ بولا اور جس نے ہمیشہ ایک ابدی انتظار میں رکھا اور کبھی نہ آئی۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں، مگر میں ہنسا، برف کی تیز سوئیاں میرے دل کو زخمی کر رہی تھیں اور کوئی غیر مرئی ہستی میرے کان میں قہقہے لگا رہی تھی ہو! ہو! ہو!

اپنی آنکھیں کھول کر میں نے ایک نگاہ اُس عالی شان مکان کی روشن کھڑکیوں پر ڈالی اور انہوں نے چپکے چپکے اپنی زرد اور سُرخ زبانوں کے ساتھ مجھ سے کہا:۔

"وہ تم کو دھوکا دے رہی ہے۔ تم یہاں آوارہ، منتظر اور مضطرب پھر رہے ہو، اور وہ حسن، مسرت اور فریب میں ڈوبی ہوئی اپنے گھر کے اندر اُس بالا قد اور خوبصورت شخص کی سرگوشیاں سُن رہی ہے جو تمہیں حقارت سے دیکھتا ہے۔ اور تم اندر گھس جاؤ اور اُس کو قتل کر ڈالو تو تم ایک نیک کام کرو گے کیونکہ درحقیقت تم جھوٹ کو قتل کرو گے۔"

میں نے اپنے اُس ہاتھ کو زور سے بند کر لیا جس میں چاقو تھا اور ہنستے ہوئے جواب دیا "ہاں میں اُسے ضرور مار ڈالوں گا۔"

کھڑکیوں نے مجھے حسرت اور اندوہ سے دیکھا اور کہا "تم اُسے کبھی قتل نہ کر سکو گے۔ کبھی نہیں، کیونکہ تمہارے ہاتھ کا ہتھیار بھی اُس کی محبت کی طرح جھوٹا ہے۔"

خاموش سائے مدت ہوئی غائب ہو چکے تھے اور اُس زہریر میں میں اکیلا رہ گیا تھا۔۔۔ میں اور شعلہ کی بے کس و تنہا زبان سردی اور مایوسی میں کانپ رہے تھے۔ پاس کے گرجا میں سے گھنٹے کی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ اُداس اور فلزی آواز تھرتھراتی اور سسکیاں لیتی ہوئی فضا میں پرواز کرتی اور پھر ہوا میں دیوانہ وار رقص کرتے ہوئے برف کے گالوں میں گم ہو جاتی تھی۔ میں نے ضربوں کو گننا شروع کیا اور مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی، کلاک نے پندرہ بجائے۔ یہ ایک پرانا گھنٹہ گھر تھا اور اسی طرح کلاک بھی پرانا تھا، اور گو اس کا وقت درست ہوتا تھا لیکن گھنٹہ اس کا بے تحاشا ہی بجا کرتا تھا۔ اس طرح کہ اکثر بوڑھے گھنٹہ بجانے والے کو کلاک کے مینار پر چڑھ کر اُس کی زبان کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے بند کرنا پڑتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا، گھنٹے کی اس اُداس اور تھرتھراتی ہوئی آواز نے جو کہر کی ظلمت سے اُلجھی ہوئی اور لپٹی ہوئی ہے۔ آخر "یہ جھوٹ" کس لئے بولا ہے؟ آہ یہ

بے فائدہ جھوٹ کس قدر ذلیل اور بے سروپا ہے۔

گھنٹے کی آخری آواز کے ساتھ وہ چمکتا ہوا دروازہ کھلا اور وہ بلند و بالا قد کا شخص سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ صرف اُس کی پشت پر میری نظر پڑی لیکن میں نے اُسے شناخت کر لیا کیونکہ غرور اور تبختر کے اُس پُتلے کو ابھی میں نے کل شام ہی دیکھا تھا۔ میں نے اُس کا قدم پہچان لیا جو گزشتہ شام کی بہ نسبت زیادہ ہلکا اور زیادہ مطمئن پڑ رہا تھا۔ میں بھی اکثر اوقات اس گھر سے یوں ہی نکلا تھا، اُس کی یہ چال مردوں کی وہی چال تھی جو اُس وقت پیدا ہوتی جب اُن کے لب کسی عورت کے جھوٹے لبوں سے ملتے ہیں۔

(۳)

میں نے اُس کی منتیں کیں، اُسے دھمکایا، اُس پر دانت پیستا رہا۔

"بتاؤ، مجھے سچ سچ بتاؤ!"

مگر برف جیسے سرد مہر چہرے کے ساتھ، اُٹھے ہوئے متحیر ابروؤں کے ساتھ، سیاہ عمیق چمکتی ہوئی پُراسرار و پُرسکون آنکھوں کے ساتھ اُس نے مجھے یقین دلایا کہ "میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں۔"

وہ جانتی تھی کہ میں ثابت نہیں کر سکوں گا کہ وہ جھوٹ کہہ رہی ہے اور یہ بھی اُسے معلوم تھا کہ اُس کے ایک لفظ سے، اُس کے ایک جھوٹے لفظ سے میرے ان جاں خراش و جاں ستاں خیالات کا تمام بوجھ یکسر ہلکا ہو کر رہ جائے گا۔ اِسی لفظ کا مجھے انتظار تھا۔ اور وہ اُس کے شیریں لبوں سے ٹپکا۔ صداقت کی تمام رنگینیوں کو لئے ہوئے موتی کی طرح چمکتا ہوا ٹپکا۔ مگر اُس کی گہرائیوں میں اب بھی وہی تاریکی موجود تھی۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔ کیا میں کلیتہً تمہاری ہی نہیں ہوں؟"

ہم شہر سے دُور تھے اور برف پوش کھیت تاریک کھڑکیوں میں سے نظر آ رہے تھے۔ اُن کے اُوپر تاریکی تھی اور اُن کے چاروں طرف تاریکی تھی، بے حرکت، خاموش تاریکی، لیکن کھیت اپنی ذاتی روشنی سے اس طرح چمک رہے تھے جیسے اندھیرے میں کسی لاش کا چہرہ نظر آ رہا ہو۔ کمرہ خوب گرم تھا اور صرف ایک موم بتی اُسے روشن کر رہی تھی اور اُس بتی کے سُرخ شعلہ پر بھی مردہ کھیتوں کی زردی کا اثر پڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

میں نے کہا "میں حقیقت کو معلوم کرنا چاہتا ہوں، خواہ وہ میرے لئے کتنی ہی پُر الم کیوں نہ ہو۔ شاید میں اُسے سُن کر مر جاؤں لیکن موت میرے لئے بہتر ہے اُس زندگی سے جس میں جھوٹ کو دخل ہو۔ تمہارے لبوں میں ایک جھوٹ ہے۔ تمہاری آنکھوں میں ایک بطلان ہے۔ مجھ سے سچ کہہ دو اور میں ہمیشہ کے لئے تم کو چھوڑ دوں گا۔" مگر وہ خاموش رہی اور اُس کی متجسّس نگاہیں میرے دل میں اتر گئیں۔ میری رُوح کو انہوں نے کھینچ کر باہر نکال لیا اور ایک عجیب پُر جستجو طریقہ سے انہوں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ میں چلّا کر بولا "میری بات کا جواب دو، ورنہ میں تمہیں مار ڈالونگا"

اُس نے نہایت مطمئن لہجہ میں جواب دیا "مجھے مار ڈالو۔ بعض اوقات زندگی ایسی ہی حیران ہو جاتی ہے۔ مگر دھمکیوں سے تمہیں حق نہ مل سکے گا۔"

میں اُس کے سامنے جھک کر بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھوں کو میں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور رو رو کر اس سے رحم اور حق کے لئے التجا کرنے لگا۔

"آہ! اے غریب"! اُس نے کہا "آہ اے غریب!"

میں نے منت سے کہا "مجھ پر رحم کرو۔ میری روح حق کے لئے بیتاب ہے۔"

میں نے اُس کی شفاف پیشانی کی طرف دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے حق اُس کی اُس باریک مانگ کے نیچے چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ میرے دل میں اُس کے سر کو توڑ کر حق کو اُس میں

سے نکال لینے کی ناقابلِ ضبط آرزو پیدا ہو رہی تھی۔ اُس کا دل اُس کے سینے میں دھڑک رہا تھا۔ اور میں دیوانہ وار اُس سینے کو اپنے ناخنوں سے پھاڑ ڈالنا چاہتا تھا۔ انسان کے دِل کو عریانی میں دیکھنے کے لئے، خواہ وہ ایک ہی دفعہ کے لئے کیوں نہ ہو میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ مومی بتی کا نوکدار زرد شعلہ جواب خاموش ہوا ہی چاہتا تھا بے حرکت ہو رہا تھا۔ مکان کی دیواریں بڑھتی ہوئی تاریکی کے اندر وسعتِ فضا میں گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ غم بے کسی اور ہیبت ہر طرف چھا رہی تھی۔

"آہ اے غریب! اس نے کہا "آہ اے غریب!"

بتی کے زرد شعلے پر تشنج سا طاری ہوگیا۔ ذرا سی دیر کے لئے وہ تڑپا اور پھر بجھ گیا۔ تاریکی کی چادر نے ہم کو اپنے اندر لپیٹ لیا۔ اب نہ میں اُس کے چہرے کو دیکھتا تھا اور نہ اُس کی آنکھوں کو، اور جھوٹ بھی اب مجھے نظر نہ آتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، نہ میں سوچتا تھا اور نہ اپنے جسم میں زندگی محسوس کرتا تھا۔ بلکہ صرف اُس کے ہاتھوں کے مس کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا اور یہ مجھے سچ معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس اندھیرے میں اُس کی دھیمی سی سہمی اور ڈری ہوئی آواز میرے کانوں میں آئی "اپنی آغوش میں مجھے چھپالو۔ میں ڈر گئی ہوں"!

"تم حق معلوم کرنا چاہتے ہو ——— مگر کیا میں اُس سے واقف ہوں! آہ، کاش کہ میں اُس سے واقف ہوتی۔ مجھے بچالو ——— آہ میں ڈر گئی ہوں"

میں نے اپنی آنکھیں کھول ڈالیں۔ زرد رو تاریکی بلند کھڑکیوں میں سے نکل کر دیوار کے قریب جمع ہوگئی اور اِدھر اُدھر کونوں میں اپنا سر چھپانے لگی۔ پھر نہایت آہستہ سے کسی بہت بڑی اور نہایت سفید چیز نے کھڑکیوں میں سے اندر کی طرف جھانکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی کی مردہ آنکھیں ہمیں تلاش کر رہی ہیں اور اپنی نگاہ کے برفانی تاروں سے جکڑ رہی ہیں۔ کانپتے ہوئے ہم ایک دوسرے کے ساتھ اور زور سے چمٹ گئے۔ اُس نے پھر آہستہ سے کہا "آہ! میں ڈر گئی ہوں"!

(۴)

میں نے اُسے مار ڈالا۔

میں نے اُسے مار ڈالا اور جب وہ کھڑکی کے قریب ایک بے جان تختے کی طرح چت پڑی ہوئی تھی تو میں اُس کی لاش پر اپنا پاؤں رکھ کر خوب ہنسا۔ یہ ہنسی کسی مجنون کی ہنسی نہ تھی، نہیں! میں اس لئے ہنسا کہ میرا سینہ اب ہلکا ہو گیا تھا، اُس میں اب سکون اور مسرت کی حکومت تھی اور میرے دل سے وہ کرم جھڑ کر گر پڑا تھا جو اُسے دم بدم کھائے جا رہا تھا۔ جھک کر میں نے اُس کی مردہ آنکھوں میں نگاہ ڈالی۔ وہ بڑی بڑی، روشنی کے لئے حریص آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور چینی کی گڑیا کی آنکھوں کی مانند گول اور بے نور نظر آ رہی تھیں۔ میں اُن کو اپنی انگلیوں سے چھو سکتا تھا، نہیں کھول سکتا اور بند کر سکتا تھا۔ اور مجھے اُن سے کسی قسم کا خوف نہ آتا تھا کیونکہ اب اُن سیاہ اور عمیق پتلیوں میں جھوٹ اور شک کا دیو موجود نہ تھا جس نے اتنی طویل مدت تک حریصانہ میرا خون چوسا تھا۔

جب انہوں نے مجھے گرفتار کیا تو میں ہنس پڑا! اور میری یہ حرکت گرفتار کرنے والوں کو نہایت وحشیانہ معلوم ہوئی۔ انہوں نے نفرت کے ساتھ میری طرف سے منہ پھیر لیا اور پیچھے ہٹ گئے۔ کچھ اور لوگ لعنت اور نفرین بھیجتے ہوئے میری طرف بڑھے لیکن جب انہوں نے میری مسرت سے چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو ان کے چہرے زرد پڑ گئے اور اُن کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔

وہ مجھے دیوانہ کہتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ مجھے دیوانہ کہہ کر انہیں تسکین ہو جاتی ہے کیونکہ یہی وہ لفظ تھا جو انہیں قتل کے معمے کو حل کرنے میں مدد دیتا تھا ——— کیونکر ممکن تھا کہ میں ایک عاشق ہو کر اپنی محبوبہ کو قتل کر دوں اور پھر ہنسوں۔ صرف ایک موٹا تازہ اور خوش بخوش آدمی مجھے ایک دوسرے نام سے پکارتا تھا جس سے ایک دھچکا سا آ کر مجھے لگتا تھا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا تھا۔

"آہ اے غریب آدمی"! اُس نے رحیمانہ لہجہ میں کہا۔ اُس کو بالکل غصہ نہ آیا کیونکہ وہ تروتازہ اور خوش تھا۔ "آہ اے غریب آدمی!"

میں نے چلّا کر کہا "خبردار! مجھے اس طرح مخاطب نہ کرو!"

میں نہیں جانتا کہ میں کیوں اُس پر جھپٹا۔ میں یقیناً اُسے مارنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن مجھ سے ڈرے ہوئے یہ تمام لوگ جو مجھے دیوانہ اور مجرم سمجھے تھے اور زیادہ خائف ہو گئے اور اس طرح چیخیں مارنے لگے کہ مجھے پھر ہنسی آگئی۔

جب وہ مجھے اُس کمرے میں لے گئے جہاں لاش پڑی ہوئی تھی تو اُس لحیم وشحیم اور مسرور آدمی کی طرف دیکھ کر میں نے پے بہ پے بلند اور رسیلی آواز میں کہنا شروع کر دیا "میں خوش ہوں میں خوش ہوں"۔ اور یہ سچ تھا۔

(۵)

بچپن میں ایک مرتبہ چڑیا گھر میں مَیں نے ایک چیتے کو دیکھا تھا جس کا تصور میرے دل میں مدتوں رہا اور مدتوں میرے خیالات اُس کے ساتھ وابستہ رہے۔ وہ دوسرے درندوں کی طرح احمقانہ نشے میں سرشار پڑا نہ رہتا تھا اور نہ ہی بیہودہ طور سے تماشائیوں کی طرف مبہوت ہو کر دیکھتا تھا۔ وہ ایک خطِ مستقیم پر سیدھا ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتا تھا اور ہر بار ایک ہی مقام سے پلٹتا تھا اور ہر دفعہ اُس کی صاف اور چمکیلی کھال اُس کے پنجرے کی ایک ہی سلاخ سے ٹکراتی تھی۔ اُس کا خونخوار سر جھکا ہوا تھا اور اُس کی آنکھیں بالکل سامنے کی طرف متوجہ تھیں۔ کبھی ایک دفعہ بھی اُس نے اِدھر اُدھر نظر نہیں ڈالی۔ دن بھر لوگ آ آ کر اُس کے پنجرے کے سامنے شور مچاتے تھے مگر وہ برابر ایک نہج پر آگے اور پیچھے چلتا رہتا تھا اور کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی اُن کی طرف نہ دیکھتا تھا۔ ہجوم میں سے چند مسکراتے تھے مگر اکثر سنجیدگی اختیار کر لیتے تھے بلکہ افسردگی اور پژمردگی کی اس زندہ تصویر کو دیکھ

کر منوم ہو جاتے تھے۔ ایک آہ بھر کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ اور جب وہ کچھ دُور نکل جاتے۔ تو ایک مرتبہ پھر ایک مستفسرانہ اور متحیرانہ نگاہ اُس پر ڈالتے جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ اُن کی اپنی انسانی حالت میں اور اس مقید درندے کی حالت میں کوئی بات مشترک ہے جو فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ اور جب میں بڑا ہوا اور لوگوں کی زبانوں کو اور کتابوں کو ازل و ابد کا تذکرہ کرتے دیکھا تو مجھے وہ چیتا پھر یاد آگیا اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ہمیشگی اور اُس کے رنج و تعب کی ایک تصویر کو میں نے کبھی دیکھا ہے۔

اُس چیتے کی طرح میں اپنے پتھر کے پنجرے میں بند تھا، ٹہلتا تھا اور سوچتا تھا۔ ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک سیدھی لکیر پر میں چلتا تھا اور میرے خیالات بھی ایک ایسے ہی خطِ مختصر پر سفر کرتے تھے لیکن یہ خیالات اتنے بوجھل تھے کہ مجھے یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ میں نے صرف ایک سر کو اُٹھا رکھا ہے بلکہ مجھے اپنے کندھوں پر ایک دنیا کا بار پڑا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہ تمام خیالات صرف ایک لفظ پر مشتمل تھے لیکن کیا ہی وسیع، کتنا پُرعذاب اور کیسا تباہ کُن تھا وہ لفظ!

وہ لفظ: "جھوٹ"!

تمام کونوں سے پھنکارتا ہوا وہ نکلتا تھا اور میری روح کے گرد لپٹ جاتا تھا۔ لیکن اب وہ چھوٹا سا سانپ نہ رہا تھا۔ اب وہ بہت بڑا، خونخوار، شعلہ ریز اژدہا بن گیا تھا، وہ مجھ کو ڈستا تھا اور اپنی آہنین لپیٹوں میں جکڑ کر مجھے نیم جاں کر دیتا تھا۔ میرے سینے میں چھوٹے چھوٹے سانپوں کا ایک طوفان اُمڈا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں درد و کرب سے چیخ اُٹھتا تھا، اُس وقت میرے مُنہ سے وہی ایک پھنکارتا ہوا خوفناک لفظ نکلتا تھا۔ "جھوٹ"!

اور جب میں اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا قید خانہ میں ٹہلتا تھا تو اُس کا ہموار بھورا فرش میری آنکھوں کے سامنے ایک بھورے رنگ کے شفاف غار میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ میرے

پاؤں فرش کو چھوتے معلوم نہ ہوتے تھے ۔ اور میں خیال کرتا تھا کہ میں کسی ناقابلِ فہم بلندی پر کہر کی تاریکیوں میں بہا چلا جا رہا ہوں ۔ اور جب میرے سینے سے وہ سنسناتا ہوا نعرہ نکل جاتا، تو نیچے سے، کہر کے اس ناقابلِ نفوذ پردے کے نیچے سے آہستہ آہستہ ایک ہیبت ناک گونج اُٹھتی اور اتنی آہستہ اور دھیمی اُٹھتی گویا وہ ہزار ہا سال کے زمانے میں سے گزر کر آ رہی ہے اور دھند کے ایک ایک انجرے میں اُس کی طاقت کا ایک ایک ذرّہ گم ہو گیا ہے۔ میں نے سمجھ لیا کہ وہاں، نیچے یہ اُس آندھی کی طرح چل رہی ہے ۔ جس سے درخت بھی اکھڑ کر گر پڑتے ہیں، لیکن جب یہ میرے کانوں تک پہنچتی تو اس کی بساط اُس مختصر سے لفظ سے زیادہ نہ رہتی جو سرگوشی کی آواز میں کہا جائے "جھوٹ"!

یہ ذلیل اور کمینہ سرگوشی مجھے طیش میں لے آتی اور میں زور سے زمین پر پاؤں مارتا اور چلّا کر کہتا "جھوٹ کہیں بھی موجود نہیں۔ میں نے جھوٹ کو مار ڈالا ہے"۔

میں جان بوجھ کر پرے ہٹ جاتا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کا جواب مجھے کیا ملیگا ـــــــ اور اتھاہ غار میں سے آہستہ آہستہ جواب اُوپر کو آتا "جھوٹ"!

جانتے ہو ۔ میں نے ایک خطرناک غلطی کی ۔ عورت کو قتل کر کے میں نے جھوٹ کو ابدی زندگی دے دی ۔ عورت کو کبھی قتل نہ کرو ۔ یہاں تک کہ دعا، رنج اور عذاب، سہہ سہہ کر تم اُس کی رُوح سے سچ کو پا لو ۔

(۶)

تاریک اور خوفناک ہے وہ جگہ جہاں وہ سچ کو اپنے ساتھ لے گئی اور جھوٹ کو ــــــــ اور وہیں میں بھی جا رہا ہوں ۔ شیطان کے تخت کے نیچے میں اُسے پکڑ لوں گا ۔ اور اُس کے سامنے جھک کر اور رو رو کر اُس سے کہونگا "مجھے سچ بتاؤ! مجھے سچ بتاؤ"

لیکن خدا! اے خدا! یہ بھی تو جھوٹ ہے، یہاں تو خلا ہی خلا ہے، صدیوں کا خلا، بے پایاں خلا، مگر وہ کہاں ہے ——— وہ کہیں بھی نہیں ہے لیکن جھوٹ کو وہ باقی چھوڑ گئی ہے۔ یہ غیر فانی ہو گیا ہے۔ میں ہوا کے ہر ذرّے میں اُسے پاتا ہوں۔ اور جب میں سانس لیتا ہوں، تو یہ میرے سینے میں داخل ہو کر پھنکارتا ہے۔ اور کاٹ کاٹ کر میرے دِل کے پرخچے اُڑا دیتا ہے۔

اوہ! کسی شخص کے لئے حق کی تلاش کرنا کتنا بڑا اجنون ہے، کتنا بڑا دُکھ ہے۔

بچاؤ! مجھے اِس دُکھ سے بچاؤ!

"لیونڈ اینڈریف"

فرانس

دِرم واپیین

یک جا اُن دونوں کی عمر ایک سو پچاس برس تھی۔ اُن کی الگ الگ عمریں؛ اُن میں سے ایک کو بھی معلوم نہ تھیں۔ مدت ہوئی انہوں نے اپنی عمروں کو علیحدہ علیحدہ شمار کرنا چھوڑ دیا تھا، اور اب وہ بلاتکلف ہر سال اپنی مشترکہ عمر میں دو برس بڑھا دیا کرتے تھے۔

اُس پست سے دیہاتی مکان میں جس کی چھت کسی پرندے کے پروں کی طرح پھیلتی ہوئی دیواروں کے آگے بڑھ گئی تھی، انہیں رہتے ہوئے کتنے ہی دِن، کتنے ہی موسم اور کتنے ہی سال ہو گئے تھے۔ اگر آج ان سے کوئی کہتا کہ تم ہمیشہ سے میاں بیوی نہیں تھے۔ تو وہ کچھ دیر کے لئے حیران رہ جاتے۔ اُن کے چہروں پر ایامِ گذشتہ کی ایک ہلکی سی جھلک باقی تھی۔ اور اُن کی شکلوں میں بہن بھائیوں سے بڑھ کر مشابہت تھی۔ جب گاؤں کے لوگ اُن کے اس درجہ ضعف کے باوجود اُن کی اس قدر شدید والہیت کو دیکھتے تھے تو وہ یہ خیال کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ عنقریب جب اِن میں سے ایک اس دنیا سے چل بسا تو دوسرے کے لئے یہاں کی تنہائی ناقابلِ برداشت ہو جائیگی۔

دونوں بوڑھی جانوں کے لئے موسمِ سرما نامہربان ثابت ہوا۔ اُس نے اُن کے حلقوم پر ذرا درشتی سے ہاتھ ڈالا۔ اُن کی کمر کو کسی قدر توڑ دیا اور اُن کے گالوں میں گڑھے ڈال دیئے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایک دُھندلا سا پردہ دیکھنے لگا اور وہ غنودگی کے حملوں کا شکار ہونے

لگی۔ جب بہار آئی تو چھاؤں کی فرحت انہیں کم معلوم ہونے لگی اور دھوپ کی شگفتگی انہیں بےکیف نظر آنے لگی۔ زندگی اُن کے لئے ایک بارِ گراں ہوگئی۔ صبح سے شام کرنا ایک جاں کاہ مشقت سے کم نہ رہا۔

ایک دِن جب وہ روزِ گذشتہ کی بہ نسبت زیادہ مضمحل ہوکر اپنے مکان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اُس کی بیوی خرگوشوں کے لئے گھاس لانے کے لئے باہر نکلی۔ جونہی کہ اُس نے جنگلے کے پھاٹک کو طے کیا اُس کے سانس کا آنا جانا بند ہوگیا۔ یہ سفر کی پہلی منزل تھی۔ پھر وہ آگے بڑھی، اُس مقام سے جہاں وہ ایک شریف بچے کی طرح بیٹھا تھا، بڈھے کی دھندلی آنکھیں اپنی بیوی کو نہ دیکھ سکیں، مگر اُس نے اُس کے قدموں کی آواز سُن لی۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں تاکہ وہ اپنے تصوّر میں اُسے جاتے ہوئے دیکھ لے۔

جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچی تو اُس نے اپنی آنکھیں ایک دفعہ زور سے کھولیں اور پھر یکلخت گر پڑی، اُس کے مُنہ سے کوئی آواز نہ نکلی اور اُس نے کوئی حرکت نہ کی۔

ایک راہرو آکر وہاں ٹھہر گیا، ایک لڑکی اُچھلتی کودتی پاس آکھڑی ہوئی۔ پہلے ایک اور پھر ایک اور عورت آئی۔ لوگ اُٹھاکر اُسے ایک دوکان میں لے گئے انہوں نے دیکھا کہ وہ مرچکی ہے۔

گھر خالی ہوگئے۔ دوکان اور اُس کے اطراف پر سواد ہجوم چھاگیا۔ تین کرسیاں جوڑ کر بڑھیا کو اِن پر لِٹا دیا گیا۔ اُس کا زرد اور قدرے بگڑا ہوا چہرہ دیکھ کر ڈر آرہا تھا۔

کسی نے کہا "بڈھے کو ضرور بتا دینا چاہیئے"۔

ایک اور آواز آئی "نہیں! اُسے نہیں، پہلے اُس کی بہو کو بتانا چاہیئے۔ وہ سامنے کھڑی ہے۔ او مارگیرٹ!"

وہ آگئی۔ بدصورت اور باولی سی۔ اُس کے جھکے ہوئے کندھوں سے اُس کا ڈھیلا لباس

لٹک رہا تھا اور اس کے رخسار خشک اور روکھی روٹی کی طرح بے روپ تھے۔ وہ دھوبن تھی اور پانی کے اثر سے اُس کے اُبھرے ہوئے ہاتھ دو بقچوں کی طرح لٹک رہے تھے۔

جب اُس نے اپنے اُس شوہر کی ماں کی نعش کو دیکھا جسے مرے اب ایک زمانہ گذر چکا تھا اور جسے اب وہ تقریباً بھول چکی تھی تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ اُس کے ہونٹ سفید ہو گئے اور اُس کے چوڑے چپکلے چہرے میں اُس کی آنکھیں گردش کرنے لگیں۔ اُس نے ناک کو سکوڑتے ہوئے اپنی آستین سے اُسے پونچھا اور آہستہ سے کہا "آہ اِس کا بیچارہ خاوند!"

کسی کی طرف دیکھے بغیر وہ عجب بے ڈھنگے پن سے ہجوم کی طرف مڑی اور کہنے لگی۔ "بڑھیا کی موت کی خبر اُسے کوئی نہ سنائے۔ میں اُسے خود بتاؤں گی"۔ اور اُس نے اپنے چہرے کو ایک ملتجیانہ انداز سے حرکت دی۔

اس کے بعد ایک ایک کر کے لوگوں نے جانا شروع کیا یہاں تک کہ ذرا سی دیر میں سارا مجمع منتشر ہو گیا۔

مارگیرٹ نعش کو اٹھوا کر اپنے بستر پر لے گئی۔ پھر جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کر کے بڈھے کے پاس پہنچی۔ اپنے گھر کے سامنے چھت کی اُسی پُر نما افزائش کے نیچے وہ بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔

لکڑی کا پھاٹک کھلا تو اُس کی آواز سے چونک کر اُس نے اپنا سر اُوپر کو اُٹھایا۔

مارگیرٹ نے کہا "میں ہوں بابا"۔ پھر وہ ایک بُت کی طرح بے حرکت ہو گیا "آؤ اب گھر چلنے کا وقت ہے"۔

اُس نے ایک آہ کی اور اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر ایک آہ کی۔ اُس نے ہاتھوں کو آگے کی طرف پھیلا کر ہلانا شروع کیا۔ اُس کے چہرے میں کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آتی تھی۔

مارگیرٹ نے کہا "کیوں کیا ہے بابا؟"

اُس نے جواب دیا۔ "مجھے نظر نہیں آتا۔ مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی!"

"آہ!" مارگیرٹ نے کہا۔ اور بلاشبہ یہ اُس کی رُوح کی سادگی تھی، جس نے اُسے اتنے بڑے بڑے حادثوں کے لئے تیار کر دیا تھا۔ کہ اس کی زبان سے اس ایک لفظ کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔ اُس نے اُس شخص کا ہاتھ تھام لیا، جس کی آنکھیں اپنے ازلی رفیق کے چھپ جانے کے بعد اب دیکھنا ہی نہ چاہتی تھیں۔

اپنے پاؤں کو گھسیٹتا ہوا وہ نعمت خانے میں پہنچ گیا۔ اُس نے ایک کرسی کی پشت کو چھوا اور اس پر بیٹھ گیا۔ مگر اس کی سانس سختی سے چل رہی تھی۔ وہ آہیں بھرتا، کراہتا اور جونہی وہ اُسے بتانے کے لئے مُنہ کھولتی وہ چلانے لگتا۔

"یہ اب بس ہو چکی ہیں۔ میری آنکھیں! آہ ابھی یہ دُکھ باقی تھا!"

گھنٹوں تک وہ غم و الم میں ڈوبا رہا۔

ایک لمحہ کے لئے جب اسے ذرا ہوش آیا تو اُس نے پوچھا! "وہ کہاں گئی؟ خدا کے لئے، وہ کیا کر رہی ہے؟" تالم کے دو اور حملوں کے درمیان مارگیرٹ نے دیکھا کہ اُس نے اپنے حواس مجتمع کئے۔ اور وہ اپنی بیوی کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر وہ شکایتیں کرنے لگا۔ اتنے میں پھر ایک حملہ ہوا۔ بہت سے لوگ آئے۔ بعض اندر پہنچے اور بعض کھڑکیوں ہی میں سے دیکھ کر چلے گئے مگر کسی کو اس سے کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

سارا دِن یونہی گزر گیا اور یہ جانکاہ خبر اُس کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔ اب کسی کو اُس کے قریب آنے کی جراٗت نہ ہوتی تھی۔

وقتاً فوقتاً مارگیرٹ اُس کے کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے آنسوؤں سے بھرے ہوئے چہرے کو صاف کرتی ہوئی اُٹھ دوڑتی۔ وہ بار بار بڑھیا کو دیکھنے کے لئے جاتی تھی۔ جو باوجود دشمنوں کی

روشنی کے رات کی تاریکی میں نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ پھر وہ تجہیز و تکفین میں مصروف ہوگئی ہر طرف اُس کا خیال تھا۔ وہ تھک کر چور ہو رہی تھی مگر برابر بھاگ دوڑ میں مصروف تھی۔ وہ دلیرانہ مصیبت کا مقابلہ کر رہی تھی اور اُس کی شدت سے مغلوب نہ ہوتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اُسے کیا کیا کرنا چاہیئے۔ وہ جو مجسم سوگ تھی۔ وہ جسے پس ماندگی کی اب عادت ہو چکی تھی!

شام اور رات کے درمیان وہ ایک مرتبہ پھر اُس کے پاس پہنچی۔ اب اُس کی طبیعت میں کچھ سکون پیدا ہو چلا تھا۔ مارگیرٹ نے ایک چھوٹا سا لیمپ جلا کر انگیٹھی پر رکھا۔ اور دل میں سوچا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اِسے بتا دیا جائے کہ وہ جو ہمیشہ تیرے ساتھ رہتی تھی آج تجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ نحیف و ناتواں کانپتی ہوئی وہ اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اُس کا سر اس طرح جُھک رہا تھا جیسے وہ اپنے کسی جرم پر نادم ہو۔ اُس نے اپنی ساری قوت کو یوں مجتمع کیا جیسے وہ چلانے لگی ہے۔ مگر اُس کی زبان لڑکھڑا گئی اور اُس نے کہا: "وہ اب کبھی ——— واپس نہ آئیگی ——— کبھی نہیں ——— وہ چلی گئی"۔

بڈہا خاموش رہا۔ مارگیرٹ نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا ——— اور سو رہا تھا، وہ وہاں سے ہٹ گئی اور نہایت احتیاط سے کمرے کی اشیاء کو درست کرنے لگی۔ یکایک بڈہے نے حرکت کی اور اُس کو بلایا۔ وہ اُس کے اس قدر قریب جا کھڑی ہوئی کہ وہ اپنی انگلیوں سے اُس کے ہاتھ کو چھو سکتا تھا۔

"سنو میری بیٹی"، اُس نے کہا "یہاں آؤ اور سنو۔ وہ واپس آگئی ہے۔ وہ یہیں ہے۔ میں نے اُسے ابھی وہاں دیکھا ہے۔ جہاں اس وقت تم کھڑی ہو۔ میں سو رہا تھا اور یکایک مجھے معلوم ہؤا۔ کہ وہ یہیں ہے۔ اُس نے کمرے کی چیزوں کو ترتیب دیا اور پھر چلی گئی۔ میں جان بوجھ کر بے حرکت اور خاموش ہو رہا۔ سنو! میں نہیں چاہتا اُسے معلوم ہو کہ میں دیکھ نہیں سکتا۔ میں نہیں چاہتا ———

اس سے اسے بڑا صدمہ ہوگا۔ مجھے یہ منظور نہیں۔ اُسے اُس وقت تک مجھ سے دور رکھو جب تک میں پھر اچھا نہ ہو جاؤں۔ کسی تدبیر سے، میری بیٹی۔"

اُس نے ذرا پہلو بدلا تو پرانی کرسی میں سے کراہنے کی سی آواز اُٹھی۔

"اُسے لے جاؤ۔ ایک یا اگر ضرورت ہو تو ایک سے زیادہ دِنوں کے لئے اسے کہیں لے جاؤ اُس سے کہو ——— اُسے لے جاؤ۔"

"اچھا بابا۔ میں اُسے لے جاؤں گی۔ میں سمجھتی ہوں۔ اُسے تمہاری بیماری کا علم نہ ہوگا ——— میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں اُسے علم نہ ہوگا۔"

بڈھے آدمی پر قسم کا بڑا اثر ہوا اور اُس نے کہا "تو بہت اچھی لڑکی ہے"۔ پھر وہ خاموش ہو گیا دوسرے دِن مارگیرٹ نے ایک جھوٹی کہانی بنا کر سنا دی کہ بڑھیا کو اُس کے رشتہ دار اپنے ساتھ گھر لے گئے ہیں۔ پہلے وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح حیرت آمیز دلچسپی سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ جب اُس نے بات ختم کر لی تو وہ کہنے لگا "مگر وہ پھر واپس آ گئی ہے۔ گذشتہ شب میں نے سوتے میں اُس کی آواز سُنی تھی۔"

مارگیرٹ نے نرمی سے کہا "ہاں ہاں وہ آ گئی تھی۔"

اِسی طرح دو دِن گزر گئے۔ بڑھیا کو دفن کرنے کے بعد دوسرے دِن جب ڈاکٹر بوڑھے وِکٹر کو دیکھنے آیا تو اُس نے خلافِ توقع کہا کہ "حالت بہت اچھی ہے۔ بخار تقریباً اُتر چکا ہے۔ اور گرمی کم ہو رہی ہے۔ کل وہ دیکھنے لگیگا۔"

وہ مخبوط الحواس ہو کر ایک کونے میں دبکی بیٹھی تھی۔

"ہاں۔ کل ——— کل ———"

اپنی تاریک رُوح کی گہرائی میں مارگیرٹ نے بھی ایک مرتبہ اس لفظ کو دُہرایا "کل"!

کل وہ اپنی آنکھیں کھوئے گا، اور پھر آنکھوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ اُسے دیکھ نہ سکیگا
کل مارگیرٹ کے دِل میں اپنی خاموشی پر اُس کے اُس بودے سے رشتے کو بھی ایک جھٹکا لگے گا
جو شاید اُس کے بول اُٹھنے پر بھی محفوظ نہ رہ سکتا یہی زندگی کا قانون ہے۔ زندگی میں ہمیشہ
ایک کل ایسی آتی ہے جس کا انجام بخیر نہیں ہوتا، اور امن اور اُمید کی وہ صبح جو کبھی کسی ایک کو
حاصِل ہوتی ہے ہمیشہ کسی دوسرے کے لئے شام کا پیغام لاتی ہے +

"ہنری باربوس"

گمشتہ ستارے

میں اپنی نظم کا پانچواں شعر لکھ رہا تھا کہ میرے ملازم نے مجھ سے آکر کہا یہ حضور باہر دو فرشتے
ہیں جو آپ سے مِلنا چاہتے ہیں"

میں نے پوچھا یہ کیا اُنھوں نے تمھیں اپنے ملاقاتی کارڈ دیئے ہیں"؛

ملازم نے جواب دیا "جی ہاں، وہ یہ ہیں"۔

میں نے پڑھا۔ تو ایک پر "ہیلائیل" اور دوسرے پر "بافائیل" لکھا تھا۔ یقیناً دو فرشتے مجھ
سے ملنے آئے تھے۔ میں نے کہا " اُن سے کہو اندر آجائیں"۔

میرے لئے یہ مسرت کا مقام تھا کہ ایسے معزز مہمان مجھ سے ملنے آئے تھے۔ وہ اُن بڑے
بڑے شہپروں میں ملبوس تھے۔ جن میں سے ہر ایک پرندوں کے سے سات سات پروں سے ملاکر
بنا تھا، اور جن کی سطح پر قوسِ قزح کے ساتوں رنگ صبح کے دھندلکے کی تمام لطافتوں کے ساتھ جھلمل

جھلمل کر رہے تھے۔ اُن کے جسموں پر کہیں کہیں نظر پڑتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ صاف شفاف برف سے بنے ہیں۔ جس میں سے گلابی رنگ کی ہلکی سی جھلک نمایاں تھی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کو کہا اور پھر نہایت نرمی سے وہ مقصد دریافت کرنے لگا۔ جس نے مجھے اُن کی ملاقات کا شرف بخشا تھا۔

ہیلائیل نے کہا۔" ہم اختصار سے کام لیں گے۔ سولہ سال ہوئے بہار کی ایک نہایت خوبصورت رات کو ہم دونوں یا فائیل اور میں آسمان کے سبز قالین پر ہاکی کھیل رہے تھے......"

"معاف کیجئے"۔ میں نے کہا۔" میرا خیال تھا کہ آسمان نیلا ہے۔"

ہیلائیل نے جواب دیا۔" ہاں، بعض عمیق مقامات پر وہ نیلا ہی ہے مگر دوسرے مقامات پر مثلاً جو اطراف ایران پر چھائے ہوئے ہیں اس کا رنگ سبز ہے جو آنکھوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے کچھ نہ کہا۔

ہیلائیل نے اپنا سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔" اور گیندوں کی جگہ ہم نے وہ ستارے منتخب کئے جو آسمان پر سب سے زیادہ خوبصورت تھے۔"

میں نے کہا" اور چھڑیاں کس چیز کی تھیں؟"

ہیلائیل نے جواب دیا" چھڑیوں کے لئے دُمدار ستاروں کی دُمیں لی گئیں۔ قدرتی طور پر کھیل نہایت ہی دلچسپ تھا۔ میں بازی جیت رہا تھا کہ یکایک میں نے اس زور کی ضرب لگائی۔ کہ دو ستارے کنارے کو طے کر گئے۔"

ہیلائیل نے کہا۔" ہاں، اُفق کے کنارے کو........ اور یہ ایک بلا خیز حادثہ تھا۔ تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ آسمان پر دو ستاروں کا گم ہو جانا کتنا اہم معاملہ ہے! ہمیں آسمانوں کے حاکم کی طرف سے ایک فرمان موصول ہوا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ جب تک ہم اُن دو ستاروں کو ڈھونڈھ

کر اپنی جگہ پر لگا نہ دیں گے ہمیں جنت کی مسرتوں میں حصّہ لینے کی اجازت نہ ہوگی۔"

" ذرا خیال کرو، ہم نے اِن سولہ سالوں میں زمین کے اُس حصّے کا جدھر بظاہر یہ ستارے گرے تھے چپہ چپہ چھان مارا، مگر ہماری بدقسمتی کہ ہماری تمام کوششیں ناکام رہیں"۔

"ہم ہمیشہ کی جلا وطنی اپنے لئے قبول کرنے ہی والے تھے کہ ہم نے ایک لڑکی کی بےمثال آنکھوں کی تعریف سُنی، اور وہ لڑکی تمہاری محبوبہ ہے۔ اگر اُن باتوں کو صحیح باور کر لیا جائے۔ جو اُن آنکھوں کے متعلق مشہور ہو رہی ہیں تو ہر بات ظاہر کرتی ہے کہ انسانوں کی فانی آنکھوں کے خلاف اُس کی آنکھیں وہ آسمانی نور ہیں جسے ہم اتنی مدت سے تلاش کر رہے ہیں اور کیا ہم یہ اُمید کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیں یہ دو ستارے واپس دے دے گی"؟

یہ سُن کر میرا دماغ چکرا گیا۔ محض یہ خیال کہ کوئی میری محبوبۂ دلنواز کی آنکھیں مجھ سے چھین لے گا۔ میرے صبر و قرار کو غارت کر دینے کے لئے کافی تھا۔ لیکن آہ، یہ بھی میری ہی طاقت میں تھا کہ فرشتوں کو اُن کی کھوئی ہوئی آسمانی دولت واپس دلا دوں۔ میں نے اپنی محبوبہ کو بُلا بھیجا اور چند الفاظ میں تمام صورتِ حالات اُس کے سامنے پیش کر دی۔

اُس نے کسی حیرت کا اظہار نہ کیا، اور نہ اُسے کوئی پریشانی لاحق ہوئی۔ اُس نے ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچا اور پھر اپنی پلکوں کو خوب سا اوپر اُٹھا کر فرشتوں سے کہنے لگی "خوبصورت فرشتو! غور سے میری آنکھوں میں جھانکو اور اپنے ستاروں کو اُن میں سے پہچان لو"۔

وہ قریب آ گئے۔ اُنہوں نے دو شبزہ کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو نہایت غور سے دیکھا، کچھ دیر تک آہستہ آہستہ آپس میں اس طرح باتیں کرتے رہے۔ جیسے دو جج تبادلۂ آرا کریں۔ پھر میلائیل نے کہا "نہیں، یہ وہ دو ستارے نہیں ہیں جو سولہ سال ہوئے ہم سے گم ہو گئے تھے۔ گو بہار کی اس رات کو وہ بڑی آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ مگر نہ اُن میں اتنی تابانی تھی اور نہ اتنی درخشانی"۔

اس کے بعد وہ مایوس اور غمگین ہو کر وہاں سے چلے گئے۔ میرا دل اُن کے لئے رحم سے بھر گیا۔ گو مجھے اس بات کی خوشی بے انتہا تھی کہ میری محبوب آنکھیں وہ میرے لئے ہی چھوڑ گئے ہیں۔

اور میری محبوبہ! اُس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور کہنے لگی "میں نے اِن کو کیسا اچھا دھوکا دیا یہ سچ ہے اور میری ماں نے یہ واقعہ مجھے کوئی ہزار دفعہ سنایا ہوگا کہ جب میں پیدا ہوئی تو دو تارے ہماری کھلی ہوئی کھڑکی میں سے اندر آ پڑے۔ اور سیدھے میری آنکھوں میں سما گئے۔ مگر جب فرشتے میری آنکھوں میں سے اپنے تارے تلاش کر رہے تھے تو اُس وقت میں اُس ساعت کا تصور کر رہی تھی میرے پیارے، جب تم نے پہلی مرتبہ اپنے ہونٹوں کو میرے ہونٹوں سے ملا دیا تھا۔ اور میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اس مسرت کا تصور میری آنکھوں کو ـــــــ نہیں، اُن دو تاروں کو آسمان کے خوبصورت ترین تاروں سے بھی زیادہ تابان و درخشان بنا دے گا"۔

"کٹل منڈیز"

خوفناک انتقام

تاریخ بہت سے ایسے واقعات پیش کرتی ہے۔ جن سے ہمیں نفس کی قربانی کی اعلےٰ ترین مثالیں ملتی ہیں۔ خوشی، آرام، آزادی بلکہ بسا اوقات زندگی بھی نہایت فراخدلی سے محبت کی قربانگاہ پر قربان کر دی گئی ہے۔ مگر تاریخ ایسی مثالوں سے بھی خالی نہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جوشِ انتقام میں انسانی دِل رحم اور محبت کے تمام خیالات سے یکسر خالی ہو گیا ہے۔ انتقام کی مثال میں شاید اتنی زیادہ رنج دہ سرگزشت اور کوئی نہ ہوگی جتنی اُس اندلسی ماں کی کہانی ہے۔ جس نے

اپنے خاوند کے خون کا بدلہ لینے کے لئے اپنے تمام جذبات کو مٹا دیا۔

جس واقعہ پر یہ کہانی مبنی ہے۔ وہ نپولین کے عہد میں اس وقت پیش آیا۔ جب اُس نے اسپین اور پرتگال کو اپنی مملکت میں شامل کر کے تمام یورپ کا واحد حکمران بننے کی خواہش میں اعلانِ جنگ کیا۔ اندلس کے اُس چھوٹے سے گاؤں کے باشندوں نے جہاں یہ واقعہ پیش آیا فرانسیسی فوجیوں کے ظلم وستم کی کہانیاں سنی ہوئی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ لوگ مغلوب ملک کو کس طرح تباہ کرتے ہیں، کیونکر گھروں کو لوٹتے ہیں، مکانوں کو جلا دیتے ہیں اور باشندوں کو تہ تیغ کر دیتے ہیں۔ گاؤں کے سب لوگ اکٹھے ہوئے اور بہت سے بحث مباحثے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ بجائے اس کے کہ ہم اپنا مال ومتاع اور خوراک دشمن کے لئے چھوڑیں۔ یہ بہتر ہے کہ ہم گاؤں کو تباہ کر دیں۔ اُن کے پاس وقت بہت کم تھا۔ مگر وہ سب ایک عزمِ مصمم کے ساتھ مصروف ہو گئے اور ذرا سی دیر میں اُنہوں نے اِس بستی کو ایک ویرانہ بنا دیا۔ جن مکانوں کو لوگوں نے ابھی ابھی چھوڑا تھا اُن کی چھتیں ایک ایک کر کے زمین پر آ رہی تھیں۔ اور اُن میں سے آگ کے شعلے اور دھواں نکل رہا تھا۔ انگور کی بیلیں جنہیں بڑی احتیاطوں سے پالا گیا تھا اور جو اس جگہ کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہی تھیں پل کے پل میں جڑوں سے اُکھاڑ کر رکھ دی گئیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ پہاڑی کی ڈھلوان پر انجیر کے درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ مگر آج اُن کی ٹہنی ٹہنی الگ تھی۔ بچوں کی میٹھی میٹھی باتوں کی آواز کہیں سے نہ آتی تھی۔ بلکہ شاید پرندے بھی اپنے سُریلے گیت گاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ سوائے جلتی ہوئی لکڑی کی کڑکڑ کے اور اُس چھوٹی سی ندی کے شور کے جو پاس ہی ٹوٹے ہوئے دِلوں اور برباد شدہ مکانوں سے بے پروا بہتی چلی جاتی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

مگر ہاں! ایک کٹیا میں جس کا آدھا حِصّہ سڑک پر کھڑے ہونے والوں کی نظروں سے چھپا

رہتا تھا۔ ابھی زندگی کے کچھ نشانات باقی تھے۔ یہ ایک کسان کی کٹیا تھی۔ جو اس وقت سخت بیمار ہونے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کے ساتھ کسی گوشۂ امن کی تلاش میں نہ نکل سکا۔ اُس کی خوش و خورم متاہل زندگی کے تین سال اسی کٹیا میں گزر چکے تھے۔ لیکن اب چند ساعتوں کے بعد اُسے اِس زمین پر کسی دوسرے مکان کی ضرورت نہ رہیگی۔ اگر محبت کی والہانہ تیمار داریاں اُس کی بیماری کی سدِراہ ہو سکتیں تو یقیناً اُسے صحت ہو جاتی۔ کیونکہ اُس کی فرمانبردار بیوی اُس کے ہر لفظ، اُس کے ہر اشارے اور اُس کی ہر نگاہ کی تعمیل کے لئے ہر وقت اُس کے سرہانے کھڑی رہتی تھی۔

اُس نے کہا "تھریسا! میری وفادار بیوی! تم یہاں کیوں رہو۔ جب تم مجھے موت کے چنگل سے نہیں بچا سکتیں۔ اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ تم نپولین کے وحشی سپاہیوں کے ناپاک ہاتھوں سے محفوظ ہو گئی ہو تو میں نہایت اطمینان سے جان دوں گا۔ جاؤ، اپنے لئے اور ہمارے اِس پیارے بچے کے لئے کہیں اور کوئی محفوظ مکان تلاش کرو"۔

تھریسا نے جواب دیا "میرے سرتاج! یہ کیونکر ہو سکتا ہے؛ میں تمہیں کیوں کر چھوڑ سکتی ہوں! ممکن ہے سپاہی آئیں اور انہیں ہماری کٹیا نظر ہی نہ آئے۔ کیونکہ اس کا اکثر حِصّہ سڑک پر چلنے والوں کے لئے نظروں سے اوجھل رہتا ہے کیا عجب ہے کہ اس طرح ہم سب اُن کے ظلم سے بچ جائیں"۔ اِس کے بعد مریض کو کھانسی کا ایک شدید دورہ ہوا جس سے گفتگو کا سلسلہ رک گیا۔

سُنساں گاؤں پر شام کا اندھیرا چھا رہا تھا کہ مارچ کرتے ہوئے پاؤں کی آواز نے خاموشی کو توڑا، فرانسیسی سپاہی خوراک اور آرام کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ دھوپ کی گرمی میں چلتے چلتے اُن کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے تھے مگر جب پاس ہی انہیں گاؤں نظر آیا تو وہ خوشی سے اُچھل پڑے۔ لیکن آثار و قرائن سے جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ یہاں کیا گزر رہی ہے۔ اِس نظارے کو دیکھ کر اُن کی وحشیانہ انسانیت حیوانیت میں تبدیل ہو گئی اور حیوانیت سے خونخوار درندگی کے

درجے کو پہنچ گئی۔ جس خوراک کی ان کو سخت ضرورت تھی۔ وہ اُن کے پاؤں کے نیچے خاک میں روندی جارہی تھی۔ اور اس قدر انگور جو اُن سب کی پیاس بجھا دینے کے لئے کافی تھے۔ سڑک کے گڑھوں میں مسلے ہوئے پڑے تھے۔ انہوں نے قسم کھائی کہ اب اگر ایک متنفس بھی ہمیں مل گیا تو ہم اپنے دل کی ساری کھڑاس اُس پر نکال ڈالیں گے۔ چنانچہ انہوں نے گاؤں کا ایک ایک کونہ چھان مارا۔ یہاں تک کہ مریض کسان کی کٹیا میں اُن کو زندگی کے کچھ آثار نظر آئے۔

سپاہیوں کے افسر نے بغیر کھٹکھٹائے دروازے کو ایک دھکا دے کر کھول دیا۔ تھرلیا سامنے کھڑی تھی۔ سپاہیوں کو دیکھ کر اپنے خاوند کے بستر کے آگے کھڑی ہوگئی۔ تاکہ اُس کو اُن کی خونخوار نگاہوں سے بچالے۔ مگر ایک سپاہی نے بڑھ کر اور اپنی وحشیانہ قوت سے اُسے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا۔ اور تلوار کے ایک ہی وار سے اُس کے خاوند کو اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا۔

کوئی لفظ اُس درد و کرب کو ادا نہیں کرسکتا۔ جو اس عورت کے واویلا سے اس وقت ظاہر ہورہا تھا۔ جب وہ اپنے بے جان محبوب کو اپنی آغوش میں لے کر آنسو بہارہی تھی۔ لیکن فوجی سپاہیوں نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی۔ مروت اور رحم مدت ہوئی اُن کے دلوں سے رخصت ہوچکے تھے۔ انہوں نے گھسیٹ کر اُسے لاش سے جدا کر دیا۔ اور حکم دیا کہ فوراً کھانے پینے کی چیزیں مہیا کرے۔

تھرلیا کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کوئی ڈراؤنا خواب ہے۔ اور وہ حزن وملال کے استیلا میں کچھ اس طرح اِدھر اُدھر پھر رہی تھی کہ اس کا غمگین وجود وحشی فوجیوں کو بھی خوفزدہ کر رہا تھا۔ اُس نے تمام اندوختہ لا کر ان درندوں کے سامنے رکھ دیا۔ اور پھر اپنے بچے کو جو اُس مصیبت کے دوران میں نظر انداز ہوگیا تھا گود میں لے کر تھپکایا اور سُلا دیا۔

وہ اُن کے کھانے پینے کے اہتمام میں نہایت خاموشی سے مصروف تھی۔ فوجی اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور اُس کا سکون اور سکوت اُنہیں کھائے جا رہا تھا۔ اُس نے کھانا لا کر اُن کے سامنے چن دیا۔ وہ بُتوں کی طرح بے حس و حرکت بیٹھے رہے۔ کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ ایک لقمہ لے کر مُنہ میں ڈالے۔

آخر تھریسا بولی "تم کھانے کی طرف کیوں گھُور گھُور کر دیکھ رہے ہو۔ جو تم نے مانگا۔ میں نے تمہیں دے دیا ہے۔ جتنا تمہارا جی چاہے کھاؤ۔ اور اپنی راہ لو۔ میرا خاوند مر چکا ہے۔ آہ! تم نے اُسے اس وقت مارا جب وہ تمہاری بُزدلی اور کمینہ پن کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھا۔ جاؤ۔ میں تنہائی میں اُس کی موت پر آنسو بہانا چاہتی ہوں۔ آہ!"۔ اُس کے چہرے پر ایک نفرت انگیز ہنسی آئی اور پھر اُس نے کہا "میں سمجھتی ہوں کہ شاید تم اس لئے متامل ہو کہ تمہیں شراب میں زہر کی ملاوٹ کا اندیشہ ہے۔ لاؤ، اس شراب کا پہلا پیالہ میں پیتی ہوں۔ تاکہ تمہارا یہ شبہ بھی رفع ہو جائے"۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر ایک پیالہ اُٹھا لیا اور قریب تھا کہ وہ اُسے پی لے مگر فوجی سردار نے اُس کا ہاتھ روک لیا۔

اُس نے کہا "ماں کی محبت، جان کی محبت سے زیادہ زبردست ہوتی ہے۔ اس لئے یہ پیالہ بجائے اپنے مُنہ سے لگانے کے اپنے بچے کے مُنہ سے لگاؤ"

ایک زہر خند کے ساتھ مگر بغیر ایک لمحہ کے تامل کے اُس نے اپنے بچے کو جگایا اور پیالہ اُس کے لبوں سے لگا کر دو چار گھونٹ پلا دیئے۔ جب وہ اُن کے امتحان میں پوری اُتری۔ تو اُنہوں نے بے خوف ہو کر کھانا پینا شروع کر دیا۔ جونہی ان کی بھُوک دبی اور پیاس بُجھی، اُن کی بے ہودہ قسموں اور لغو ٹھٹھے مخول نے سارے کمرے کو سر پر اُٹھا لیا۔

لیکن یکایک بچے کی چیخ کی آواز اُن کے کانوں میں پڑی۔ اُنہوں نے جان لیا کہ یہ

ان کی موت کا گھنٹہ بجا ہے۔

جس کے ہاتھ میں جو کچھ تھا اُس نے وہیں پھینک دیا۔ وہ سب کے سب تھریسا پر ٹوٹ پڑے۔ اور غصہ سے بھری ہوئی آوازوں سے پُوچھنے لگے۔ "یہ تو نے کیا کیا؟"

"میں نے کیا کیا؟" تھریسا نے چلا کر کہا "میں نے تمہارے ساتھ وہی سلوک کیا۔ جو تم نے میرے خاوند کے ساتھ کیا تھا۔ جسے میں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ اور میں نے اپنے پیارے بچے کو، اپنے جگر کے ٹکڑے کو اُس کے قتل کا انتقام لینے کے لئے قربان کر دیا ہے زندگی اب میرے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اِس لئے جو تمہارا جی چاہے تم کرو۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھ کو جان سے ہلاک کر دو گے۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم بھی کسی اور خاوند کی بیوی کا دل توڑنے کے قابل نہ رہو گے کیونکہ کوئی گھڑی جاتی ہے کہ تم بھی مردہ ہو گے"۔

غصہ سے بھرے ہوئے فوجیوں نے اپنے جوشِ دیوانگی میں وہ آخری ظلم بھی کر ڈالا جس کے بعد اِس دنیا میں اُن کے جور و ستم کا خاتمہ ہو جانے والا تھا۔ بہت جلد کیٹیا پر خاموشی طاری ہو گئی۔ نپولین نے اپنی فوج کے سپاہیوں کا ایک دستہ کھو دیا تھا، جسے ایک عورت کے کمزور ہاتھوں نے تباہ کیا +

"اے آئی فرانس"

امریکا

ایک خط اور ایک پارہ

خط

نیویارک ۱۰ نومبر ۱۸۸۳ء

عزیز دوست!

اُمید تو نہیں کہ تمہیں یاد ہو، مگر میری شادی کو آج پانچ سال ہوتے ہیں۔ اور کل ـــــ کہ یہ خط کل سے پہلے ہی بند ہو جائیگا ـــــ میری سالگرہ ہے ـــــ چالیسویں سالگرہ۔ میرا دماغ خیالات سے پُر ہے اور انہیں میری روزمرّہ کی عادت صفحۂ قرطاس پر لانے کے لئے مجبور کر رہی ہے، جہاں میں اُن کا اظہار بہترین طریقے سے کر سکتا ہوں، اور وہ وہ خیالات ہیں جنہیں میں صرف شفیق ترین اور ہمدرد ترین آنکھوں کے لئے لکھنا چاہتا ہوں۔ میری زندگی میں میرے لئے یہ امر کچھ کم مسرّت کا باعث نہیں کہ میرا ایک دوست ہے جس کے سامنے میں اپنے دل کو کھول کر رکھ سکتا ہوں۔

میری بیوی اس وقت تمہارے ہمنام کو سُلا رہی ہے، مگر تم اِس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا کہ اس تقریب پر اُسے بھی اس وقت تک کہ ساڑھے گیارہ بج

چکے ہیں جاگنا پڑا ہے، نہیں وہ ٹھیک آٹھ بجے ایک دو آنسو بہا کر سو گیا تھا، لیکن
اب جب کہ اُس کی ماں اپنے معمول کے مطابق اُس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ تو
میں نے اُس کی نیند میں ڈوبی ہوئی ننھی سی مستفسرانہ آواز سُنی، پھر میں بھی اُس کے
پیچھے چل دیا اور دروازے کا پردہ اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ مگر میں کمرے میں داخل نہیں ہوا۔
سایہ دار شمع کی زرد زرد روشنی کا ایک دھبا سا پالنے کے سرہانے
کے قریب چمک رہا تھا، جہاں میری بیوی میرے بیٹے کے قریب جھکی ہوئی تھی۔
اس کا ننھا سا چہرہ جو ہو بہو اپنی ماں کی تصویر ہے اُس کی طرف متوجہ تھا۔ بچے کے
ہونٹوں پر ایک تبسم تھا اور میں جانتا ہوں کہ یہ بھی اُسی کے تبسّم کا عکس تھا۔ وہ
بیدار رہنے کی نیم کوشش میں خوشی سے اپنی آنکھیں جھپک رہا تھا، مگر اُس سحر
آفریں تبسم کے اثر سے جسے میں نہیں دیکھ سکا، بیداری اُس سے اپنا دامن چھڑا
رہی تھی۔ اُس کی بھوری آنکھیں بند ہو گئیں، ایک لمحے کے لئے کھلیں اور پھر بند
ہو گئیں۔ نیند کی ہلکی پھلکی چادر اُس پر تن گئی اور وہ وہاں پہنچ گیا جہاں ہم اپنی
گہری نیندوں میں بھی اُس کا تعاقب نہیں کر سکتے۔ پھر قبل اس کے کہ میں اپنی بیوی
کا چہرہ دیکھوں جو اب جُھک کر اُس کا مُنہ چوم رہی تھی میں نے پردے کو چھوڑ دیا
اور یہاں واپس چلا آیا، تاکہ اپنی زندگی کی آخری آگ کے سامنے بیٹھ کر اس مقدس
نظارے کو اپنی روحانی آنکھوں سے ایک مرتبہ اور دیکھوں اور اُس ناقابلِ بیان
مسرت کو حیران ہو کر سوچوں جو بلا استحقاق اور کسی پُراسرار طریقے سے مجھ پر چھا گئی ہے۔
میں تمہیں بتاؤں وہ لمحہ سوتے سے جاگ اُٹھنے کے اُن لمحوں
کی طرح تھا جن کا احساس کبھی کبھی ہمیں بچپن میں ہوتا ہے جب ہم کسی لطیف و

خوشگوار خواب کا دامن جاتے جاتے پکڑ لیتے ہیں —— وہ خوشگوار خواب جو ہماری آنکھیں اچھی طرح کھلنے سے پہلے ہی غائب ہو چکتا ہے، جس کی تصویر دنیا وی تصوّرات نہیں بنا سکتے، جو اپنی راہ میں ایک ایسی بلند و برتر مسرّت چھوڑ جاتا ہے اور جس کی نسبت شاعر کہتے ہیں کہ وہ کسی جنت کی یاد ہے جس کی تازگی ہماری نوخیز روحوں میں باقی رہ جاتی ہے۔

تم اندازہ کر سکتے ہو کہ میرے لئے اُن چیزوں کی واقفیت کا یقین کتنا تعجب خیز ہوگا۔ جو اب میری زندگی میں داخل ہو چکی ہیں، کیونکہ تم جانتے ہو کہ آج سے چند ہی سال پہلے میری زندگی کیا تھی۔ میں اس آدمی کی طرح ہوں جس نے اپنی عمر کے پہلے تیس سال کسی تاریک غار میں گزارے ہوں۔ کیا تم کسی ایسے شخص کو دس سال سے پہلے پہلے آفتاب کے نور اور آسمان کے نیل کا یقین دلا سکتے ہو۔

میں ابھی ابھی آتش دان کے سامنے بیٹھا تھا اور میرے پاؤں اُس سمور میں لپٹے ہوئے تھے جو تم نے ہم دونوں کو پچھلی کرسمس کے موقع پر بھیجی تھی۔ ہلکی ہلکی آگ کی روشنی کمرے کے سایوں پر، میری کتابوں پر اور تصویروں پر اور اُس تمام نادر و نفیس ساز و سامان پر رقص کر رہی تھی جو اب میری آنکھوں اور میرے دل کو مسرور کرتا ہے اور اُس مذاق کے لئے تسکین کا باعث ہوتا ہے، جو روٹی میسّر آنے پر بڑھتا ہی جاتا ہے۔ سو کچھ اس طرح میں اپنی شادکامی اور کامرانی کا جائزہ لے رہا تھا —— اپنی مادی دولت کا، اپنی اُس بہتر دولت کا جو مجھے دنیا کی طرف سے ملی ہے یعنی شہرت کا اور سب سے بڑھ کر اُس دولتوں کی دولت کا جو

ساتھ کے کمرے کی دہلیز کے پار ــــ اُس کمرے میں؛ نہیں ــــ وہاں، یہاں ہر کمرے میں، گھر کے ہر کونے میں امن کی روح بن کر بسی ہوئی ہے، یہ محبت کی پاک و پاکیزہ روح ہے۔

جب میں بیٹھا ان باتوں کو سوچ رہا تھا تو میرا خیال آج سے بائیس برس قبل کی دنیا میں پہنچ گیا۔ جب ہم پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے ملے تھے میں اُس ہیبت ناک دِن کو ابھی اور بائیس برس تک بھی نہ بھول سکوں گا جب میں "مارننگ ریکارڈ" کے دفتر میں داخل ہوا۔ ایک بڑے سے تاریک اور افسردہ کمرے میں گیس کی چھوٹی چھوٹی بتیاں جل رہی تھیں، جا بجا زرد چہروں والے کلرک بیٹھے تھے۔ اور دیواروں پر روشنائی کے بڑے بڑے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور باہر بارش ہو رہی تھی۔ گو نا صاف روشن دانوں میں سے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لیکن میں اُس کی نمی اور سردی کو محسوس کر رہا تھا۔ عقب کے کمرے سے سیاہی اور کھٹے کی بُو آرہی تھی اور چھاپے کی بڑی بڑی کلوں کا شور اور لرزش نیچے سے اوپر پہنچتا تھا۔ میں اپنے گیلے کپڑوں میں وہاں بیٹھا تھا اور اپنے پہلے تقرر کا انتظار کر رہا تھا۔ میری عمر اُس وقت اٹھارہ سال کی تھی اور میں بے حد غریب تھا، لڑکپن کی اُمید میرے دِل میں تھی اور میرے سر میں کالج کے ایک واحد سال کی لاطینی اور یونانی کا سرمایۂ علم تھا۔ میری طبیعت بیٹھی جا رہی تھی۔ میرا دل ایڈیٹر کی ہر آواز پر جب وہ اپنے نئے رنگروٹوں کو ایک ایک کر کے بلاتا اور انہیں اُن کے فرائض تفویض کرتا تھا، دھک دھک کرنے لگتا تھا۔ میں خاموش یہ دُعا مانگ رہا تھا کہ وہ مجھے کوئی آسان سا کام دے۔ اور مجھے اس کے سرانجام دینے

میں خفت نہ اُٹھانی پڑے ۔ الامان، ولیم، بوڑھا بالڈون نیک دِل ہونے کے باوجود کتنا سخت گیر منتظم تھا! کیا تمہیں اس کی تیز کڑکتی ہوئی آواز یاد ہے؟ اور اُس کا "مختصر! مختصر!" کہنا جو انسان کے دماغ سے تفصیل کو اجمال کے ساتھ پیش کرنے کی تمام قابلیت سلب کر لیتا تھا اور اُس کی کہانی کے الفاظ کو منتشر کر کے اسے ہکلاتے ہوئے چھوڑ دیتا تھا؛ بالڈون کا نام اب تک "مارننگ ریکارڈ" کی پیشانی پر موجود ہے ۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ کون بدبخت اس وقت اُس پریشان کن نکتہ چینی کے سامنے کھڑا لرز رہا ہوگا ۔

وہ کیسا کم نصیب دِن تھا! وقت کی رفتار غم کی طرح سُست تھی، داغدار، چھوٹی، ننگی باہوں والے بھتنے ہوا میں پھڑپھڑاتے ہوئے لمبے لمبے پروف ہاتھوں میں لئے پھر رہے تھے ۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص مجھ پر تعجب اور حقارت کی ایک نظر ڈالتا ہے ۔ اور پھر مجھے اپنے خیالات سے نکال دیتا ہے ہر شخص کو کچھ نہ کچھ کام تھا مگر مجھے کوئی کام نہ تھا ۔ جو لوگ میرے ساتھ انتظار کر رہے تھے ۔ ایک ایک کر کے بلا لئے گئے اور انہیں کام بتا دیا گیا میں اکیلا رہ گیا تب ایک اور خطرے نے میری کمزور اور مصروف متخیلہ کو عذاب دینا شروع کیا ۔ کیا میرا افسر اپنے نئے رنگروٹ کو بھول گیا؟ یا اسے میری کم حیثیت کے مطابق کوئی کام ہی نہیں ملا؟ اس خیال نے پہلے تو مجھے شرم میں غرق کر دیا ۔ پھر یکایک غصے اور غلط کاری کے جذبے سے بھر دیا ۔ آخر وہ کیوں میری یوں تحقیر کرے؟ کیا میں حق نہیں رکھتا کہ مجھے آزمائش کے طور پر ہی کہیں لگا دیا جائے؟ کیا کوئی ایسا کام بھی تھا ۔ جس کے متعلق اس نے سوچا ہو کہ میں اُسے

سرانجام نہ دوں گا؛ یا اس کے لئے اپنی جان دینے سے دریغ کروں گا! میں اُس کے پاس جاؤں گا اور اُس سے کہوں گا کہ میں یہاں کام کرنے آیا ہوں اور کام لے کر چھوڑوں گا۔ نہیں، مجھے جھڑک دیا جائے گا اور واپس اپنی جگہ پر بھیجدیا جائے گا، یا شاید اُسی وقت برطرف کر دیا جائے۔ مجھے اس تحقیر کو خاموشی کے ساتھ برداشت کر لینا چاہیے۔

میں نے نظر اُٹھائی تو تم داخل ہو رہے تھے۔ تمہارا روشن، ہنس مکھ بھیگا ہوا چہرہ چمک رہا تھا۔ جب تم آئے تو سارا کمرہ جگمگا اُٹھا۔ تمہاری اِس زندہ دِلی اور خود اعتمادی پر میں نے تمہیں بلا سوچے سمجھے خوب دِل کھول کر کوسا آہ جد وجہد اور کامیابی کا کتنا فاصلہ تمہیں مجھ پر فوقیت دیئے ہوئے تھا — تمہیں جو رپورٹ تھے، مجھ پر، جو مبتدی تھا! اور عین اُس وقت یہ ہولناک آواز آئی — "بارکلے! بارکلے"! — یہ کرخت آواز اب میں قیامت ہی کو سنوں گا میں اندر گیا۔ مجھے اپنے متعلق حکم سنایا گیا جسے لے کر میں باہر آیا۔ مجھ پر کچھ ایسی پریشانی اور گھبراہٹ طاری تھی کہ یقیناً بالڈون نے مجھے ایک احمق سمجھا ہوگا۔ اور پھر تم میرے پاس آئے اور اپنے مدعا کو چھپاتے ہوئے ایک عجب بے قاعدہ طور پر تم نے مجھ سے واقفیت حاصل کی اور میرے کام کے متعلق تم نے مجھے ایک دو باتیں بتادیں۔ اُس وقت میں تمہارے لئے جان تک دینے کے لئے تیار تھا۔

یہ ایک معمولی سی بات تھی لیکن وہ دوستی جس کی ابتدا مردانہ دستگیری سے ہوئی تھی، بائیس برس تک باہمی اعتماد اور وفاداری سے نبھی، اور نشو ونما بیچ کو سرفراز کرتی ہے۔

یہ پودا اپنے ابتدائی دِنوں میں خوب بڑھا۔ بہار گزر رہی تھی کہ ہم نے اپنے رہنے کے لئے ایک مشترکہ کمرہ کرائے پر لینے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا ایک بھدّا سا کمرہ، اور بارہ طویل سالوں تک یہی ہمارا اور ہماری امیدوں کا اور ہماری ناامیدیوں کا اور ہماری مصائب کا اور ہماری راحتوں کا مسکن رہا۔

میرا خیال ہے کہ میں اس کمرے کی ایک بات بھی نہیں بھولا۔ ہماری پہلی خرید، وہ بڑی سی پُرانی میز جس پر بیٹھ کر ہم زندگی کی جدوجہد سے بچے ہوئے مختصر وقفوں میں بقائے دوام کے لئے کام کیا کرتے تھے بالکل میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ تمہاری دراز جس میں تمہاری "علم المعیشت" کا مسودہ رہا کرتا تھا دائیں طرف ہے۔ میری دراز بائیں جانب ہے۔ اس میں میرا ناتمام ڈراما اور نظمیں پڑی ہیں۔ تمہاری چارپائی دروازے سے داخل ہونے پر بائیں طرف ہے۔ اور میری دائیں طرف +

کیسی عجیب بات ہے کہ میں یہ سب کچھ صاف طور پر دیکھ رہا ہوں، اب جب کہ سب کچھ بدل چکا ہے۔

اب تک مجھے وہ رات کے ایک بجے نیند سے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ گھر آنا یاد ہے۔ میں نے دروازہ کھولا ــــــ لو، مجھے اُس کی زنجیر اپنے ہاتھ سے چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ــــــ اور میں بائیں طرف دیکھتا ہوں۔ آہ، تم گھر میں ہو اور سو رہے ہو۔ مجھے میز کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے مشترکہ "خزانے" میں کچھ نقدی ہے اور ہماری باضابطہ قرارداد کے مطابق مجھے معلوم ہے کہ میز پر دو روٹیاں اور کچھ پنیر رکھا ہے۔ تم بھوکے

ہی سو گئے ہو، کیونکہ جب تک ایک نہ آئے دوسرا نہیں کھا سکتا۔ میں تمہیں جگاؤں گا اور ہم دونوں اکٹھے کھانا کھائیں گے اور پھر گزشتہ اور آئندہ دِن کی باتیں کرینگے۔

کیا یہ تعجب خیز نہیں کہ میں اس حقیقت کو کسی قدر تکلف کے ساتھ پا سکوں کہ یہ محض گزرے ہوئے زمانے کی ایک یاد ہے —— میں، جس کے پاؤں اِس وقت اُس سمور میں لپٹے ہوئے ہیں جسے اگر ہم اُس وقت خریدنا چاہتے تو ہم دونوں کو یا ہم جیسے ایک درجن آدمیوں کو فقیر بنا کر چھوڑتی، یقیناً تعجب خیز ہے یہ معاملہ کہ میرے خیالات لڑکپن اور نوجوانی کی خام کاریوں میں بھٹکتے پھریں۔ میں جس نے دنیا کی نظروں میں نام اور شہرت پیدا کر لیا ہے۔ میں، جس کے پاس ایک پختہ کار کی حیثیت سے نوجوان مشورے اور حوصلہ افزائی کے لئے آتے ہیں تعجب ہے کہ میں ایک ایسے زمانے کا خیال کر رہا ہوں جب ابھی تمہاری سچی اور لازوال دوستی بھی میرے دِل کی پیاس نہ بجھا سکی تھی، وہ پیاس جو ایک زیادہ محبوب اور زیادہ دِلی رفاقت کے لئے تھی۔ میں، جسے اب ایک ہمدرد اور شفیق بیوی کی محبت حاصل ہے۔ جو کسی وقت میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی، جو اپنی نیند میں بھی مجھ سے میری روح سے زیادہ دُور نہیں رہتی۔

پھر سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ رنج و اندوہ کا وہ اضطراب اور تنہائی کا وہ زبردست احساس جو کبھی ہمارے اشتراک کے خاتمے پر مجھ پر چھا گیا تھا، ایک بھولی بسری یاد ہے دوسری یادوں کی طرح جنہیں ہم دِل کی آرام گاہ سے بُلا کر خیال کے پردے پر دیکھ سکتے ہیں اور پھر حسب دستور ایک آہ یا ایک تبسم کے ساتھ رخصت کر سکتے ہیں! آہ، دس ہی سال پہلے یہ کتنی واقعی بات تھی، کتنی

دردانگیز بات! یقین کرو، دوست ـــــــ ہاں میں چاہتا ہوں کہ تم اس پر یقین کرو ـــــــ کہ تنہائی کی اُن اوّلین گھڑیوں میں مَیں بڑی خوشی سے موت کو قبول کرنے کے لئے تیار تھا، موت کو جو اگر اُس وقت آتی تو اسی سکون کے ساتھ مجھ پر چھا جاتی جس سکون کے ساتھ ابھی ابھی ساتھ کے کمرے میں نیند میرے بچے پر چھا گئی ہے۔

اُس وقت تمہیں اس کی مطلق خبر نہ تھی۔ اور میرا خیال ہے کہ اب بھی تم پوری طرح اس کا یقین نہ کرو گے۔ کیونکہ ہم مردانہ وار ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے تھے میرا اُوپر کا ہونٹ اتنا ہی تنا ہوًا تھا جتنا کہ تمہارا، صرف اُس پر بال نسبتاً ذرا کم تھے۔ شاید یہ تمہیں مبالغہ معلوم ہو لیکن تمہارے اور میرے حالات میں بڑا فرق تھا۔ جب محبت کے دیوتا نے تم پر نگاہ کی تو تم نے اپنے قلم کا رُخ دولت کی طرف پھیر لیا، تم ایک جج کی بیٹی سے شادی کرنے کے لئے جا رہے تھے اور ایک بہت بڑی جاگیر اور روپے کے مالک بننے والے تھے اور اس کا بڑی حد تک تمہیں علم بھی ہو گیا تھا یا کم از کم تمہیں اُمید ضرور تھی۔ اُمید بڑی چیز ہے لیکن میں، میں اِسی کلبۂ احزاں میں رہ گیا، اپنے بہترین دوست کو کھو کر، اور میرا دِل ویران تھا، اُس میں نہ کسی کی محبت کی یاد تھی نہ اُمید، اور میرا آخری افسانہ تمام رسالوں کے دفاتر سے گھوم کر میرے پاس واپس آ چکا تھا۔

مجھے پھر اپنے نفیس کتب خانہ میں پہنچ جانے دو، جہاں اچھی اچھی کتابیں ہیں اور روشن آگ ہے اور میں اپنے پاؤں تمہارے سمور میں ڈالے بیٹھا ہوں اور دوسرے کمرے میں اپنی بیوی کے قدموں کی آواز سُن رہا ہوں۔

چونکہ ہم ایک مدت تک اس درجہ متحد و متفق ہو کر رہے ہیں۔ کہ ایک کی

آواز کی ہلکی سے ہلکی لرزش بھی دوسرے کے لئے صریح الفاظ سے زیادہ معانی رکھتی ہے۔ اِس لئے جو کچھ میں نے ابھی ابھی کہا ہے اس میں تمہارے کانوں کے لئے میرا پُر افسوس لہجہ بھی شامل ہو گا ـــــ افسوس اُن دِنوں کے لئے جو گزر چُکے اور اِس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ اگر میں اُن دنوں کے لئے متاسف ہوں؛ ایک غریب سپاہی جسے قسمت نے اپنے بے بساط اڑھ کپن میں بھی کام سے فرصت نہ دی ہو، جو صحت کی آرام نہ لینے والی؛ اور دوسروں کے لئے راستہ صاف کرنے والی عظیم الشان محارب فوج میں ایک ادنیٰ درجہ سے ترقی کر کے اعلےٰ رتبہ پر پہنچا ہو، کیا وہی آدمی، یک لخت، اپنے تنے ہوئے سخت اعضا کو گھر کے آتشدان کے سامنے ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھ سکتا ہے؟ کیا اُس کی ٹانگیں سفر کے تصوّر میں خود بخود ہلنے نہ لگیں گی؟ کیا اُس کا موسم زدہ چہرہ بارش کے چھینٹوں کی آرزو نہ کرے گا؟ کیا تمہیں اس پر حیرت ہو گی اگر رات کے وقت وہ اپنا زم زم سفید بستر چھوڑ کر ایک کمبل اوڑھے کھلے میدان میں پھرنا چاہے، جہاں اُس کے سر کے اُوپر رات کی نیلی وسعتوں کے پرے چمکتی دمکتی دنیاؤں کا جلوس گزر رہا ہو؛ اور اگرچہ ساتھ کے پلنگ پر وہ پیاری پیاری آنکھیں بیدار ہو کر سرزنش آمیز حیرت کے ساتھ اُس کی طرف دیکھنے لگیں، اور اگرچہ محبت آمیز باہیں کھینچ کر پھر اُسے اپنا مطیع کر لیں۔ لیکن اس پر بھی کیا اُس کا دِل دھڑکتا ہوا خوابوں میں اُس جگہ نہ پہنچ جائے گا جہاں سے ڈھول کی آواز آ رہی ہو یا کیمپ کے گیتوں کی موسیقی بلند ہو رہی ہو؟

پہلے سال کی بے قیاس مسرّت میں میرا یہی حال تھا، بلکہ بچے کی پیدائش کے بعد تک یہی حال رہا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ کئی مہینوں تک میں اپنے

لڑکے کے وجود کو ایک حقیقت تسلیم نہ کر سکا؟ اس عرصے میں اگر کسی وقت بھی وہ اپنے گھٹو لے کے سمیت میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوتا مجھے اُس وقت اُس کا یقین آیا جب اُس کی آنکھوں میں اُس کی ماں کی آنکھوں کی جھلک نظر آنے لگی۔

ہاں، اُن دِنوں میرے اندر کوئی پرانا جذبہ کام کرتا تھا۔ بعض اوقات مجھ پر وہی وحشیانہ آزادی غالب آجاتی تھی جس کے نشہ سے سرشار ہو کر ہم دنیا کا لطف اُٹھایا کرتے تھے —— وُہی جذبہ جس کے رُو سے ہم اپنی مرضی کے علاوہ دنیا کی کسی ہستی کے آگے جواب دہ نہیں تھے —— وہی احساس جو ایک غیر پابند اور بے پروا طاقت تھا۔

کیا تمہیں وہ رات یاد ہے جب ہم طلوعِ آفتاب تک گھومتے رہے تھے تمہیں یاد ہوگا کہ آدھی رات کے قریب جب ہم نے دفتر کو چھوڑا، کتنی گرمی تھی اور ایوانِ بلدیہ کے بالمقابل چھٹکی ہوئی چاندنی ہمیں کس طرح میدان کی طرف کھینچ رہی تھی جہاں نہ گیس کی روشنی کی چکا چوند تھی، نہ کسی بتی کی جھلملاہٹ۔ ہم یوں ہی سکوت زدہ گلیوں، بیقرار بازاروں اور پُرسکون راستوں سے گزرتے گئے۔ بند اور تاریک مکانات پیلی پیلی چاندنی کے اندر بڑے بڑے مقبروں کی طرح نظر آ رہے تھے ہم حوالیِ شہر سے گزر گئے، ہم بیرونِ شہر کی باغوں سے گھری ہوئی کوٹھیوں سے بھی گزر گئے اور ہم اُس وقت ایک پہاڑی پر پہنچ چکے تھے۔ جب سُورج کی کرنیں درختوں کی اونچی اونچی چوٹیوں کو چھونے لگیں۔

میں اس وقت اس آزاد سفر کی پاکیزہ مسرت کی خاطر ساری زمین کو طے

کر جانے پر تُلا ہوا تھا۔ اس وقت ہمیں روکنے والی کونسی چیز تھی؛ گھر بار کا کوئی رشتہ نہیں۔ دنیا کے لئے ہم پیچھے کیا چھوڑ رہے تھے؛ چند بے سروپا مہمل تحریریں اور یہ ایک ایسا سرمایہ تھا جس سے ہمارے سر خوب پُر تھے۔ میرا خیال ہے۔ کہ یہی وہ حقیقی موقع تھا کہ ہم اس سیر کو شروع کرکے رُک گئے۔ جس سے اگر ہم جی بھر کر لطف اندوز ہوتے تو اپنی زندگیوں کو تباہ کر لیتے۔

ہاں تو اولوالعزمی کا وہی گستہ عناں جذبہ کبھی کبھی مجھ پر غلبہ پا لیا کرتا تھا۔ ایسے اوقات بھی آتے تھے کہ ایک لمحے کے لئے میں بھول جاتا تھا کہ میری ایک بیوی ہے اور ایک بچہ ہے۔ ایسے اوقات بھی آتے تھے جب میں انہیں اپنے لئے ایک بوجھ سمجھتا تھا۔ میں اسے کیوں نہ کہہ ڈالوں؛ یہ ہر شادی شدہ آدمی کی سرگزشت ہے۔ کم از کم ہر مرد آدمی کی —— خواہ اس کی شادی دنیا کی بہترین عورت ہی سے ہوئی ہو۔ اس کے معنی محبت کا فقدان نہیں ہیں۔ یہ اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا نفیری کی آواز پر ہمارے خون کا اُچھلنا ناگزیر ہے۔

پہلے پہل میں ڈر گیا۔ اور اس جذبے کے خلاف جنگ کرنے لگا جیسے کسی بُری عادت کے خلاف جنگ کی جاتی ہے۔ میں عالمِ خیال میں غیر وفادار ہونے پر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔ آہ! جنگ کرنے کی مجھے کیا ضرورت تھی؛ اپنے باغی تخیلات کا گلا گھونٹنے کی مجھے کیا ضرورت تھی۔ جب میری بیوی کی محبت وہ معجزہ دکھا رہی تھی جس سے دو روحیں مِل کر ایک ہو جاتی ہیں؛

آخر یہ اتحاد کیا ہے جو ہمارے لئے ایک حیرت بن کر آتا ہے اور تمام بیرونی دنیا کے لئے ایک ناقابلِ بیان راز بن کر رہتا ہے؛ یہ کیا ہے جو ہماری

غیر ازدواجی محبت کو ہماری نظروں میں انتہا درجہ حقیر اور طفلانہ بنا دیتا ہے؛ تم اور میں جو اس سے بہرہ در ہیں جانتے ہیں کہ یہ محض ارتباط و اختلاط کا ثمر نہیں ہے، گو اس کی نشو و نما انہیں کے پہلو بہ پہلو ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک عجیب انداز سے مرد کو ملتا ہے کہ وہ عورت کی روح کو دیکھے جس طرح وہ اپنی روح کو دیکھتا ہے اور عورت کو کہ وہ مرد کے دل میں نگاہ ڈالے جیسے یہ اُس کا اپنا دل ہے۔ میرا کوئی دوست جب دیکھتا ہے کہ میری بیوی اور میں ایک دوسرے کی بات کو آنکھوں کے اِک ذرا سے مل جانے ہی سے پا جاتے ہیں تو وہ اِسے ذہانت کی اُس نگاہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا جو عموماً دو دلی دوستوں کے درمیان بات چیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اُسے اُس مسرت کا وہم و گمان تک نہیں ہوتا جو ہمیں اپنی اس گفتگو میں حاصل ہو جاتی ہے ——— وہ گفتگو جس کی زبان کو وہ سمجھ نہیں سکتا، جسے وہ سن نہیں سکتا ——— وہ زبان جس کے باضابطہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ جس میں جذبات جذبات کا جواب دیتے ہیں۔

اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ میں اُس امتنان کا اظہار چاہوں جس کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کو یوں پھلتے پھولتے دیکھا ہے ——— اپنی احسانمندی کا، محبت کے لئے، جس نے مجھے نہ صرف مسرور تر، بلکہ میں عاجزانہ اقرار کرتا ہوں کہ بہتر و بلند تر دل و دماغ عطا کیا ہے۔ مگر مجھے اس اظہار کے لئے اپنے عجز بیان کا اعتراف ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں شاعر ہوتا تو میرا بہترین شعر بھی پوری صفائی سے اِسے ادا نہ کر سکتا۔

میرا خیال ہے کہ ابھی ابھی میرے پیچھے کوئی سرسراہٹ سی ہوئی ہے

تھوڑی دیر میں میری بیوی آہستہ سے کمرے میں داخل ہو گی۔ اور آہستہ سے میرے پاس آ کر کھڑی ہو جائے گی۔ پھر ایک ہاتھ آہستہ سے میرے بائیں کندھے پر رکھیگی اور اُس کا دوسرا ہاتھ میرے اُس بازو تک بڑھ جائے گا جس سے میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ یہاں تک کہ وہ نرمی سے، مگر اس نرمی میں محبت کی قوت ہو گی، میرے اُس ہاتھ کو پکڑ لے گی جس میں قلم ہے اور میں کہوں گا "بس آخری الفاظ، ولیم اور اُس کی بیوی کے لئے "پیاری" اور وہ میرے ہاتھ کو چھوڑ دے گی۔ اور اپنا ہاتھ اُٹھا کر، میرا خیال ہے کہ میری کنپٹی پر کے سفید بالوں کے گچھے کو چھوئے گی، یوں جیسے اُس کو ان پر رحم آ رہا ہو یہ بھی اس کی ایک ادا ہے! اور وہ کہے گی "میرا بھی ان کو سلام لکھنا اور کہنا کہ اس کرسمس پر وہ ضرور ہمارے ہاں آئیں۔ میں اُن کو دکھانا چاہتی ہوں۔ کہ ہمارا ولی کتنا بڑا ہو گیا ہے۔" اور جب وہ "ہمارا ولی" کہے گی۔ تو اُس کا وہ ہاتھ جو میرے کندھے پر ہے، بے اختیار ذرا سا بند ہو جائے گا۔ اور وہ اپنا سر جھکا دیگی۔ اور اپنا چہرہ میرے قریب کر دے گی اور میں مڑ کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دوں گا۔

پیارے دوست صبر کرو۔ یہاں تک کہ میں تمہیں بتا چکوں کہ یہ خط میں نے کیوں لکھا ہے اور اس کا کیا مطلب ہے۔ ایک بات میں نے تم سے گزشتہ چھ ماہ سے چھپائے رکھی ہے۔ مجھے دل کی بیماری ہے اور ڈاکٹر نے مجھے بتایا ہے۔ کہ ہر لحہ تمہاری موت کا امکان ہے۔ مجھے خیال ہو رہا ہے ——— مجھے یقین ہو رہا ہے کہ وہ لحہ اب قریب ہے۔ میں جلد ہی اپنے بستر پر چلا جاؤنگا جو دروازے کے دائیں طرف بچھا ہے۔ اور مجھے یقین نہیں کہ صبح میں بیدار ہوں گا۔ اور آفتاب کی کرنیں میری آنکھوں کو یہ دکھانے کے لئے روشن کرینگی

کہ میرا رفیق مجھ سے جُدا ہو چکا ہے۔

کیونکہ میں اُسی پرانے کمرے میں ہوں جیسا کہ تمہیں علم ہے۔ اور تمہیں یہاں سے گئے دس سال نہیں ہوئے بلکہ صرف دو دِن ہوئے ہیں۔ وہ تصویر جو ان صفحات کو لکھتے وقت مجھے حقیقی نظر آرہی تھی۔ اب آہستہ آہستہ ماند پڑتی جارہی ہے اور شمع کی لو تھرتھرا تھرتھرا کر ڈوبی جاتی ہے۔ صبح قریب ہے، اُس کے ہنگاموں کا آغاز ہے۔ ہوا بخاری میں داخل ہو کر ہانپ رہی ہے اور تڑپ رہی ہے۔ اور نیچے آتشدان میں آکر سفید راکھ کو اُڑا رہی ہے۔ میں نے ابھی ابھی اپنی نظمیں اور ڈراما جلا دیا ہے۔ اب میز کی دونوں درازیں خالی ہیں اور بہت جلد دونوں خالی کرسیاں میز کی دونوں اطراف سے ایک دوسری کی طرف تکتی رہ جائیں گی۔ اِس عظیم خلو میں میرے تصور نے کتنا وحشت ناک خواب دیکھا ہے! ابھی ابھی میں اسے حقیقت سمجھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے اپنے پیچھے کسی عورت کے قدموں کی چاپ سنی ہے اور اِسی لئے میں مڑ کر دیکھ رہا تھا۔

میرا پُر محبت سلام لو! میں اب سونے کے لئے جارہا ہوں۔ شاید میں اِس خواب کو ایک بار پھر دیکھوں، اور اُن دھیمے قدموں کی آواز کو ایک مرتبہ پھر سنوں، جب رات پلٹنے لگے، اور جب پھٹے پُرانے پردوں میں سے پیلی پیلی روشنی ہویدا ہونے لگے اور جب اس طویل تنہائی کا انجام آپہنچے۔

جب میں مر جاؤں تو میں چاہتا ہوں کہ تمہارے خیال میں مَیں وہ نہ ہوں جو میں تھا بلکہ میں وہ ہوں جو میں بننا چاہتا تھا۔ میں نے تمہیں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ تمہاری رفاقت میں مَیں نے اُمید اور چاہت کی اُس سے

ایک خوش تر اور محبوب تر زندگی بسر کی ہے جسے تم نے دیکھا ہے۔ میں نے تمہارے تصور کے لئے اپنی ایک ایسی تصویر چھوڑ جانے کی کوشش کی ہے کہ جب اس دوست کی یاد کے لئے جسے تم اچھی طرح جانتے تھے اور جسے شاید اُس کے مرنے کے بعد تم بہتر طریق پر جاننے لگو تمہیں سکون اور تنہائی کی ایک ساعت میسر آجائے تو اسے اپنی نظروں کے سامنے لانے میں تمہیں کوئی تکلف نہ ہو"۔

"ریجی نلڈ بارکلے"

پارہ

(۱۰ نومبر ۱۸۸۳ء کے "نیو ہیرلڈ" سے لیا گیا)

"ریجی نلڈ بارکلے، ایک اخبار نویس، کل صبح اپنے بستر میں مردہ پایا گیا۔ موت کا باعث دریافت کرنے کے لئے کوئی طبی تحقیقات نہیں کی گئی کیونکہ اسے قلب کا عارضہ تھا اور اُس کی موت غیر متوقع نہ تھی۔ مرحوم ایک ہونہار نوجوان اخبار نویس تھا۔ چند سال تک وہ "مارننگ ریکارڈ" کے شہری عملے میں کام کرتا رہا اور کئی ایک غیر مقامی اخبارات کا نامہ نگار بھی رہا۔ اُس کے مضامین نظم و نثر ماہوار رسالوں میں بھی چھپتے رہے ہیں جن سے کسی حد تک اُس کی دماغی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ بارکلے کی عمر تیس سال کے قریب تھی اور ابھی اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔"

"ہنری کیلر بنر"

قلبِ غمّاز

سچ ہے۔ میں ذکی الحس تھا۔ خطرناک طور پر ذکی الحس، اور اب بھی ہوں مگر تم مجھے دیوانہ کیوں کہو؟ مرض نے میرے حواس کو کند نہیں بلکہ تیز کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ تیزی میری قوت سامعہ میں رونما ہوئی تھی۔ مجھے زمین و آسمان کی تمام باتیں سنائی دیتی تھیں۔ مجھے جہنم سے بہت سی آوازیں آتی تھیں پھر میں دیوانہ کیونکر ہوا؟ سنو! اور دیکھو کہ کیسی صحت کے ساتھ اور کیسے اطمینان کے ساتھ میں تم کو اپنی کہانی سناتا ہوں ؂

میرے لئے یہ بتانا ناممکن ہے کہ یہ وہم میرے سر میں کس طرح سمایا مگر ایک مرتبہ جب وہ میرے سر میں سما گیا تو رات دن مجھے اس کی خلش رہنے لگی۔ میرا اس سے کوئی مقصد نہ تھا۔ میرے دل میں اُس کے لئے کوئی دشمنی نہ تھی بلکہ مجھے اس بوڑھے سے محبت تھی اس نے مجھے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اس نے میری کبھی کوئی توہین نہیں کی۔ اس کے مال و دولت کی مجھے کوئی خواہش نہ تھی میں سمجھتا ہوں کہ یہ اُس کی آنکھ تھی! ہاں یہی تھی! اس کی ایک آنکھ گرگس کی آنکھ سے مشابہ تھی۔ زردی مائل نیلی آنکھ، جس پر ایک ہلکا سا پردہ پڑا ہوا تھا۔ جب کبھی یہ آنکھ مجھ پر پڑتی تھی۔ میرا خون سرد ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اس طرح آہستہ آہستہ، درجہ بدرجہ میں نے اس شخص کی جان لینے کا تہیہ کر لیا تاکہ ہمیشہ کے لئے اس آنکھ سے اپنے آپ کو نجات دلا سکوں۔

یہ ہے اصل واقعہ۔ تم مجھے دیوانہ سمجھتے ہو۔ مگر دیوانے تو کچھ نہیں جانتے۔ کاش کہ تم مجھے دیکھتے۔ تم مجھے دیکھتے کہ کس دانشمندی سے میں نے اس کام کو سرانجام دیا . . . . کس احتیاط سے . . . . . . کس دور اندیشی سے . . . . . کس عیاری سے میں اس کام کیلئے جا رہا۔

اُس کے قتل سے پہلے ایک ہفتہ تک میں اس سے کمال ملاطفت سے پیش آتا رہا اور ہر شب آدھی رات کے قریب میں اُس کے دروازے کی چٹخنی گھما کر اس کو کھولتا تھا۔ . . . . . . آہ، کتنی آہستہ سے میں اسے کھولتا تھا۔ اور پھر جب اس میں اتنی درز بنا لیتا۔ جس میں سے میرا سر اندر داخل ہو سکے، میں ایک سیاہ لالٹین کو جو ہر طرف سے بند ہوتی۔ ایسی بند کہ روشنی کی ایک کرن بھی اس میں سے باہر نہ نکل سکے، آگے بڑھاتا اور پھر اپنے سر کو اندر داخل کیا کرتا تھا۔ اوہ، اس وقت تم مجھے دیکھتے تو کبھی اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکتے۔ میں آہستہ، نہایت آہستہ اپنے سر کو اندر لے جاتا تھا تاکہ اس بوڑھے آدمی کی نیند نہ اُچٹ جائے۔ پورے ایک گھنٹے میں اپنے سر کو بس اس قدر اندر داخل کر سکتا تھا کہ میں اس کو اپنے بستر پر دیکھ لیتا۔ حیف ہے تم پر! کیا کوئی دیوانہ بھی اس درجہ ہوشیار ہو سکتا ہے؟ اور پھر جب میرا سر پوری طرح سے اندر پہنچ جاتا تو میں احتیاط سے لالٹین ہٹاتا . . . . اوہ کتنی احتیاط سے . . . . احتیاط سے (کیونکہ اُس کے قبضے آواز دیتے تھے) میں اس کے پردے کو صرف اتنا ہٹاتا تھا۔ کہ روشنی کی ایک شعاع نکل کر اس کی کرگس نما آنکھ پر پڑتی تھی۔ اسی طرح میں نے سات لمبی راتیں گزار دیں . . . . ہر شب آدھی رات کے قریب . . . . . . مگر میں ہمیشہ اس آنکھ کو بند پاتا تھا اور اس لئے اپنے کام کو انجام نہ دے سکتا تھا۔ کیونکہ یہ بوڑھے آدمی کا اپنا وجود نہ تھا جو مجھے پریشان رکھتا تھا بلکہ یہ اُس کی بدبخت آنکھ تھی، اور ہر صبح جب دن چڑھتا میں بے باکی کے ساتھ اُس کے کمرے میں داخل ہوتا اور جرأت کے ساتھ اس سے باتیں کرتا، میں زندہ دلی سے اس کو نام لے کر مخاطب کرتا اور اُس سے دریافت کرتا کہ اس کی رات کیسے گزری۔ وہ بڑا اخرانٹ آدمی تھا۔ اُسے شک پیدا ہو گیا کہ شاید میں ہر رات بارہ بجے کے قریب جب وہ سویا ہوتا ہے اُسے دیکھنے کے لئے جاتا ہوں۔

آٹھویں رات کو میں نے دروازہ کھولنے میں معمول سے زیادہ احتیاط سے کام لیا۔ گھڑی

کی منٹ والی سوئی کی رفتار زیادہ تیز ہوتی ہے بہ نسبت اُس رفتار کے جس سے میرا ہاتھ بڑھ رہا تھا۔ اس رات سے پہلے میں کبھی اپنی طاقت اور اپنی عقلمندی کا اندازہ نہ کرسکا۔ میں اپنی مسرت کے احساس کو بہ مشکل ضبط کر رہا تھا۔ ذرا سوچو تو سہی کہ میں اس کے دروازے کو آہستہ آہستہ کھول رہا تھا اور اس کو میرے اِن پوشیدہ افعال و خیالات کی خواب میں بھی خبر نہ تھی۔ اِن ہی خیالات میں میری ہنسی نہ رُک سکی، شاید اس نے مجھے ہنستے ہوئے سُن لیا، کیونکہ میں نے دیکھا کہ اس کے جسم کو ایک فوری حرکت ہوئی جیسے کوئی چونک پڑے۔ تمہارا خیال ہوگا کہ اب میں پیچھے ہٹ گیا ہونگا...... مگر نہیں اس کے کمرے کی تاریکی کسی سیاہ غار کے اندھیرے سے بھی بڑھ کر تھی۔ کیونکہ اس نے چوروں کے ڈر سے تمام کھڑکیاں بند کر رکھی تھیں۔ اِس لئے میں جانتا تھا کہ دروازے کی درز اُسے دکھائی نہیں دیتی۔ اور میں اسے برابر کھولتا رہا۔ کھولتا رہا۔

میرا سر اب دروازے کے اندر تھا۔ اور قریب تھا کہ میں لالٹین کو کھول دوں۔ جب میرا انگوٹھا ٹین کی کنڈی پر سے اچٹا اور بوڑھا اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اور بولا "کون ہے"؟

میں خاموش رہا اور کچھ جواب نہ دیا۔ پورے ایک گھنٹے تک میں نے اپنے ایک عضو کو بھی نہ ہلایا اور اس عرصہ میں مجھے اس کے لیٹنے کی آواز بھی نہ آئی۔ وہ ابھی تک بستر میں بیٹھا آہٹ پر کان لگائے سُن رہا تھا...... بالکل اس طرح جیسے میرے اپنے کان شب بہ شب موت کی گھڑیوں کی کھٹ کھٹ کو سنتے رہتے تھے۔

عین اس وقت اس کے کراہنے کی ایک ہلکی سی آواز میرے کان میں پڑی! اور میں نے پہچان لیا کہ یہ خطرۂ موت کی آواز ہے۔ یہ درد و الم کے اظہار کی آواز نہیں تھی...... نہیں نہیں۔ یہ روح کی گہرائیوں کی وہ دبی ہوئی دھیمی صدا تھی جو کسی خطرۂ عظیم سے مغلوب ہوکر نکلتی ہے۔ میں اِس آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ راتوں کو آدھی رات کے قریب جب تمام دنیا سوئی ہوتی تھی یہ میرے دل

میں سے ایک چشمے کی طرح اُبلتی تھی - اور پھر اس کی صدائے بازگشت ان ہستیوں کو جو مجھے مضطرب و پریشان رکھتی تھیں قلب کی گہرائیوں میں ڈباتی چلی جاتی تھی - میں نے کہا ہے کہ میں اس آواز کو اچھی طرح جانتا تھا - میں بوڑھے کے احساسات کو جانتا تھا اور مجھے اس کے حال پر رحم آتا تھا - گو دل میں مجھے اس پر ہنسی آرہی تھی - میں جانتا تھا کہ وہ اُس وقت سے جاگ رہا ہے جب ایک ہلکا سا کھٹکا ہُوا تھا اور اس نے بستر میں پہلو بدلا تھا اس وقت سے اِس کا خوف بڑھتا چلا جارہا تھا - وہ اِس خوف کو بے بنیاد تصور کرنے کی کوشش کر رہا تھا - مگر یہ اُس کے بس کی بات نہ تھی - وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا " یہ محض دُودکش میں سے ہوا کے گزرنے کی آواز ہے یا شاید کوئی چوہا فرش پر سے گزر رہا ہے یا کوئی جھینگر ہے جو ایک ہی مرتبہ بول کر خاموش ہو گیا ہے "- ہاں وہ اِن مفروضات سے اپنے دل کو تسلی دے رہا تھا مگر یہ تسلیاں اُسے بے مصرف معلوم ہو رہی تھیں، بے مصرف، کیونکہ موت اپنا سیاہ سایہ اُس کے سامنے گاڑ کر کھڑی تھی اور اس کو اپنے دامن میں لپیٹ رہی تھی - اور یہ اُس نظر نہ آنے والے سائے کا ماتمی اثر تھا جو اُسے محسوس کرا رہا تھا ...... گو نہ وہ سنتا تھا نہ دیکھتا تھا .... مگر کمرے میں میرے سر کی موجودگی کو محسوس کرا رہا تھا -

جب میں نہایت صبر کے ساتھ بڑی دیر تک انتظار کر چکا مگر وہ نہ لیٹا تو میں نے تھوڑا سا .... لالٹین میں بہت ہی تھوڑا سا شگاف کرنے کا فیصلہ کر لیا - چنانچہ میں نے اُسے کھولا .... تم تصور نہیں کر سکتے کہ کتنے نامعلوم، نامعلوم طریقے سے میں نے اُسے کھولا یہاں تک کہ آخر کار ایک ہلکی سی شعاع تارِ عنکبوت کی مانند باریک اس میں سے چھوٹی اور کرگس نما آنکھ پر پڑی؟ وہ کھلی تھی .... بالکل، بالکل کھلی .... اور جونہی میری نظر اُس پر پڑی مجھے طیش آگیا - میں نے اُسے کامل صفائی کے ساتھ دیکھا - اُس کی دھندلی نیلاہٹ نے جس پر ایک بھیانک پردہ پڑا ہُوا تھا - میرے مغزِ استخواں تک کو منجمد کر دیا - بوڑھے کے چہرے یا جسم کی اور

کوئی چیز مجھے دکھائی نہ دی۔ گویا میں نے اس شعاع کو قصداً ٹھیک اسی منحوس مقام پر ڈالا تھا۔

اور اب ...... کیا میں تمہیں یہ بتا نہیں چکا کہ جسے تم غلطی سے دیوانہ پن سمجھتے ہو وہ در اصل حواس کی تیزی ہے .... اب میرے کانوں میں ایک ہلکی، دھیمی اور تیز سی آواز آنے لگی، جیسی کسی روئی میں لپٹی ہوئی گھڑی میں سے آئے۔ میں اس آواز کو بھی اچھی طرح پہچانتا تھا، یہ بوڑھے کے دل کی دھڑکن تھی، جس سے میرا غصہ اس طرح بھڑکا جیسے ڈھول پر چوٹ پڑنے سے سپاہی کی شجاعت جوش میں آتی ہے۔

مگر میں پھر بھی رُکا رہا اور ذرا نہ ہلا۔ بہ مشکل میں سانس لے رہا تھا۔ لالٹین میرے ہاتھ میں بے حرکت تھی۔ میں دیکھتا تھا کہ میں کب تک اس شعاع کو اس آنکھ پر جمائے رکھ سکتا ہوں، اتنے میں اُس کے دل کی جہنمی آواز بڑھ گئی وہ ہر لحظہ تیز سے تیز تر اور بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ یقیناً بوڑھے پر بے انتہا خوف طاری ہو رہا تھا۔ میری باتوں کو توجہ سے سُن رہے ہو؛ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں ذکی الحس ہوں، ہاں میں ذکی الحس ہی ہوں اور آدھی رات کی اُس گھڑی میں، اس قدیم امکان کی خوفناک خاموشی کے درمیان ایسے عجیب وغریب شور نے مجھ پر ناقابل ضبط حد تک دہشت طاری کر دی۔ تاہم چند لمحوں تک اور میں ساکت و صامت کھڑا رہا۔ لیکن دل کی حرکت بلند تر سے بلند تر ہوتی گئی میں نے سمجھا کہ یہ دل ضرور پھٹ جائے گا۔ اور اب مجھے ایک نئی فکر دامن گیر ہوئی ...... کہیں اس آواز کو کوئی ہمسایہ نہ سُن پائے۔ بوڑھے کی موت اُس کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ ایک نعرہ مار کر میں نے لالٹین کو کھول دیا اور اُچھل کر کمرے میں آ رہا۔ ایک چیخ اُس کے مُنہ سے نکلی .....

بس ایک پل میں میں نے اُسے فرش پر گرا لیا اور اس کے بوجھل پلنگ کے نیچے اُسے دبا دیا۔ پھر میں خوش ہو کر مسکرایا کہ اتنا کام تو بخوبی انجام پا گیا۔ مگر کئی منٹ تک اُس کے دل کی دبی ہوئی آواز آتی رہی۔ لیکن اس سے مجھے بالکل پریشانی نہ ہوئی، کیونکہ اسے دیوار کے پار کوئی نہ سُن سکتا تھا۔ آخر کار

اس کا دِل ٹھیر گیا۔ بوڑھا مر چکا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے دِل پر رکھا اور بہت دیر تک اسے وہاں سے نہ اُٹھایا۔ وہاں کوئی حرکت نہ تھی۔ وہ مر چکا تھا۔ اب آئندہ اُس کی آنکھ مجھے نہ ستا سکتی تھی۔

اگر اب بھی تم مجھے دیوانہ سمجھتے ہو تو تم ایسا نہ سمجھو گے۔ جب میں تمہیں بتاؤں گا کہ اس کی نعش کو چھپانے کے لئے میں نے کیا کیا احتیاطیں کیں۔ رات گھٹتی چلی جاتی تھی اور میں سرعت سے مگر خاموشی کے ساتھ اپنا کام کئے جاتا تھا۔ سب سے پہلے میں نے نعش کا بند بند جدا جدا کر دیا۔ میں نے اس کا سر اس کے بازو اس کی ٹانگیں الگ کر دیں۔

پھر میں نے کمرے کے فرش کے تین تختے اُکھاڑے اور اس کے اعضا کو اُن کے نیچے دفن کر دیا۔ پھر میں نے تختوں کو اپنی جگہ پر اس خوبی سے اور اس صفائی سے جڑ دیا کہ کوئی انسانی آنکھ .... خواہ وہ وہی آنکھ کیوں نہ ہوتی .... اس میں نقص نہیں نکال سکتی تھی کسی قسم کا کوئی دھبّا، کوئی لہو کا نشان باقی نہ تھا۔ میں نے بہت ہوشیاری سے کام لیا تھا۔ پانی کے ایک ٹب نے تمام مشکل حل کر دی۔ ہاہاہا۔

جب میں اس سارے کام کو انجام تک پہنچا چکا اس وقت چار بج رہے تھے مگر تاریکی کو دیکھو تو ابھی آدھی رات معلوم ہوتی تھی، اُدھر گھنٹی نے چار بجائے اور اِدھر گلی کے دروازے کو کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں ایک مطمئن دِل کے ساتھ دروازہ کھولنے چلا گیا .... کیونکہ مجھے اب ڈر ہی کیا تھا؟ تین آدمی اندر داخل ہوئے۔ جنہوں نے نرمی کے ساتھ اپنا تعارف اس طرح کرایا کہ وہ پولیس کے افسر ہیں۔ رات کو کسی ہمسائے نے ایک چیخ سُن پائی تھی۔ اُسے کسی حادثہ کا شبہ ہوا تھا اور وہ (پولیس کے افسر) اسی معاملہ کی تفتیش کے لئے آئے تھے۔

میں مسکرایا ...... کیونکہ مجھے ڈر ہی کس بات کا تھا؟ میں نے ان کو خوش آمدید کہی۔ وہ چیخ میں نے اُن کو بتایا کہ میری اپنی تھی جو حالتِ خواب میں میرے منہ سے نکل گئی تھی۔ بوڑھے

کی نسبت میں نے کہا کہ وہ شہر سے کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ میں نے انہیں گھر کا چپہ چپہ دکھا دیا۔ اور اُن سے پوری پوری دیکھ بھال کرنے کی استدعا کی۔ آخر میں اُن کو بوڑھے کے اپنے کمرے میں لے گیا میں نے اُن کو اس کا تمام مال واسباب مامون و مصئون دکھا دیا۔ اپنے جوشِ یقین میں میں وہیں کرسیاں لے آیا اور اسی کمرے میں ان سے آرام کرنے کو کہا۔ اپنی کامیابی کے وحشیانہ جوش میں میں نے خود اپنی کرسی اس جگہ بچھائی جس کے نیچے مقتول کی نعش مدفون تھی۔ افسروں کی تشفی ہو گئی۔ میرے طرزِ عمل نے انہیں مطمئن کر دیا۔ مجھے بھی اطمینان ہو گیا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور میں خوش اخلاقی سے انہیں جواب دیتا رہا۔ مگر کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا ہوگا کہ مجھ پر زردی چھانے لگی اور میں نے چاہا کہ وہ اُٹھ کر چلے جائیں۔ میرا سر چکرانے لگا اور کھٹ کھٹ کی آواز میرے کانوں میں آنے لگی مگر وہ بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ آواز زیادہ صاف ہوتی گئی ...... وہ مسلسل آتی رہی اور زیادہ واضح ہوتی گئی۔ اِس کے احساس سے نجات پانے کے لئے میں اور آزادی سے گفتگو کرنے لگا مگر آواز جاری رہی اور اب اُس۔ نے قطعیت اور واقعیت کا درجہ حاصِل کر لیا۔

یہاں تک کہ آخر کار میں سمجھ گیا کہ آواز میرے کانوں کے اندر پیدا نہیں ہو رہی بلکہ کہیں باہر سے آ رہی ہے۔

بلا شبہ اب میرا لہو خشک ہو رہا تھا۔ لیکن میری گفتگو میں اور روانی پیدا ہو رہی تھی۔ اور میں بلند آواز سے بول رہا تھا۔ کھٹ کھٹ کی آواز بڑھتی جاتی تھی ...... اور میں بے بس تھا۔ یہ ایک ہلکی دبی ہوئی تیز آواز تھی۔ جو روئی میں لپٹی ہوئی گھڑی کی آواز سے بہت کچھ ملتی تھی میرا دم رُکنے لگا مگر افسروں کو اس کا پتہ نہ چلا۔ میں اور تیزی اور تندی سے باتیں کرنے لگا، مگر وہ آواز برابر بڑھتی گئی۔ وہ کیوں نہیں چلے جاتے؟ میں نے اُٹھ کر بھاری بھاری قدموں سے

اِدھر اُدھر چلنا شروع کیا۔ جیسے مجھے ان کی طرف دیکھ دیکھ کر غصہ آرہا تھا مگر وہ آواز برابر بڑھتی گئی۔ خدایا! میں کیا کر سکتا تھا؟ میرے منہ میں کف بھر آیا۔ میں نے دیوانوں کی طرح چلانا شروع کیا، توبہ، استغفراللہ! جس کرسی پر میں بیٹھا تھا۔ اسے میں اِدھر اُدھر گھسیٹنے لگا۔ اور پھر اس کو ان تختوں پر رگڑنے لگا مگر آواز کسی طرح نہ دبی اور بڑھتی گئی۔ یہ بلند.......... بلند تر.......... بلند تر ہوتی گئی! اور وہ لوگ پھر بھی خوشی خوشی باتیں کرتے اور مسکراتے رہے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ انہیں آواز نہ آتی ہو۔ اے میرے اللہ!.......... نہیں، نہیں! وہ سنتے تھے!.......... اُن کے شبہات بڑھتے جاتے تھے۔!.......... وہ سب کچھ جانتے تھے! وہ میرے خوف پر تمسخر اڑا رہے تھے یہی میں اس وقت خیال کرتا تھا اور یہی اب خیال کرتا ہوں، لیکن دنیا کا ہر درد و کرب اس پریشانی سے بہتر ہوگا۔ دنیا کی ہر مصیبت اس تضحیک و تمسخر سے زیادہ قابلِ برداشت ہوگی! میں ان کی مکارانہ مسکراہٹوں کی بالکل تاب نہ لا سکا! مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں چیخیں ماروں گا یا مر جاؤں گا! اور اب.......... پھر!.......... وہی آواز بلند..... بلند تر.......... بلند تر ہوتی گئی +

"کمینو! مفسدہ پردازو"۔ میں نے چلا کر کہا "چھوڑ دو اس مکر و فریب کو! میں اقرارِ جرم کرتا ہوں! تختوں کو اکھاڑ لو!.......... یہاں، اِس جگہ! یہیں اس کا مکروہ دل دھڑک رہا ہے" +

"ایڈگر ایلن پو"

جرمنی

پھول

دوپہر کے بعد سے شام تک میں گلیوں میں گھومتا رہا۔ فضا میں سے برف کے بڑے بڑے گالے آہستہ آہستہ گرتے رہے ——— اور اب میں اپنے گھر میں ہوں۔ میرا لیمپ جل رہا ہے، میں نے سگار سلگا لیا ہے اور میری کتابیں میرے پاس پڑی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام چیزیں مجھے حاصل ہیں جو میری تسکینِ خاطر کا باعث ہو سکتی ہیں مگر یہ سب بے کار ہیں۔ میرے دماغ میں تو صرف ایک ہی خیال سما سکتا ہے۔

لیکن کیا میرے لئے وہ مدتوں سے مر نہیں چکی تھی؟ ——— ہاں، مر چکی تھی، یا جیسا کہ میں فریب خوردگی کے طفلانہ جوش میں کہا کرتا تھا "مُردوں سے بدتر تھی"۔ اور اب جب کہ میں جانتا ہوں کہ وہ "مُردوں سے بدتر" نہیں، بلکہ صرف مُردہ ہے۔ بہت سے دُوسروں کی طرح جو خاک کے نیچے ہمیشہ کے لئے سوتے ہیں ——— اس دنیا میں واپس آنے کی اُمید کے بغیر ——— بہار ہو یا تپتی دُھوپ یا برف باری ہو رہی ہو، جیسی کہ آج ہو رہی ہے، اب میں نے جانا ہے کہ وہ میرے لئے اُس وقت سے ایک لمحہ بھی پیشتر نہ مری تھی جب وہ باقی دنیا کے لئے مری۔ غم؟ ——— نہیں یہ تو محض وہ عام خوف ہے جسے ہم اُس وقت محسوس کرتے ہیں جب کوئی ایسی ہستی جس کی جگہ ہمارے دل میں موجود ہوتی ہے اور جس کا وجود کلیتہً اور صراحتہً ہمارے خیال میں محفوظ ہوتا ہے، قبر میں جا سوتی ہے۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھے دھوکا دے رہی ہے تو مجھے سخت رنج ہوا۔ مگر اس رنج کے ساتھ بہت سی اور چیزیں بھی تھیں، غصہ اور فوری نفرت، زندگی سے وحشت اور ——— آہ ——— غیرت کی شکست ——— غم تو بعد میں آیا! لیکن اس وقت یہ دلجمعی تو تھی کہ وہ بھی میری ہی طرح مضطرب ہوگی۔ وہ تمام اب تک میرے پاس ہیں اور میں جب چاہوں اُن کو پڑھ سکتا ہوں ——— اُن بیسیوں خطوں کو جن میں اُس نے نہایت عاجزی سے معافیاں مانگی ہیں! ——— اور میں اپنی چشمِ تصوّر سے اب بھی اُسے دیکھ سکتا ہوں ——— اُسی طرح اُسی سیاہ لباس میں گلی کے ایک کونے پر، جب میں شام کے وقت اپنے مکان سے باہر نکلا اور وہ مجھے حسرت زدہ نظروں سے تک رہی تھی ——— اور میرے خیال میں اُس آخری ملاقات کی یاد اب تک تازہ ہے جب اُس کی وہ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں میرے سامنے تھیں جو اُس کے گول بچوں کے سے چہرے میں ہیروں کی طرح جڑی تھیں ——— وہ چہرہ جس پر اب زردی چھا گئی تھی اور جو اب مرجھا گیا تھا ——— اور جب وہ جانے لگی ——— جب وہ آخری مرتبہ جانے لگی تو میں نے اُس کے لئے اپنا ہاتھ تک نہ بڑھایا ——— اور پھر اپنی کھڑکی میں دیر تک اُسے گلی میں سے گزرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ میری نظروں سے غائب ہوگئی ہمیشہ کے لئے ——— اور اب وہ کبھی واپس نہ آسکے گی.........

مجھے اُس کی موت کا علم اتفاقاً ہی ہوا، ورنہ شاید ہفتوں اور مہینوں مَیں بے خبر رہتا۔ ایک دن صبح کے وقت مجھے اُس کا ماموں مِلا۔ میں نے اُسے کم از کم ایک سال کے بعد دیکھا ہوگا۔ کیونکہ وہ دیہاتا کبھی کبھی آتا ہے۔ اس سے پہلے بھی میں اُس سے بس دو یا تین مرتبہ مِلا ہوں گا۔ ہماری پہلی ملاقات آج سے تین سال قبل ہوئی تھی۔ اس موقع پر وہ بھی موجود تھی اور اُس کی ماں بھی اور پھر آتی گرمیوں میں مَیں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا اور ہمارے ساتھ کی میز پر اُس کا ماموں چند اور آدمیوں کے ساتھ موجود تھا۔ وہ سب خوش بخوش تھے اور اُس نے میرا جامِ صحت پیا۔ جانے سے

پہلے وہ میرے پاس آیا اور رازداری کے لہجہ میں کہنے لگا کہ میری بھانجی کو تم سے بڑی محبت ہے ——
اور اپنی نیم مخموری کی حالت میں مجھے یہ بات بڑی مضحکہ خیز اور عجیب معلوم ہوئی کہ آخر اس قسم کی گفتگو کا یہ کونسا محل تھا اور پھر مجھ سے بہتر اس حقیقت کو اور کون جانتا تھا جس کی آنکھیں اُس کی محبت کے آخری جام سے ابھی سرشار تھیں - اور اب، آج صبح! میں اُس کے پاس سے گذر رہی چلا تھا کہ میں نے ازراہِ دلچسپی نہیں بلکہ ازراہِ اخلاق اُس کی بھانجی کے متعلق دریافت کیا - اب میں اُس کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا - مدت ہوئی اُس سے نامہ و پیام کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا - صرف پھول وہ مجھے بھیجتی تھی - ہمارے مسرور ترین دِنوں کی یادگار! مہینے میں ایک مرتبہ وہ آتے تھے - اُن کے ساتھ کوئی پیغام نہ ہوتا تھا، محض خاموش، نیاز آگیں پھول —— جب میں نے اُس سے سوال کیا - تو وہ حیران رہ گیا " تمہیں معلوم نہیں وہ بیچاری تو ایک ہفتہ ہوا مر گئی - مجھے ایک دھچکا سا لگا - پھر اُس نے مجھے اور باتیں بتائیں " وہ مدت سے بیمار تھی - مگر بستر پر وہ بمشکل ایک ہفتہ رہی ہو گی" - اور اُس کا مرض؟ " سودا —— خفقان —— مالیخولیا —— لیکن ڈاکٹر بھی اُس کی صحیح تشخیص نہ کر سکے "

وہ چلا گیا مگر میں دیر تک وہیں سکتہ کے عالم میں کھڑا رہا - میں اتنا ناتوان ہو گیا تھا جیسے کسی جان جوکھوں میں سے گزرا ہوں —— اور اب مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج میری زندگی کا ایک دور ختم ہو گیا ہے - کیوں —— کیوں؟ یہ محض ایک خارجی بات تھی - میرے دِل میں اُس کے لئے اب کوئی جذبہ نہ تھا - درحقیقت مجھے اب شاذونادر ہی اُس کا خیال آتا تھا - مگر اب بھی جب کہ میں یہ سب کچھ لکھ چکا ہوں میں اپنی حالت کو بہتر پاتا ہوں - میرا دل مطمئن ہے اور مجھے اپنے گھر کا چین اور آرام محسوس ہو رہا ہے —— حقیقت میں اب اس کے خیال کو دِل میں جگہ دینا نادانی ہے اور دُکھ خریدنا ہے —— یقیناً دنیا میں ہزاروں ایسے ہیں جو مجھ سے زیادہ دُکھی ہیں +

میں سیر کرکے آیا ہوں۔ آج موسم سرما کا ایک شاندار دن ہے۔ آسمان زیادہ نیلا، زیادہ سرد اور زیادہ دور معلوم ہو رہا ہے ــــــ اور میں اپنے آپ میں سکون پاتا ہوں۔ اُس کے بوڑھے ماموں سے میں ابھی کل ملا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس واقعے کو ہفتوں گزر گئے ہیں۔ اور جب میں اُس کا خیال کرتا ہوں تو وہ مجھے بالکل صاف نظر آتی ہے۔ صرف ایک چیز کم ہوتی ہے! وہ غصہ جو ہمیشہ اُس کے خیالات کے ساتھ شامل ہوا کرتا تھا۔ اِس بات کا مجھ پر کوئی اثر نہیں کہ اب وہ تنہا قبر میں سو رہی ہے اور صفحۂ ہستی پر موجود نہیں ــــــ مجھے اس کا کوئی غم نہیں۔ دنیا آج مجھے زیادہ پُرسکون معلوم ہوتی ہے۔ ایک دفعہ صرف ایک لمحہ کے لئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ نہ تو راحت ہی کا کوئی وجود ہے اور نہ رنج کا، رنج و راحت ہماری تصویرِ حیات کے دو رُخ ہیں، ہم ہنستے ہیں، ہم روتے ہیں اور ہماری روح اِن کیفیات کو محسوسات کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے۔ میں اب اطمینان سے بیٹھ کر دقیق علمی کتابیں پڑھنے کے قابل ہوں اور اُن کے عمیق نکات سمجھ لینے کی مجھ میں تاب پیدا ہو گئی ہے۔ میں اُن قدیم تصاویر کے سامنے کھڑا ہو کر اُن کے حقیقی حسن کو دیکھ سکتا ہوں۔ جن کے آج سے پہلے میری نگاہ میں کوئی معنی ہی نہ تھے ــــــ اور جب میں بعض اُن دوستوں کا خیال کرتا ہوں جو مر چکے ہیں تو میرا دل اِتنا غمگین نہیں ہوتا جتنا وہ کبھی ہوا کرتا تھا ــــــ موت سے میں کچھ مانوس ہو چکا ہوں۔ موت ہم پر مسلط ہے لیکن وہ ہمیں کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتی +

~~~~~~~~

برف، بلند سفید برف ہر چیز پر محیط تھی۔ گریٹل آئی اور اس نے کہا۔ آؤ ذرا برف کی سیر کریں ہم ایک ثلج گاڑی میں بیٹھ کر شہر سے باہر نکل گئے۔ گاڑی ڈھلوان سڑک پر گھنٹیاں بجاتی ہوئی اُڑی چلی گئی۔ آسمان ایک نیلگوں زمرد کی طرح بن رہا تھا۔ گریٹل میرے کندھے سے سہارا لگائے طویل سڑک کو اپنی مسرور آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ہم ایک سرائے میں آ گئے جیسے ہم گرمی کے
~~~~~~~~

زمانے سے جانتے تھے۔ انگیٹھی دہک رہی تھی اور اس قدر گرم تھی کہ ہمیں اپنی میز وہاں سے سرکانی پڑی۔ کیونکہ گرٹیل کا ایک رخسار اور کان آگ کی مانند سُرخ ہو رہے تھے۔ مجھے اُس کے دوسرے زرد رخسار پر رہ رہ کر پیار آرہا تھا۔ اِس کے بعد شام کے قریب جب شفق پھُولی ہوئی تھی ہم واپس گھر آگئے۔ گرٹیل میرے قریب بیٹھی تھی اور میرے دونوں ہاتھ اُس کے ہاتھوں میں تھے —— پھر اُس نے کہا " آخر میں نے پھر تمہیں پالیا ہے "۔ اُس نے یوں بلا تکلف وہ شیریں نغمہ چھیڑ دیا تھا جو حقیقت میں میری مسرت کا تنہا کفیل تھا۔ لیکن شاید یہ سرد و صاف ہوا کا اثر بھی ہے کہ میرے خیالات ہر قید سے آزاد ہوئے ہیں کیونکہ میں گزشتہ چند دنوں کی بہ نسبت زیادہ اطمینان محسوس کر رہا ہوں

تھوڑی دیر گزری جب میں اپنے بستر پر اونگھ رہا تھا مجھے پھر ایک عجیب خیال آیا۔ مجھے اپنا دل سخت اور سرد محسوس ہونے لگا۔ اس طرح جیسے کوئی اپنے کسی محبوب کی قبر پر کھڑا ہو اور اُس کی آنکھیں خشک ہوں اور سینہ جذبات سے خالی، اس طرح جیسے کوئی اتنا بے حس ہو گیا ہو کہ وہ موت کے خوف سے بیگانہ ہو گیا ہو —— بیگانہ، ہاں بیگانہ۔

رفت و گزشت ہو چکی! زندگی، مسرت اور تھوڑی سی محبت نے اُس ساری حماقت کو محو کر دیا۔ اب میں پھر لوگوں سے آزادانہ ملتا ہوں۔ میں اُن سے مانوس ہو چلا ہوں۔ وہ بے ضرر ہیں۔ وہ ہر قسم کے خوش آئند موضوعات پر گفتگوئیں کرتے ہیں۔ اور گرٹیل کیسی پیاری اور اچھی لڑکی ہے۔ جب وہ میری کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے اور سُورج کی کرنیں اس کے سنہری بالوں پر چمکتی ہیں تو وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی ہے +

آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا ـــــ آج وہ دِن ہے جب وہ ہمیشہ پھول بھیجا کرتی تھی ۔ اور پھول پھر آگئے جیسے ـــ جیسے کوئی تبدیلی ہی واقع نہیں ہوئی ۔ وہ پہلی ہی ڈاک میں آئے اور ایک لمبے تنگ، اور سفید ڈبے میں بند تھے ۔ ابھی صبح ہوئی ہی تھی اور ابھی میری آنکھیں خواب آلود تھیں ۔ مجھے ایک دھکا سا لگا ۔ میرے سامنے ایک سنہری دھاگے سے نفاست کے ساتھ بندھے ہوئے کاسنی اور گلابی پھول تھے ـــــ اور اِس طرح جیسے وہ کسی تابوت میں پڑے ہوں اور جب میں نے انہیں ہاتھ میں لیا تو میرا دِل کانپ گیا ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ آج پھر کیسے آ گئے ۔ جب وہ بیمار ہوئی ہوگی ، یا شاید جب اُس نے موت کو قریب پایا ہوگا تو اُس نے حسبِ معمول گلفروش سے پھول بھیجنے کو کہہ دیا ہوگا تاکہ میں اُس کی توجہات کو کھو نہ بیٹھوں ۔ یقیناً اس کی یہی توضیح ہو سکتی ہے ، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن دِل اِس سے متاثر ضرور ہوتا ہے ـــــ وہ ابھی میرے ہاتھ میں تھے ، وہ پھول اور انہوں نے سر ہلانا اور کانپنا شروع کیا ، اُس وقت باوجود عقل و فراست اور قوتِ ارادہ کے مجھے اُن سے ڈر آنے لگا ۔ مجھے یوں معلوم ہونے لگا جیسے یہ اُسی کے پاس سے آئے ہیں ۔ جیسے یہ اُس کا تحفہ ہیں ـــ جیسے وہ ہمیشہ ـــ اس حال میں بھی کہ وہ مر چکی ہے مجھ پر اپنی محبت جتانا چاہتی ہے ۔ اپنی سُست عناصر وفا ۔ آہ ! ہم موت کو نہیں سمجھتے ۔ ہم اُسے کبھی نہ سمجھ سکینگے ۔ حقیقت میں کوئی شخص اُس وقت مرتا ہے جب وہ سب جو اُسے جانتے ہیں دنیا سے چل بستے ہیں معمول کے خلاف اِن پھولوں پر میری گرفت کا انداز آج مختلف تھا ۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میری ذرا سی بے احتیاطی بھی انہیں زخمی کر دے گی ـــــ جیسے ابھی اُن کی روحیں ہلکی ہلکی سسکیاں بھرنے لگیں گی اور اب جب کہ وہ میرے سامنے میری میز پر ایک ہلکے سبز رنگ کے تنگ سے گلدان میں پڑے ہیں وہ مجھے ماتم انگیز تشکر میں اپنے سر ہلاتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ بے حاصل آرزو کا ایک بادل سا درد بن کر اُن پر سے اُٹھتا ہے اور مجھ پر چھا جاتا ہے ۔ اور میں سمجھتا ہوں

اگر اُن چیزوں کے علاوہ جو بولتی ہیں ہم تمام زندہ چیزوں کی زبان جانتے۔ تو وہ مجھ سے ضرور کچھ کہتے۔

میں اب احمق نہ بنوں گا۔ وہ محض پھول ہیں۔ وہ عہدِ ماضی کا ایک پیغام ہیں۔ قبر سے بلاوا یقیناً نہیں۔ وہ بس پھول ہیں کسی گل فروش نے اُن کو ایک جگہ باندھا۔ روئی کا ٹکڑا اُن کے اردگرد لپیٹا۔ پھر ایک سفید ڈبے میں رکھ کر ڈاک کے حوالے کر دیا —— اور اب وہ یہاں رکھے ہیں، کیوں مجھے اُن کا خیال نہیں چھوڑتا۔

میں گھنٹوں کھلی ہوا میں گزار دیتا ہوں اور طویل اور تنہا سیریں کرتا ہوں۔ جب میں لوگوں کے درمیان ہوتا ہوں تو میری طبیعت اُن سے نہیں ملتی۔ اور میں اس کو اُس وقت محسوس کرتا ہوں جب وہ حسین و جمیل لڑکی میرے کمرے میں بیٹھ کر طرح طرح کی باتیں کرتی ہے اور مجھے خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ جب وہ جا چکتی ہے تو ایک لمحہ بھی نہیں گزرتا کہ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مجھ سے میلوں دُور ہے، جیسے لوگوں کا سیلاب اُسے بہا کر لے گیا ہے اور اُس کا کوئی نشان پیچھے نہیں چھوڑ گیا۔ اب اگر وہ لوٹ کر نہ آئے تو شاید مجھے بالکل تعجب نہ ہو۔

پھول لمبے سبز گلدان میں ہیں۔ اُن کی ڈنڈیاں پانی میں ہیں اور اُن کی خوشبو کمرے میں پھیل رہی ہے۔ خوشبو ابھی تک اُن میں موجود ہے —— باوجودیکہ انہیں میرے پاس ایک ہفتہ ہو گیا ہے اور وہ مرجھا رہے ہیں اور میں اُن تمام فضولیات پر یقین رکھتا ہوں جن پر کبھی ہنسا کرتا تھا؛ مجھے یقین ہے کہ میں بادلوں اور بہاروں سے نامہ و پیام کر سکتا ہوں؛ اور میں منتظر ہوں کہ پھول ابھی بولنے لگیں گے۔ لیکن نہیں مجھے تو یقین ہے کہ وہ ہر وقت بولتے

ہیں، اب بھی وہ بول رہے ہیں۔ وہ ہر لحظہ بولتے ہیں اور میں اُن کی زبان کو بڑی حد تک سمجھ لیتا ہوں۔

میں خوش ہوں کہ موسمِ سرما ختم ہو چکا ہے! ہوا میں مجھے بہار کی سانس چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مجھ میں پہلے کی بہ نسبت کچھ زیادہ تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، پھر بھی میں دیکھتا ہوں کہ میرے وجود کی حدیں وسیع ہو رہی ہیں۔ کل کا گزرا ہوا دن مدتِ مدید معلوم ہوتا ہے اور پچھلے دنوں کے چند واقعات بھولے بسرے خواب نظر آتے ہیں۔ جب گرٹیل مجھ سے رخصت ہوتی ہے تو اب بھی مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، خصوصاً جب اُسے ملے کچھ روز گزر جاتے ہیں تو ہماری محبت ایک پارینہ داستان معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ دور، بڑی دور سے آتی ہے! ——— لیکن جب وہ باتیں شروع کرتی ہے تو پُرانے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اُس وقت مجھے موجودہ زمانے کا صاف صاف احساس ہوتا ہے۔ پھر اُس کی آواز بلند رہتی جاتی ہے اور اشیا کے رنگ تیز و تلخ نظر آنے لگتے ہیں۔ مگر جب وہ چلی جاتی ہے تو اُس کے ساتھ ہر چیز رخصت ہو جاتی ہے۔ میرے تصور میں کوئی تصویر کوئی یاد باقی نہیں رہتی اور پھر بس ہوتا ہوں اور یہ پھول۔ یہ اب مرجھا گئے ہیں بالکل مرجھا گئے ہیں۔ اب ان میں قطعاً خوشبو نہیں رہی۔ گرٹیل نے ان کو اب تک نہیں دیکھا تھا۔ لیکن آج جب اُس کی نظر اُن پر پڑی تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ ان کے بارے میں مجھ سے کچھ دریافت کرنا چاہتی ہے۔ لیکن یکایک کسی پُر اسرار خوف نے اُس پر غلبہ پا لیا! ——— اُس کی زبان پر مہرِ سکوت لگ گئی اور وہ اسی وقت مجھ سے رخصت ہو گئی +

پنکھڑیاں آہستہ آہستہ گر رہی ہیں۔ میں نے ان کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا! اگر میں لگاتا۔ تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتیں۔ اُن کو مرجھائے ہوئے دیکھ کر میرا غم بڑھتا ہے۔ میں نہیں جانتا کیوں اس

نادانی کا خاتمہ کرنے کی جرأت مجھ میں نہیں ہے۔ مُرجھائے ہوئے پھُولوں نے مجھے بیمار کر دیا ہے
میں اُن کے سامنے ٹھیر نہیں سکتا اور میں باہر نکل جاتا ہوں۔ گلی میں پہنچ کر اُن کی حفاظت کی
خلش مجھے بیقرار کر دیتی ہے اور میں لوٹ آتا ہوں۔ اور اُن کو اس لمبے سے سبز گلدان میں پژمردہ
اور غمگین پاتا ہوں۔ کل شام میں اُن کے سامنے روتا رہا جیسے کوئی کسی قبر پر روتا ہے۔ تاہم ایک مرتبہ
بھی میرا خیال اُن کے بھیجنے والے کی طرف منتقل نہیں ہوا۔ شاید میں غلطی پر ہوں لیکن ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ گرٹیل بھی محسوس کرتی ہے کہ میرے کمرے میں کوئی اجنبی چیز موجود ہے۔ وہ اب ہنستی
نہیں۔ وہ اب بلند آواز سے نہیں بولتی —— اُس صاف، حیات انگیز آواز سے جسے میں
نے اکثر سنا ہے۔ اور اب میں اُس طرح اس کا استقبال نہیں کرتا جس طرح پہلے کیا کرتا تھا۔ میں
ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ مجھ سے کوئی سوال نہ کر بیٹھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوالات میرے لئے کتنے
درد و کرب کا موجب ہونگے ۔

وہ اکثر اپنا سینا پرونا یہیں لے آتی ہے۔ اور اگر میں ابھی کتابوں میں منہمک ہوتا ہوں۔ تو
وہ بھی میز پہ آکر بیٹھ جاتی ہے اور اپنے کام میں لگی رہتی ہے اور بڑے صبر سے انتظار کرتی ہے
یہاں تک کہ میں اپنا کام ختم کر کے کتابیں ایک طرف رکھ کے اُس کے پاس آتا ہوں اور سوئی دھاگا
اُس کے ہاتھ سے لے لیتا ہوں۔ پھر میں سبز سائے کو لیمپ پر سے اتار لیتا ہوں اور کمرے میں
سفید روشنی کا ایک سیلاب آجاتا ہے۔ مجھے تاریک کونے اچھے نہیں لگتے۔

بہار! میری کھڑکی چوپٹ کھُلی ہے۔ گزشتہ شام جب رات کا سایہ بڑھ رہا تھا گرٹیل اور میں
باہر گلی کی طرف جھانک رہے تھے۔ ہوا نرم اور خوشگوار تھی۔ اور جب گلی کے کونے پر میری نظر پڑی

جہاں لیمپ اپنی ہلکی سی روشنی پھیلا رہا تھا تو یکایک مجھے ایک سایہ نظر آیا۔ میں نے اُسے دیکھا۔ اور اپنی آنکھیں بند کر لیں، لیکن میری نظریں پلکوں میں سے گزر گزر کر اُس پر پڑنے لگیں۔ لمپ کی زرد روشنی میں وہ بیچارگی کی حالت میں کھڑی تھی، اور میں نے اُس کے چہرے کو صاف طور پر دیکھا، جیسے یہ زرد روشنی سورج کی روشنی تھی۔ اور مجھے اُس کے در د اترے ہوئے چہرے میں اُس کی بیمار آنکھیں بھی نظر آگئیں۔ میں کھڑکی سے ہٹ آیا اور اپنی میز کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ شمع ہوا میں جھلملانے لگی اور میں بے حرکت بیٹھا رہا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ بیچاری وہیں کونے میں منتظر کھڑی ہے اور اگر میں نے مرجھائے ہوئے پھولوں کو ہاتھ لگانے کی جرأت کی تو بے اختیار میں انہیں گلدان میں سے نکال کر اُس کے پاس لے جاؤں گا۔ یہی میں نے سوچا اور سچے دل سے سوچا۔ تاہم میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب نادانی ہے۔ اب گریٹل بھی کھڑکی سے ہٹ کر میری کرسی کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ جہاں وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھیری۔ میرے بالوں کو اُس نے اپنے ہونٹوں سے چھوا اور پھر چلی گئی۔ میں تنہا رہ گیا۔

میں پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اب مٹے جا رہے ہیں۔ صرف سُوکھی ہوئی بے برگ شاخیں باقی ہیں۔ وہ مجھے بیمار اور دیوانہ کیئے دیتی ہیں۔ اور یہ ایک ظاہر بات ہو گی۔ ورنہ گریٹل مجھ سے ضرور پوچھتی، لیکن وہ بھی اسے محسوس کرتی ہے۔ اب وہ بھاگ گئی ہے، یوں جیسے میرے کمرے میں روحوں کا بسیرا ہے۔

روحیں! ہاں، ہاں روحیں! مردہ چیزیں، زندوں سے کھیلتی ہوئیں! اور اگر مرجھائے ہوئے پھولوں کی خوشبو ہمیں آتی ہے تو یہ اُن گزرے ہوئے دنوں کی یاد دلاتی ہے۔ جب وہ

تازہ اور شگفتہ تھے۔ اور جو مر چکے ہیں وہ ہمارے پاس اُس وقت تک آتے رہتے ہیں۔ جب تک ہم اُنہیں بھول نہیں جاتے۔ کیا ہوا اگر اب وہ بول نہیں سکتے ——— میں اُن کی آواز سُن سکتا ہوں۔ وہ اب نظر نہیں آتی لیکن میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔ میرے کمرے کے باہر کی بہار، اور وہ دھوپ جو میرے کمبل پر پڑ رہی ہے۔ اور پھولوں کی وہ خوشبو جو باغیچہ سے آ رہی ہے۔ اور وہ لوگ جو میرے مکان کے نیچے سے گزر رہے ہیں۔ اور مجھے جن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کیا یہی حیات ہیں؟ اگر میں پردے کھینچ ڈالوں۔ تو آفتاب بے نور ہو جائے۔ اگر ان لوگوں کا خیال میں دل سے نکال دوں۔ تو میرے لئے وہ مردہ ہیں۔ اگر میں کھڑکی کو بند کر دوں تو پھولوں کی خوشبو منقطع ہو جائے اور بہار مردہ۔ میں سورج سے، لوگوں سے، بہار سے زیادہ طاقتور ہوں۔ لیکن گزرے ہوئے دِنوں کی یاد مجھ سے بھی زیادہ طاقتور ہے کیونکہ وہ جب چاہتی ہے آتی ہے اور اُس سے کوئی مفر نہیں۔ اور یہ خشک تیلیاں زیادہ طاقتور ہیں پھولوں کی اس مہک سے اور بہار سے۔

میں اِن صفحات پر دماغ سوزی کر رہا تھا جب گریٹل داخل ہوئی۔ وہ اتنی سویرے کبھی نہ آئی تھی۔ میں حیران و ششدر رہ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ دہلیز پر رُکی اور میں اُسے خاموش دیکھتا رہا۔ پھر وہ مسکرائی اور میرے پاس آ گئی۔ اُس کے ہاتھوں میں تازہ پھولوں کا ایک گلدستہ تھا۔ وہ کچھ بولی اور اُس نے گلدستہ کو میز پر رکھ دیا۔ دوسرے لمحے میں اُس نے خشک تیلیوں کو گلدان سے نکالا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرا دِل نکال لیا ہے! ——— لیکن میں کوئی آواز نہ نکال سکا اور جب میں نے اُٹھ کر اُس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو اُس نے مُسکرا دیا۔ پھولوں والے ہاتھ کو سر سے اونچا کئے ہوئے وہ کھڑکی کی طرف لپکی اور اُس نے اُن کو نیچے گلی میں گرا دیا۔ مجھ کو یوں محسوس ہوا جیسے میں بھی اپنے آپ کو اُن کے پیچھے گرا دینا چاہتا ہوں؛ لیکن اب گریٹل پلٹ کر میری طرف دیکھ

رہی تھی۔ اور اُس کے سر پر دھوپ، روشن دھوپ پڑ رہی تھی۔ اور بہار کے پھولوں کی خوشبو کھڑکی سے اندر آ رہی تھی۔ اور میں نے خالی سبز گلدان پر ایک نگاہ ڈالی! ——مجھے یقین تو نہیں تاہم میرا خیال ہے کہ میں نے اپنے آپ کو اُس وقت آزاد محسوس کیا، ہاں، آزاد۔ پھر گرٹیل میرے پاس آئی اُس نے اپنا گلدستہ اُٹھایا اور تر و تازہ سفید پھولوں کو میرے منہ کے قریب کر دیا۔ آہ، کتنی روح پرور اور جاں بخش خوشبو تھی، نرمی اور خنکی سے لبریز! میں نے چاہا کہ میں اپنے چہرے کو اُن میں دفن کر دوں ہنستے ہوئے سفید خوبصورت پھول! —— اور میں نے محسوس کیا کہ آسیب رخصت ہو چکا ہے گرٹیل میرے پیچھے کھڑی تھی اور اپنی انگلیوں کو میرے بالوں میں سے گزار رہی تھی "نادان لڑکے"۔ اُس نے کہا۔ کیا وہ جانتی تھی کہ اُس نے کیا کر دیا تھا۔ میں نے اُس کے ہاتھوں کو پکڑ کر چوم لیا

شام کے وقت ہم باہر آ گئے۔ وسعت میں، بہار میں۔ ہم ابھی ابھی واپس آئے ہیں! میں نے بتی روشن کر لی ہے۔ ہم نے بڑی لمبی سیر کی ہے اور گرٹیل اتنی تھک گئی ہے کہ کرسی ہی میں اُسکی آنکھ لگ گئی ہے۔ آہ، وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی ہے جب وہ یوں نیند میں مُسکراتی ہے۔

میرے سامنے تنگ سبز گلدان میں تازہ سفید پھول ہیں۔ نیچے گلی میں —— نہیں، وہ اب وہاں نہیں ہیں۔ ہوا اُن کو دوسرے خس و خاشاک کے ساتھ اُڑا کر لے گئی ہے *

"آرتھر شنٹزلر"

اٹلی

اردلی

انہیں اکٹھے رہتے چار سال ہو گئے تھے اور ایک لمحہ کے لئے بھی دونوں میں سے کسی ایک کے دل سے یہ خیال نہ بھولا تھا کہ ایک افسر ہے اور دوسرا سپاہی۔ اگر پہلے کے مزاج میں فوجی تحکم تھا تو دوسرا اطاعت شعاری میں اُس کا جواب تھا۔ اور اُن دونوں کو ایک دوسرے سے محبت تھی، وہ ناتراشیدہ خاموش محبت جو چھپی رہتی ہے اور اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتی، جس کی شدت کی تہ میں نزاکت کا ایک طوفان دبا رہتا ہے جو سٹیریل ہوتی ہے جب وہ خاموش ہؤا اور بے کیف ہو جاتی ہے جب اُسے زبان پر لایا جائے، جو اظہار کی دشمن ہوتی ہے۔ اور جو ہونٹوں کو کاٹ کاٹ کر اور آنسوؤں کو دبا دبا کر اپنی کمزوری اور حساسیت کو چھپانے کی خوگر ہوتی ہے۔ انہوں نے مختصر گوئی کی مشق بہم پہنچا لی تھی اور وہ ایک دوسرے کی بات کو ایک لفظ ایک نظر، ایک اشارے ہی سے سمجھ جاتے تھے۔ اُن کی گفتگو کا شارح وقت ہوتا تھا جو اُن کے قدموں اور اُن کے لفظوں کو نہایت پابندی کے ساتھ قرینے پہ لے آتا تھا۔

"آقا، میرے لئے کوئی اور حکم ہے؟"

"نہیں۔"

"میں جا سکتا ہوں؟"

جاؤ"

یہ تھا روزانہ برخاست کا قاعدہ اور اس گفتگو میں کبھی ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔
اسی طرح دن مہینے اور سال ـــــ چار سال گزر گئے، کوارٹروں میں، گھر میں، کیمپ میں، سفر میں، جنگ میں اور آہستہ آہستہ نامعلوم طور پر اُن کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے سخت اور گہری محبت پیدا ہوتی گئی۔ کسی شخص کے لئے جو ان دونوں کی سیرت کو سمجھ سکتا۔ اُس مسلسل خاموشی میں، اُس فوجی زبان میں، اُس نظروں کے یک لخطہ میل میں جس کا مطلب ایک طرف "یوں کرو" اور دوسری طرف "میں سمجھ گیا" ہوتا، دوستی کے جذبات کا اتنا کامل اظہار ہوتا تھا جو ایک سیر کن گفتگو ہی میں بیان ہو سکتا ہے۔

میدانِ جنگ میں ایک خطرناک موقع پر اُن دونوں نے ایک دوسرے کو پہلو بہ پہلو پایا تھا دشمن کی توپیں اُن سے کوئی سو قدم کے فاصلہ پر دُند مچا رہی تھیں اور بار بار گولے اُن کے سروں پر سے سنسناتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو بے قرار نظروں سے ڈھونڈ رہے تھے۔ جس وقت اُن کی نظریں دوچار ہوئیں اُنہوں نے یہ سوچ کر اطمینان کا سانس لیا کہ "ہم ایک مرتبہ پھر بچ نکلے"۔ ایک دفعہ ایک رات سے زیادہ عرصہ انہوں نے سردی اور بارش میں کھڑے ایک دُور کی چوکی کی محافظت میں گزار دیا تھا۔ اُن کے پاؤں کیچڑ میں لت پت ہو رہے تھے اور تیز ہوا کے تھپیڑے آآ کر اُن کے چہروں پر پڑتے تھے۔ پھر جب صبح ہوئی۔ اور اُن کو سبکدوش کرنے کے لئے محافظ سپاہی بھیجے گئے تو اُن کے چہروں پر ایک مسکراہٹ کھیل گئی، جیسے کوئی کہے "۔ اب ہم کیمپ کو جا رہے ہیں۔ خوش ہو جاؤ، کیونکہ اب تم کو آرام مل سکے گا"۔

بہت مرتبہ گرمی کے دنوں میں انہوں نے طول طویل سفر کئے تھے۔ اِن سفروں میں وہ دونوں سڑک کے کنارے سنگ ہائے میل کو گنتے جاتے تھے بعض اوقات وہ چالیس چالیس میل

چل جاتے تھے، پھر وہ اپنی پُر از سکون و اطمینان نظریں ایک دوسرے سے تبدیل کرتے تھے۔ جو کہتی تھیں "دو اور رہ گئے ——— ایک کٹا ہی چاہتا ہے ——— اور ہم منزلِ مقصود پر ہونگے"!

لشکر گاہ میں جب وہ اپنے قلوب کو بندوقوں اور توپوں کی اُس گرج کے لئے تیار کر رہے ہوتے جو اُن کی راتوں کی نیند حرام کرنے والی تھی تو اکثر شامیں یوں گزرتیں کہ ایک جب اپنے خیمے میں استراحت کے لئے جاتا تو دُوسرا اُس کو کڑکڑاتی سردی سے بچانے کے لئے اپنا لبادہ فرش پر بچھا دیتا اور پھر الگ ہو کر کہتا "سلام آقا" فوجی افسر کو یوں معلوم ہوتا کہ اُس کے اردلی کی آواز لرز رہی ہے اور آخری لفظ اُس کے مُنہ سے پوری طاقت کے ساتھ نکلا ہے۔ چنانچہ وہ بھی اِسی انداز سے سلام کا جواب دیتا۔ بعض اوقات جب ایک خط لاکر دوسرے کو دیتا اور دوسرا بے صبری سے اُسے لینے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتا تو دونوں کے چہرے ہلکی مسکراہٹ سے چمک اُٹھتے۔

"یہ خط تمہارے گھر سے آیا ہے۔ میں اس کا اندازِ تحریر پہچانتا ہوں۔ یہ تمہاری ماں کا خط ہے" آنکھوں ہی آنکھوں میں اُن میں سے ایک کہتا۔

"میں تمہارا ممنون ہوں۔ تم نے مجھے مسرت کا خزانہ بخش دیا ہے"۔ دوسرا خاموشی کی زبان میں جواب دیتا۔

یہ زمانہ بھی گزر گیا اور وہ پھر اپنی معمولی خاموش اور سنجیدہ زندگی میں واپس آ گئے۔ لیکن کبھی یہ نہ ہوا کہ افسر کے سامنے آتے ہوئے یا اُس سے رخصت ہوتے ہوئے پُرعزم سپاہی اپنے ہاتھ کو ایک شجاعانہ حرکت کے ساتھ سلام کے لئے ماتھے تک نہ لے گیا ہو اور پھر سر کو اُوپر اُٹھا کر اُس نے سیدھا اُس کی آنکھوں میں نہ دیکھا ہو۔ اور جب کبھی وہ رُخصت ہونے کے لئے پلٹا اُس نے ہمیشہ فوجی آداب وقواعد کی پابندی کی۔

اُنہیں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے صرف چار سال ہوئے تھے۔ مگر سپاہی جیسے ملازمت

کے پہلے سال کے بعد اردلی بنا دیا گیا تھا۔ اب اپنی مدتِ ملازمت ختم کر رہا تھا۔

ایک دن حکم موصول ہؤا کہ فوج کی اُس جماعت کو سبکدوش کر دیا جائے جس سے اردلی تعلق رکھتا ہے۔

اُس دن آقا اور ملازم کی نگاہیں معمول سے زیادہ دفعہ ایک دوسرے کی طرف اُٹھ اُٹھ کر مخاطب ہوتی تھیں۔ مگر اُن کے دِل نگاہوں سے بھی کچھ زیادہ کہنا چاہتے تھے۔

"میرے لئے کوئی اور حکم ہے؟"

"ہاں ہے۔ . . . . . . تم لوگوں کو سبکدوش کرنے کا حکم آیا۔ دس دن کے اندر اندر تم اِس مقام کو چھوڑ دو گے"۔

اِس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ دونوں کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"میں جا سکتا ہوں؟"

"ہاں اگر تم جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو"

معمول سے زاید یہ چند الفاظ پائے شوق کو جادۂ مہر و محبت پر کہیں سے کہیں لے گئے۔ اُن کے دِل ایک دوسرے کے لئے مضطرب و بے قرار تھے۔ لیکن دونوں کی بیقراری کا ایک درجہ نہ تھا۔ ایک اپنے دوست سے جدا ہو رہا تھا، اُس دوست سے جو اُس کے لئے دوست سے بھی بڑھ کر تھا، جسے وہ بھائی سمجھتا تھا اور جسے اُس کے ساتھ ایک قسم کی فطری محبت تھی۔ دوسرا بھی بیشک اپنے دوست سے جُدا ہو رہا تھا لیکن کم از کم وہ اپنے ماں باپ کے گھر کو واپس جا رہا تھا۔ اور اُس کے لئے یہ خیال بڑی مسرت کا باعث تھا کہ اتنی مدت دراز کے بعد اتنی تکلیفوں کے بعد اب وہ گھر پہنچنے والا ہے۔ کیمپ میں بارہا اُس نے بگل کی الم انگیز آواز سُنی تھی جس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ "روشنیاں گل کر دو"۔ پھر اُس نے خیموں میں ایک ایک بتی کو گل ہوتے دیکھا

تھا اور یوں جب اُس ناپائیدار شہر پر جس کی دیواریں ٹاٹ کی بنی ہوئی تھیں ایک گہری خاموشی چھا جاتی تھی تو کتنی دفعہ اِن غم افزا لمحوں میں سر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے اُس نے اپنی ماں کا خیال کیا تھا کہ "میری غریب ماں اس وقت کیا کر رہی ہو گی" - اُس نے اکثر رات گئے وقت اپنے ملکیوں کو ٹولیاں باندھ کر وہ میٹھے میٹھے گیت گاتے سنا تھا۔ جنہیں اپنے گاؤں کے کھیتوں کی نگہبانی کرتے ہوئے گرمی کی چاندنی راتوں میں وہ خود گایا کرتا تھا - اُس وقت اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اُس کے تمام اعزہ و اقربا اُس کے آس پاس بیٹھے باتیں کر رہے ہیں - پھر اُس گیت کی چاندی جیسی صاف اور لرزتی ہوئی لَے میں وہ آوازیں دب جائیں اور گیت اُس کے دل میں اُتر جاتا - آہ کتنی دفعہ اُس نے اِن گیتوں کو اپنی ماں کی دعاؤں کا مترادف جان کر قابلِ احترام سمجھا تھا . . . . . . گھر پہنچنے کا خیال اِخلافِ توقع جا پہنچنے کا خیال اُس کے دِل کو گُدگُدا رہا تھا - گاؤں اور اُس کے مکان اُسے دُور ہی سے نظر آ جائیں گے، اپنے مکان کی چھت کو وُہ دُور ہی سے پہچان لے گا، اُس کے قدم تیز تیز اُٹھنے لگیں گے، جب وہ گاؤں میں داخل ہو گا تو اس کا دِل زور زور سے دھڑک رہا ہو گا، اُس کی چھوٹی سی بہن اب بڑی ہو گئی ہو گی اور اُس کا بھائی بھی اب بالکل جوان ہو گا لوگ خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے اُس کے گرد جمع ہو جائیں گے - پھر وہ اُن سے اپنا پیچھا چھڑا کر گھر کی طرف بھاگے گا، اماں اماں کہہ کر اپنی بوڑھی ماں کو بلائے گا، وہ اُسے دیکھے گی اور باہیں پھیلا کر آنسوؤں بھری آنکھوں سے اُس کی طرف آئے گی - اور وہ اپنے آپ کو اُس کی آغوش میں ڈال دے گا - اور اُس آغوش میں پہنچ کر اُس انسانی خوشی کو پالے گا جو دنیا کی سب خوشیوں سے زیادہ محترم ہے - یہ خیالات تھے جو اُس کی تمام تلخیوں میں حلاوت پیدا کر دینے کے لئے اور تمام زخموں پر مرہم لگا دینے کے لئے کافی تھے -

تاہم اُس کا دِل نہ مانتا تھا کہ اُسے اُس کے آقا نے اس قدر جلد جُدا ہونے پر مجبور کر دیا

جائے۔ ایک سپاہی کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اُس پرانے کمبل کو پھینک دے جسے سالہاسال تک اُس نے اوڑھنے بچھونے اور تکیے کے طور پر استعمال کیا ہو، جس کی مدتوں اُس نے حفاظت کی ہو اور پھر اُس کا دِل ایک شکست سی محسوس نہ کرے اور اُس میں محبت و موانست کی بے چینی سی پیدا نہ ہو جیسی ایک دوست کے جدا ہونے سے ہوتی ہے۔

نیک دِل افسر اب متفکر رہنے لگا تھا مگر اُس نے اپنی روزمرہ کی گفتگو میں ایک لفظ کا اضافہ بھی نہ کیا۔ سپاہی کا بھی یہی حال تھا مگر دونوں کی نظریں بار بار اب ایک دوسرے کی جانب اُٹھتی تھیں "تم مغموم ہو، میں جانتا ہوں تم مغموم ہو" اردلی اب اپنے فرائض کو پہلے کی طرح جلد جلد نہ انجام دیتا تھا وہ اپنے آقا کی صحبت میں زیادہ دیر تک ٹھیرنے کے لئے سُست ہو گیا تھا اور جدائی کی اُن گھڑیوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ تھا جو اُس کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھیں۔ پہلے تو وہ ایک خاص آہستگی کے ساتھ اور پھر ایک بناوٹی سستی کے ساتھ میز، دل، کرسیوں کو صاف کرنے کے لئے بڑھتا مگر اکثر اپنے خیالات میں گم ہو کر رومال کو اُن کی سطح سے اوپر ہی اوپر ہلاتا رہتا۔ اِس اثنا میں اُس کا افسر سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے بے حس و حرکت اس آئینہ کے سامنے کھڑا ہو جاتا جس میں اُس کے اردلی کا عکس پڑ رہا ہوتا۔ وہ اُس کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھتا۔ اُس کے چہرے سے اُس کے جذبات کا مطالعہ کرتا لیکن جب کبھی اُن کی آنکھیں آئینہ میں ایک دوسرے سے ملنے لگتیں وہ بے اعتنائی کے انداز میں چھت کی طرف دیکھنے لگتا۔

"آقا میں جا سکتا ہوں؟"

"جاؤ"

اور سپاہی چلا گیا۔

وہ ابھی دو سیڑھیاں ہی اترا ہوگا کہ کمرے سے آواز آئی "اِدھر آؤ"۔ وہ پلٹا۔

"کوئی اور حکم ہے؟"

"نہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا..... نہیں، نہیں اب کل ہی کرنا۔ جاؤ"۔

شاید اُس نے صرف اُسے دیکھنے کے لئے دوبارہ بلایا تھا اور جب وہ اُسے دیکھ چکا تو اُس نے اپنی نظریں اُس دروازے پر گاڑ دیں جس میں سے گزر کر اُس کا اردلی ابھی گیا تھا۔

آخر رخصت کا دِن آگیا۔ افسر اپنی چھوٹی میز پر نیم باز دروازے کے سامنے بیٹھا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد اب اردلی اُس سے آخری رخصت لینے کو آئے گا۔ افسر سگار پی رہا تھا۔ اُس کے دھوئیں کے مرغولے چھت کی جانب اڑ رہا تھا اور حیران نظروں سے بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دھوئیں سے بار بار اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے اور وہ متعجب تھا کہ میں رو تو نہیں رہا۔ مگر ایسے بڑے بڑے آنسو کیوں میری آنکھوں سے گر رہے ہیں! وہ آنسوؤں کا باعث دھوئیں کو قرار دے کر اپنے جذبات کے متعلق نفس کو دھوکا دینا چاہتا تھا۔

اور وہ خیالات میں غرق رہا، ہاں، وہ اب روانہ ہونے کے لئے تیار ہو چکا ہوگا۔ کیوں پھر میں اُس جدائی کو اپنے دِل سے لگاؤں۔ کیا جب میں نے اس لڑکے کو اپنا اردلی مقرر کیا تھا۔ اُس وقت میں نہ جانتا تھا کہ میں ہمیشہ کے لئے اُسے اپنے ساتھ نہ رکھ سکوں گا؟ کیا میں واقف نہ تھا کہ اُس کی مدتِ ملازمت صِرف پانچ سال ہے؟ آخر اس شخص کا ایک گھر ہے جہاں وہ پیدا ہوا اور بڑھا، اُس کے رشتہ دار ہیں جنہیں اُس نے غم کی حالت میں چھوڑا اور جن سے اب خوشی کے ساتھ وہ ملے گا کیا مجھے اُس سے یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ایک اردلی کی حیثیت سے میرے پاس رہے! یہ میری خود غرضی ہوگی...... میں کیا سوچ رہا ہوں؟ میں واقعی خود غرض ہوں۔ آخر احسان کا وہ کونسا بندھن ہے جو اُس کو مجھ سے جُدا نہ ہونے دے؟ وہ میری کِس بات کا ممنون ہے؟ میں نے اکثر اُسے اپنی بدمزاجی کا تختۂ مشق بنایا۔ میں نے ہمیشہ اُس کے خلاف تحکمانہ طرزِ عمل اختیار کیا۔

. . . . . مگر یہ میری فطرت ہے اور میں اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔ مناسب الفاظ مجھے نہیں ملتے اور پھر . . . . . . ملازمت کے سلسلہ میں ایسے الفاظ کو ادا بھی کون کر سکتا ہے؟ مگر میں اُسے ایک ایسا چہرہ دکھا سکتا ہوں جس سے زیادہ انسانیت نمایاں ہو . . . . . . اور اب وہ جا رہا ہے وہ اپنے گاؤں کے کھیتوں میں مشقت کرنے کے لئے جا رہا ہے، وہاں وہ اپنی سابقہ طرزِ زندگی اختیار کر لے گا، رفتہ رفتہ فوجی عادات اُس کی طبیعت سے محو ہو جائیں گی۔ اسے سب کچھ بھول جائے گا . . . . . . اپنی رجمنٹ، اپنے ساتھی، اپنا افسر، وہ بے پرواہ ہو کر اپنی زندگی مسرت و انبساط میں گذارے گا لیکن کیا میں اُسے بھلا سکوں گا؟ کتنا وقت درکار ہے کہ میں کسی نئے چہرے کے دیکھنے کا عادی بنوں؛ صبح کے وقت جاگنے پر مجھے ایسا معلوم ہوا کرے گا جیسے وہ نہایت تن دہی سے اپنے کام میں مصروف ہے مگر وہ نہایت خاموشی سے حرکت کر رہا ہے اور سانس بھی لیتا ہے تو رک رک کر کہ کہیں میں وقت سے پہلے ہی نہ جاگ اُٹھوں۔ آہ، کتنی دفعہ میں جاگ کر بھی اُس کے نام سے اُسے نہ بُلا سکوں گا؟ سالہا سال کی رفاقت، محبت اور خدمت گزاری اور . . . . . . اُسے یوں جُدا ہوتے دیکھنا . . . . . . روز بہ روز . . . . . . لیکن یہ ہماری زندگی ہے اور ہمارے لئے اس پر قانع ہونا ضروری ہے . . . . . . وہ کتنا نیک تھا! اُس کا دل، وہ ایک گوہر گراں مایہ تھا، اگر کبھی سفر میں تکان، گرمی اور گرد سے پژمردہ و افسردہ ہو کر میں کہیں ایک لحظہ کے لئے ٹھہر گیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا تو کسی نے جھٹ میرے ہاتھوں میں پانی سے بھرا ہوا برتن دے دیا۔ اور ایک آواز میرے پہلو میں سے آئی "تمہیں پیاس لگ رہی ہے"؟

میں نے دیکھا تو یہ وہ تھا۔ وہ چپ چاپ اپنی قطار کو چھوڑ کر پانی کے لئے بھاگ اُٹھا تھا اور خبر نہیں کہاں اور کتنی دُور چلا گیا تھا۔ پھر ایک آن کی آن میں وہ واپس بھی آ گیا تھا اور ہانپتا ہوا پسینے میں ڈوبا ہوا بے تاب و تواں ہو کر میرے پیچھے کھڑا تھا۔ کیمپ میں اگر کبھی میں کسی درخت کے

سایہ میں سو گیا اور رفتہ رفتہ سورج اپنی کرنیں میرے چہرے پر ڈالنے لگا تو فوراً کسی ہمدرد ہاتھ نے درخت کے پتوں کو ترتیب دے کر مجھ پر چھاؤں کر دی یا چند اسلحہ کو جوڑ کر اُن پر ایک کوٹ ٹانگ دیا۔ یہ وہی ہوتا تھا، ہمیشہ وہی ہوتا تھا۔ اکثر چھ سات یا آٹھ گھنٹے کے پیدل سفر کے بعد بمشکل ہم کسی جائے قیام پر پہنچ کر اپنے خیمے کھولتے تھے کہ وہ غائب ہو جاتا تھا۔ میں اُس کو ڈھونڈتا پھرتا تھا، پورے زور سے چلا چلا کر اُسے آوازیں دیتا تھا اور آخر غصہ میں آ کر کہتا تھا "اب بتاؤ وہ کہاں ہے؛ کسی کو خبر بھی ہے وہ کہاں چھپ گیا؟ کیا یہ اچھی روش ہے؛ ٹھہرو۔ میں اسے درست کرتا ہوں"۔ اور اسی طرح اِس قسم کی باتیں کہتا جاتا۔ کچھ دیر کے بعد میں دیکھتا کہ وہ دور سے گھاس کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا دائیں بائیں اُن لوگوں سے لڑتا ہوا جو اُس سے گھاس کی ایک مٹھی چھیننا چاہتے تھے، خیموں کی رسیوں میں اُلجھتا ہوا، دھوپ میں پھیلائے ہوئے تھیلوں اور قمیضوں کو روندتا ہوا اور لعنت ملامت کا ایک طوفان اپنے سر پر لیتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ وہ میرے پاس پہنچتا، گھاس کو نیچے پھینک کر ایک لمبی سانس بھرتا اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کرتا اور ڈرتے ڈرتے مجھ سے کہتا "میں نے تمہیں بہت انتظار دکھایا۔ مگر میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ مجھے گھاس کے لئے بہت دُور جانا پڑا"۔

پھر وہ گھاس کو زمین پر بچھا دیتا، ایک طرف اُس کے نیچے اپنا تھیلا سرہانے کے طور پر رکھ دیتا اور میری طرف مڑ کر کہتا "یوں ٹھیک ہے نا؟"

نیک دِل آدمی۔ میں دِل میں سوچتا، تجھ سے میری خفگی ناروا تھی۔ پھر میں اُس سے کہتا "جاؤ .... جاؤ اور آرام کرو، کیونکہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے"

"لیکن کیا یہ کافی ہے؟" وہ بہ اصرار کہتا "اگر یہ کافی نہیں تو میں ابھی جا کر اور لے آتا ہوں"۔ میں کہتا "ہاں ہاں، یہ بہت ہے۔ جاؤ اور آرام کرو، جاؤ اور وقت ضائع نہ کرو"۔

اور اگر کبھی رات کو چلتے چلتے نیند سے مغلوب ہو کر میرے ڈگمگاتے ہوئے قدم مجھے سڑک کے اُس کنارے سے اس کنارے کی طرف لے جاتے اور میں کسی خندق میں گرنے کو تیار ہوتا تو اُس وقت ایک ہلکا سا ہاتھ میرے بازو کو آ کر چھوتا۔ اور مجھے آہستہ سے سڑک کے وسط کی طرف دھکیل دیتا اور ایک دبی ہوئی اور ڈری ہوئی آواز میرے کانوں میں آتی "آقا، دیکھو آگے ایک گڑھا ہے" اب بھی یہ وہی ہوتا تھا۔ میں نے اُس کے لئے کیا کیا تھا کہ وہ اِس بے غرضی اور جاں نثاری کے ساتھ مجھ سے محبت کرتا تھا؟ مجھ میں وہ کیا وصف ہے جس کے لئے وہ اپنی ساری توجہ مجھ پر صرف کرتا تھا؟ مجھ پر جسے ہمیشہ اپنا ہی خیال رہتا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی زندگی بھی میرے لئے دے دیگا۔ کیوں وجہ سے اور کس طرح پر سیدھی سادھی شکل وصورت کا یہ غریب لڑکا جس کے ہاتھ پھاوڑا چلا چلا کر سخت ہو چکے ہیں، جس کا جسم محنت ومشقت سے مضبوط ہو چکا ہے، جس کی کوئی تربیت وتہذیب نہیں ہوئی جو ایک جھونپڑے میں پیدا ہوا اور پلا اور جو شہر کے تمدن ومعاشرت سے ناواقف رہا ایک متمدن اور تہذیب یافتہ خاتون سے بھی زیادہ دھیما اور نرم مزاج پا گیا۔ وہ میری نیند اُچٹ جانے کے خوف سے اپنا سانس روک لیتا ہے۔ وہ میرے کپڑوں کو بچا بچا کر ہاتھ لگاتا ہے کہ انہیں کوئی گزند نہ پہنچ جائے وہ میرے خط کو اس احتیاط سے پکڑتا ہے کہ صرف اُس کے سرِ انگشت ہی اُس کو چھوتے ہیں۔ تاکہ وہ کہیں آلودہ نہ ہو جائے۔ اور وہ میرے ایک التفات کے تبسم اور میرے ایک مہربانی کے لفظ ہی سے اتنا خوش ہوتا ہے گویا اُسے اپنی تمام خدمت گزاری کا معاوضہ مل گیا۔ وہ اپنے ایک اشارہ میں اپنی ایک سادہ نظر میں میری پسند وناپسند دریافت کر لیتا ہے۔ یہ ایک یقینی بات ہے۔ کہ اُس شخص کا دل جو سپاہی نہیں یا جس نے کبھی سپاہیانہ زندگی نہیں گزاری فوجی کپڑوں میں اُن نئے نئے جذبات سے آشنا ہوتا ہے، جن سے پہلے وہ ناواقف تھا۔ لوگ سوائے اُس جذبہ کے جو ہمارے دلوں کو ایامِ جنگ میں جوش سے بھر دیتا ہے اور کوئی جذبہ ہم سے منسوب ہی نہیں کرتے، اُن کو

ہماری طبیعتوں سے کتنی کم واقفیت ہے! سپاہی کا دل نہ صرف یہ کہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا بلکہ بوڑھا ہو کر پھر نئی جوانی حاصل کرتا ہے اور جوانی کے لطیف سے لطیف جذبات اُس میں پیدا ہوتے ہیں انہیں جذبات میں وہ رہتا سہتا ہے اور جنگ کے طوفان خیز اور خطرناک سُرور سے بہت زیادہ کیف اُسے اِن میں حاصل ہوتا ہے ...... کوئی شخص بھی جو سپاہی نہیں میرے اس جذبہ شوق کو نہ سمجھ سکیگا جو مجھے اس نوجوان سے وابستہ کئے ہوئے ہے! یہ ناممکن ہے! میرے جذبات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ تم متعدد راتیں کیمپ میں گزار چکے ہو یا گرمیوں کی جھلس دینے والی دھوپ میں لمبے لمبے سفر کر چکے ہو، موسلا دھار بارش میں کھڑے ہو کر پہرے دے چکے ہو، بھوک اور پیاس کی شدت میں تمہاری حالت غشی کے درجہ کو پہنچ گئی ہو اور اِن سب حالات میں تمہاری معیت میں ایک دوست ہو جو تمہیں سردی کے اثر سے بچانے کے لئے اپنا کوٹ تم پر ڈال دے، پیاس میں تمہیں پانی کے دو گھونٹ لا دے، بھوک میں غذا کے چند لقمے پیش کردے اور اس طرح کہ خود اِن سب نعمتوں سے محروم رہے۔ لڑکو! ایسے شخص کو تم خانہ زاد کہہ سکتے ہو؟ نہیں ایسی باتیں اُس سے منسوب کرنا کفر ہے۔

جب یہ شخص میری دہلیز پر قدم رکھتا ہے اور محبت آمیز اطاعت کی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ اُٹھا کر مجھے سلام کرتا ہے تو وہ اشارہ جس سے میں اُس کا سلام قبول کرتا ہوں تعظیم کے اُس اشارہ کا ہم پایہ ہوتا جو اُس کے ہاتھ کو اُس کی ٹوپی تک لے جاتا ہے اور میرا یہ وفادار ہمدم آج مجھ سے رخصت ہو جانے والا ہے، مجھے چھوڑ جانے والا ہے۔ اور پھر میں اُس کو کبھی نہ دیکھوں گا۔ نہیں! ناممکن ہے! میں اُس کے وطن میں اُس سے ملنے جاؤں گا۔ مجھے اُس کے قصبہ کا نام یاد ہے۔ میں وہاں جا کر اُس کے گاؤں اور کھیتوں کا پتہ دریافت کروں گا۔ میں وہاں پہنچ کر اُس کو حیران کردوں گا اور اُسے اُس کا نام لے کر پوچھوں گا: "کیا تم اپنے افسر کو نہیں پہچانتے؟" "میں اپنے سامنے کسے دیکھ رہا رہا ہوں! آقا، تم یہاں!" وہ متاثر ہو کر جواب دے گا اور میں کہوں گا "ہاں میں تمہارے دیکھنے

کیلئے یہاں آیا ہوں۔ آؤ، میرے پیارے سپاہی، آؤ اور میرے گلے سے لگ جاؤ۔"

وہ اِن خیالات میں محو ہے کہ اسے سیڑھیوں پر کسی کے سست اور ناہموار قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جیسے کوئی متاملانہ بڑھا چلا آ رہا ہے اور اپنے قدموں کو روک روک کر اوپر چڑھتا ہے۔ وہ اس آواز کو بغیر اُس طرف متوجہ ہوئے سنتا ہے، آواز قریب آ پہنچتی ہے۔ اُس کے دِل میں ایک فشار سا پیدا ہوتا ہے۔ وہ مڑ کر دیکھتا ہے۔ وہ وہی ہے .... یقیناً وہ وہی ہے ...... اُس کا اردلی۔

اردلی کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں ہیں، اُس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی ہیں۔ وہ سلام کے لئے ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ پھر ایک قدم آگے بڑھکر کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنے افسر کو تعظیم دیتا ہے۔ مگر افسر اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔

"آقا میں جا رہا ہوں"۔

"رخصت" افسر اپنے ہونٹوں کو بہ مشکل کھولتے ہوئے جواب دیتا ہے، اور دوسری ہی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ رخصت... تمہیں سفر پر جانا مبارک ہو۔ اپنے گھر پہنچو ..... اور وہاں بھی ایک ایسی ہی پاک و پاکیزہ زندگی بسر کرو جیسی کہ تم یہاں کر چکے ہو، اور .... خدا حافظ"۔

سپاہی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "آقا!"

"جاؤ، جاؤ، ورنہ تمہیں دیر ہو جائے گی، جاؤ تمہیں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے"۔

اور اُس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا جسے سپاہی نے اپنے ہاتھ میں لے کر نہایت گرمجوشی سے دبایا۔ "تمہیں یہ سفر مبارک ہو. ...... اور مجھے بھولنا نہیں۔ اپنے افسر کو کبھی کبھی یاد کر لیا کرنا"۔

غریب آدمی جواب دینا چاہتا ہے، وہ اپنی زبان سے کسی لفظ کو ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کچھ نہیں کہہ سکتا، افسر کا ہاتھ بھی اُس کے ہاتھ میں ہے، وہ افسر کی طرف دیکھتا ہے

جس کا منہ ابھی تک دوسری طرف ہے، ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے...... "آقا" ایک ہچکی کے ساتھ اُس کے مُنہ سے نِکلتا ہے۔

اور وہ بھاگ کر چلا گیا۔

افسر اکیلا رہ گیا۔ مڑ کر اُس نے تھوڑی دیر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی کہنیوں کو میز پر ٹیک کر اُس نے اپنے سر کو اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ دو بڑے بڑے آنسو اُس کی آنکھوں میں بھر آئے اور جلدی سے اُس کے رخساروں پر ڈھلک گئے تاکہ اُن پر کسی کی نظر نہ پڑ جائے اُس نے اپنا ہاتھ اپنی آنکھوں پر پھیرا۔ اپنے سِگار کی طرف دیکھا، جو بجھ چکا تھا۔ اور اب وہ سچ مُچ رونے لگ گیا۔ اُس نے اپنا سر اپنے بازوؤں پر گرا دیا اور اپنے آپ کو غم واندوہ کے حوالے کر دِیا۔

"ایڈمنڈو ڈی امیسس"
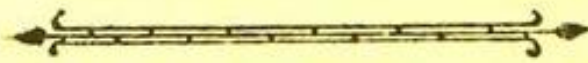
یونان

چوڑی

یہ گہرے نیلے رنگ کی ایک باریک نمائشی سی چوڑی تھی۔ جس کی شکل سانپ سے مشابہ تھی۔ بالکل بے حقیقت سی چیز۔

جب میں نے پہلی مرتبہ اسے اپنی منگیتر کو پہنے ہوئے دیکھا تو میں نے اپنے دل میں کہا۔ "اس نے کیسی ادنیٰ درجہ کی چوڑی پہن رکھی ہے۔ میں اسے ایک اور اچھی سی خرید دوں گا" چنانچہ میں نے اسے ایک جلد ہی آنے والی تقریب پر سونے اور جواہر سے بھری ایک نہایت خوبصورت چوڑی خرید دی اس کی شکل بھی سانپ کی سی تھی۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ حوّا کی بیٹیوں کے لئے سانپ کا نشان بہت ہی مناسبت رکھتا ہے۔

وہ بہت خوش ہوئی۔ اور جب وہ اپنی نظریں نیچی کئے چوڑی کی ڈبیہ کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ تو اس کی نیلی نیلی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اور اس کے چہرے پر سرخی کی ایک ایسی لہر دوڑ رہی تھی۔ جیسی اس چوڑی پر نمایاں تھی۔

اس نے ڈبیا میرے ہاتھ سے لے کر مجھے چوم لیا۔ اور اب مجھے توقع تھی کہ دوسرے دن ضرور میں اسے اس کو پہنے ہوئے دیکھوں گا۔ مگر نہیں ایسا نہیں ہوا۔ وہ بدستور اپنی کانچ کی چوڑی پہنے رہی۔ اور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اب اس کے متعلق کچھ نہ کہوں۔ لیکن خود بخود مجھے ایسا معلوم ہونے

لگا۔ کہ اس معاملے کی اہمیت ایک اتفاق محض یا ایک نظر انداز کر دینے کے قابل خطا سے زیادہ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ دو یا تین دن کے بعد میں مزید ضبط سے کام نہ لے سکا۔ اور بے ساختہ کہہ اُٹھا۔

میری "میں نے تمہیں ایک چوڑی دی تھی۔ تم اسے کیوں نہیں پہنتیں؟"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا، گویا جو کچھ میں اُسے کہہ رہا تھا اسے وہ نہ سمجھتی تھی۔

میں نے کہا۔ "تمہیں اس گھٹیا نکمی چیز کے پہننے پر اصرار کیوں ہے؟" اس نے اس کی طرف دیکھا مگر کچھ نہ کہا۔ پھر اس نے سختی کے ساتھ ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ اس وقت اس کی آنکھوں کے رنگ کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ میں اس رنگ کی توضیح نہیں کر سکتا مگر اتنا میں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت وہ نیلی نہ تھیں۔

میں نے کہا۔ "کیا وہ تمہیں پسند نہیں۔ یا تم اسے پہننے کے قابل ہی نہیں سمجھتیں؟" اس نے جواب دیا۔ "کل میں اسے ضرور پہن لونگی۔ میں ہمیشہ اسی کو پہننا چاہتی تھی مگر چونکہ تمہیں یہ پسند نہیں . . . ." یہاں وہ رُک گئی۔ اور ایک مرتبہ پھر اس نے اپنی کانچ کی چوڑی کی طرف دیکھا پھر کہنے لگی "بہت اچھا۔ کل سے میں اُسی کو پہنوں گی جو تم نے مجھے دے رکھی ہے۔" وہ متفکر معلوم ہوتی تھی اور اس کی آواز غمگین تھی۔ اس کا فیصلہ میری محبت کی چوکھٹ پر ایک قربانی معلوم ہوتا تھا۔ میں اُس کے اِن گھنگھریالے بالوں پر بوسہ دینے کے لئے جُھک گیا جو اس کی حسین پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔

دوسرے دِن بھی میری نے وہ چوڑی نہ پہنی۔ اس دفعہ میں نے اس سے سوال کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ "اور وہ چوڑی کہاں ہے؟"

اس نے جواب دِیا۔ "ہاں آپ نے درست کہا۔ میں بھول گئی۔ لیکن اگر تم چاہو۔ تو میں ابھی جا کر اسے لے آتی ہوں . . . . مگر نہیں اس وقت اسے تلاش کرنے

میں وقت ضائع ہو گا۔ میں کل اسے ضرور پہن لُونگی"۔

میں نے اس کی بات پر یقین کر لیا۔ اور اور کچھ نہ کہا۔ لیکن دوسرے دِن بھی اس نے اپنے وعدہ کا ایفا نہ کیا۔ جتنا میں اس کانچ کی چوڑی کی طرف دیکھتا تھا۔ اتنا ہی میرا غصہ بڑھتا تھا۔ یہ محبت کا غصہ تھا جو بڑی آسانی سے مشتعل ہو جایا کرتا ہے اور مجھے اپنا اضطراب چھپانے کے لئے یا اس کے متعلق خاموشی اختیار کرنے کے لئے سخت کوشش کرنی پڑتی تھی کئی دِن گزر گئے مگر میری کے دِل میں اس چوڑی کے پہننے کا خیال تک نہ آیا اور اپنی طرف سے میں نے بھی ارادہ کر لیا کہ اس کی چوڑی کے متعلق اب کچھ نہ کہُوں گا۔ اس دِن کے بعد ہمارے دِل صاف ہو گئے اور ہماری محبت کے چہرے سے تمام گرد و غبار دُور ہو گئے۔

کچھ عرصہ کے بعد مجھے شام کا ایک مختصر سا سفر پیش آگیا۔ مجھے ایک ہفتہ باہر رہنا تھا رخصت کی شام کو جب میں اسے آغوش میں لے کر چوم رہا تھا میں نے میری سے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ جب میں واپس آؤں تو تم کو اپنی چوڑی پہنے ہوئے دیکھوں"۔

میری نے کہا "بہت اچھا"۔

"وعدہ کرتی ہو" میں نے پوچھا۔

"ہاں" اس نے جواب دِیا۔

"تمہیں ہماری محبت کی قسم"۔

"ہماری محبت کی قسم"۔

اس نے یہ قسم کچھ ایسے پُر وثوق انداز سے کھائی کہ میں نے اپنے دِل میں ایک فیصلہ کر لیا۔ یعنی اگر اب بھی میری نے میری دی ہوئی چوڑی نہ پہنی تو میں اُس سے اپنا رشتہ منقطع کر لُوں گا۔ جس روز مجھے واپس پہنچنا تھا میں نے ارادۃً اُسے تار کے ذریعہ اپنی آمد کی

اطلاع دی۔ دوسرے دِن میں اس کے پاس تھا۔ وہ انتہائی مسرت کے ساتھ دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھ سے ملنے آئی۔ آہ! اس نے ایک بازو میں میری چوڑی پہن تو لی تھی مگر پرانی اس کے دوسرے بازو پر ابھی تک موجود تھی۔

میں اس سے کیا کہہ سکتا تھا؛ میں کیا کرسکتا تھا؛ وہ میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہے :۔

"دیکھو، میں نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔ آؤ اور مجھے چوم لو۔ ناشکر گزار نہ بنو۔"

میں نے اسے کئی بار چوما۔

"ہاں، لیکن فیصلہ یہ نہ ہوا تھا۔" میں نے اس سے دو بوسوں کے درمیان یہ الفاظ کہنے کی جرأت کی۔

"کیا؟" اس نے کہا۔

میں نے جواب دیا "میں نے تم سے یہ چوڑی اُتار دینے اور اپنی چوڑی پہننے کو کہا تھا۔ یہ نہ کہا تھا کہ تم دونوں پہننا۔"

"نہیں، نہیں، خدا کی قسم، تم نے مجھے اپنی چوڑی پہننے کو تو کہا تھا۔ مگر یہ نہ کہا تھا دوسری چوڑی نہ پہننا۔"

"بہت اچھا، بہت اچھا"۔ میں نے کہا "لیکن فرض کرو کہ اب میں تم سے کہوں"۔

"اگر، . . . . . اگر اب تم مجھ سے کہو" اور اس کی آواز دِھیمی ہو گئی۔ "کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں بتا دوں"۔ وہ اپنے مُنہ کو میرے کانوں کے قریب لے آئی اور کہنے لگی "تمہاری یہ خواہش میں پوری نہ ہونے دُونگی"۔

میں چونک کر پیچھے ہٹا، جیسے مجھے اس کانچ کے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ میں نے

کہا "کیوں! یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں کہ میں تمہیں ایک چوڑی کے متعلق جو مجھے ناپسند ہو یہ کہوں کہ تم اسے نہ پہنو...... خواہ وہ میرے ہی ہاتھ کی بنی ہوئی کیوں نہ ہو۔"

اس نے کہا "اب ادھر آؤ، چھوڑو اس بات کو۔ اگر یہ تمہیں اتنی ہی ناگوار ہے۔ تو میں اس کا پہننا ترک کردوں گی۔ کل سے میں صرف تمہاری چوڑی پہنوں گی۔"

اس کی اس قربانی کے تشکر و امتنان میں مجھ سے ایک بڑی بھاری غلطی سرزد ہو گئی۔ میں نے کہا "یہ چوڑی تمہیں کس نے دی تھی۔ جو تمہیں اس کا اتنا خیال ہے؟"

میرے اس سوال سے نہ اس کے چہرے پر سُرخی ظاہر ہوئی نہ زردی مگر جب وہ بولی تو اس کی زبان میں لکنت تھی۔

"نہیں نہیں جانتی......... مجھے یاد نہیں۔ یہ والد نے مجھے تحفہ کے طور پر دی تھی........ بہت عرصہ ہوا۔"

دوسری غلطی جو مجھ سے ہوئی وہ پہلی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ میں اس کے باپ سے ملنے گیا اور میں نے اس سے کہا :-

"میری کی یہ ننھی سی نیلے رنگ کی چوڑی بڑی ہی خوبصورت ہے اُسے یہ آپ ہی نے دی تھی نا؟"

اس کے باپ نے عینک آنکھوں کے ساتھ لگا کر کچھ اس طرح اس پر نظر ڈالی جیسے اس نے اسے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس نے کہا "نہیں" اور پھر تھوڑے سے وقفہ کے بعد بولا "نہیں، یہ اُسے میں نے نہ دی تھی۔"

اسی لمحہ سے میرے دل میں رقابت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ گویا میری رگ رگ میں سانپ

کا زہر سرایت کر گیا تھا۔

میں نے اپنی تدابیر کو کاملِ غور پر بروئے کار لانے کا فیصلہ کر لیا۔ یا میری اس چوڑی کو پہننا چھوڑے گی یا میں اسے چھوڑ دوں گا۔ میں مر جاؤں گا، خودکشی کر لوں گا۔ ہر بات کو قبول کرونگا مگر اس کو برداشت نہ کروں گا۔ ناقابلِ ضبط غیظ و غضب نے مجھ پر غلبہ پا لیا۔

میری تیسری غلطی یہ تھی کہ میں نے میری سے کہا :۔

"تمہیں اس چوڑی کو چھوڑنا پڑے گا۔ مجھے اس کے متعلق بعض باتوں کا علم ہو گیا ہے میں اسے آئندہ کبھی تمہیں پہنے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں نے آج تم سے کہہ دیا ہے اگر تم نے اصرار کیا تو بلا تامل کوئی خوفناک بات کر گزروں گا۔"

میں منتظر رہا کہ وہ مجھ سے پوچھے کہ میں نے کیا معلوم کر لیا ہے مگر وہ خاموش رہی۔ گویا میرے درشت لہجہ نے اسے ڈرا دیا تھا اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا مگر کچھ نہ کہا۔ اس کی آنکھوں نے جو اس وقت موسمِ بہار کے آسمانوں کی نیلاہٹ مستعار لئے ہوئے تھیں، میرے غصہ کو کسی قدر فرو کر دیا۔

گیارہ دن! ایک ایک کر کے میں ان دنوں کو گنتا رہا۔ جن کا ہر ہر لمحہ میرے لئے عذاب الیم سے کم نہ تھا۔ گیارہ دن تک وہ مجھے ان وعدوں میں ٹالتی رہی کہ وہ اس چوڑی کا پہننا چھوڑ دینے والی ہے یہ حیلے بہانے وہ کہاں سے تراش لیتی تھی۔ آج کچھ کہتی کل کچھ کہتی، بعض اوقات وہ خفا ہو جاتی، بعض اوقات مذاق میں ٹالتی اور بعض اوقات خاموش رہتی مگر کم بخت یہ چوڑی اسکے سفید نازک بازو سے جدا نہ ہوئی۔ اور جب وہ اپنی دونوں باہوں کو ملاتی اور دونوں سانپ آپس میں ملتے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے ان میں جان پڑ گئی ہے۔ اور ان کی خونخواری رقابت اور زہر چکانی ایک دم میں ان کو جلا کر رکھ دے گی، ہاں یقیناً ان میں سے ایک نہ ایک

ضرور صفحۂ ہستی سے مِٹ کر رہے گا۔ وقتاً فوقتاً مجھ سے اِن خیالات کا اظہار بھی ہوتا رہا۔ گو میرے الفاظ مختلف ہوتے لیکن اِن کا مفہوم یہی ہوتا تھا۔

میں نے اس سے کہا:۔

"مجھے اس میں اصرار ہے سمجھتی ہو؟ .... کل سے تمہیں صرف ایک چوڑی پہننی ہوگی۔ اس کے بعد میں اپنا فیصلہ تمہیں بتادُونگا"۔

اِس مرتبہ اس نے میری بات کو سُنا۔ اور صرف ایک چوڑی پہنی، مگر وہ میری چوڑی نہ تھی مجھے طیش آگیا۔ غصہ سے میرے مُنہ میں کف بھر آیا۔ مجھے اب یاد نہیں رہا کہ میں نے اس وقت کیا کہا۔

وہ چپ چاپ سُنتی رہی۔ جب میں خاموش ہُوا تو وہ نہایت مجبور ہو کر بڑے عزم وثبات کے ساتھ اس طرح بولی جیسے کوئی مرد گفتگو کرے۔

"سنو، تم ایک ناممکن بات کا مطالبہ کر رہے ہو۔ میں کبھی اس چوڑی کو اپنے سے جُدا نہیں کرسکتی، میں یہ کرسکتی ہوں کہ میں بیک وقت دونوں چوڑیاں پہنوں۔ مگر میں اس چوڑی کو کبھی نہیں اُتارُوں گی۔ میں اِسے مرتے دم تک پہنے رہوں گی۔ مجھ سے اور کچھ نہ پُوچھو۔ کیونکہ میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤنگی۔ میں تمہیں صرف یہ بتا دیتی ہوں کہ اگر تم نہ مانے تو میں تمہیں تمہاری نسبت کی انگوٹھی واپس دے دُوں گی۔ اِس سے مجھے بڑا صدمہ ہوگا۔ کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے اور میں تمہاری زندگی کی شریک بن کر رہنا چاہتی ہوں مگر میں اکیلے رہنے کو ترجیح دُونگی اور چوڑی کو نہ چھوڑوں گی۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ اپنا یہ بیان تمہیں دے دُوں۔ اب تم جو چاہو کر سکتے ہو"۔

کیا مجھے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ مجھے اس سے محبت تھی؟ ہاں مجھے اس سے محبت تھی، ورنہ اِس قسم کی یہ تمام باتیں بغیر احتجاج کے نہ سُن لیتا۔ میں اس کے راز میں وہ سحر نہ پاتا جس

کے لئے میں نے قسم کھائی کہ اس کا ہمیشہ احترام کروں گا۔ میں اپنے قول کو کیونکر واپس لے سکتا تھا، مگر میں اس سے پیوستہ بھی کیونکر رہ سکتا تھا؛ آہ! مجھے اس سے بڑی محبت تھی۔

شادی کے دن تک اور اس کے بعد کافی دیر تک ہمارے درمیان چوڑی کے متعلق کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ میں نے اس معاملہ میں خاموش رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور میں اس منحوس چوڑی کو دیکھنے کا کچھ عادی بھی ہو گیا تھا مگر سچ کہوں کہ میری بے اندازہ محبت بھی پورے طور پر میرے جوشِ رقابت کو فرو نہ کر سکی۔ اور میرے دل کی تہ میں اب بھی اُمید باقی تھی۔ شاید وہ زبردست اُمید جو ایک عاشق کے دل میں زندہ رہتی ہے۔

مجھے اُمید تھی کہ کسی نہ کسی دن اپنی محبت کی طاقت سے میں ضرور میری کی طبیعت کو جیت لوں گا۔ پھر وہ اپنی چوڑی کی کہانی مجھے آپ ہی آپ سنا دے گی۔ اور پھر اسے چھوڑ کر میری چوڑی پہننے لگے گی۔

اِس میں شک نہیں کہ میری کی بعض باتیں مجھ پر جادو سا اثر کر دیتی تھیں۔ جب کبھی وہ ڈرتی تھی تو وہ چوڑی والا بازو اُوپر کو اُٹھایا کرتی تھی جیسے وہ اپنے آپ کو کسی خطرہ سے بچا رہی ہے۔ ایسے موقعوں پر میں اسے ستانا شروع کر دیتا تھا۔ اور میری مسترحمانہ نگاہوں سے میری طرف یوں دیکھا کرتی جیسے کہتی ہے!

"اپنے وعدہ کو نہ بھولو"

بمشکل ایک سال ...... مسرت وشادمانی کا ایک سال ...... گزرا ہوگا کہ مجھے محسوس ہونا شروع ہوا کہ میرا صبر اور میری محبت مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔ میری اُمیدیں بھی مایوسی سے بدلنے لگیں۔ مگر میری کے پُراسرار دل تک مجھے رسائی نہ ہوئی۔ اگر میں استعاروں میں بات کرتا تو وہ ایسا مُنہ بنا لیتی گویا وہ کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ اور جب میں صاف طور پر کہتا تو پھر بھی

تجھے کوئی بہتر جواب نہ ملتا۔

پہلے وہ ایک قہقہہ لگاتی پھر مجھے مزاق میں اُڑا دیتی۔ گویا میرے جسم کو آتشدان پر رکھ کر بھون ڈالتی۔ اب پھر وہی حالت ہوگئی جو ہماری شادی سے پہلے تھی، بلکہ اب اتنا اضافہ ہوا کہ جب بیری نے دیکھا کہ میں اصرار کر رہا ہوں تو اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور وہ کہنے لگی:۔

"مجھے اکیلے چھوڑ دو۔ میں تمہاری بہت ہی ممنون ہوں گی۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم مجھے اب پریشان نہ کرو گے مگر تم نے پھر وہی باتیں شروع کر دی ہیں۔ کیا میں تمہیں بتا دوں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؛ تم مجھ سے اپنی محبت چھین لوگے۔ تم میرے دِل میں اپنے لئے نفرت پیدا کر لوگے اور پھر یہ سوال ہی درمیان نہ ہوگا کہ کونسی چوڑی پہننی چاہیئے۔۔۔۔۔۔"

"نہیں" میں نے جرأت کر کے اُس سے کہا "خدا کی قسم میں اب بھی اُسے کوئی اہمیت نہ دُوں گا۔ میں صرف ایک بات چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ تم مجھے تمام کہانی سُنا دو، مجھے اپنے راز میں شریک کر لو اور مجھے بتا دو کہ یہ تمہیں کس نے دی تھی۔ کیا جو کچھ تمہاری ایک سکول کی سہیلی نے کہا ہے، وہ سچ مچ صحیح ہے؟"

ایک خطرناک لہجہ سے اس نے مجھے ٹوک دیا "خاموش رہو! خدا کے لئے خاموش رہو! تم میری محبت کو قتل کر رہے ہو۔ اگر تم نے ایک لفظ بھی اور کہا تو میں تم سے نفرت کرنے لگوں گی ہمارے تمام تعلقات منقطع ہو جائیں گے"۔

میرا سر چکرا گیا۔ جیسے اُس نے مجھے کوئی سخت ضرب پہنچائی ہو۔ وہ مجھے چھوڑ کر اپنے کمرہ میں چلی گئی اور اس نے دروازے بند کر لئے۔

بدقسمتی سے میرے سر میں یہ سمائی کہ میں اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں اپنے ایک گہرے دوست سے ملنے چلا گیا۔ اس نے میری پریشانی کو دیکھ کر اس کا باعث دریافت کیا۔ میں نے ایک

احمق کی طرح شروع سے لے کر آخر تک اسے سارا قصہ سنا دیا۔ اور اس میں بھی پوری تفصیل سے کام لیا۔

جو کچھ میرے دوست نے کہا، اس کا اعادہ اب بے فائدہ ہے۔ وہ وہی باتیں تھیں، جو عام طور پر لوگ ایسے معاملات کو سن کر کہا کرتے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں ایک کمزور سیرت احمق ہوں مجھے مرد بننا چاہیئے اور اپنی بیوی کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے غیر متزلزل عزم کے ساتھ مصروفِ کار ہو جانا چاہیئے، پھر کامیابی یقینی ہے۔ میں اس نصیحت کو سن کر حیران ہو گیا۔ جب میں گھر واپس آیا تو میری سو رہی تھی، شمع کی جھلملاتی ہوئی روشنی سرخ شیشے میں سے چھن چھن کر ادھر اُدھر منعکس ہو رہی تھی۔ اور اُس کا عکس لہو کے دھبوں کے مانند معلوم ہوتا تھا اسی قسم کا ایک اور دھبہ میری کے چہرے پر بھی پڑ رہا تھا۔ اس کا بازو رسیدھا اور بے حس و حرکت اوڑھنے کی چادر کے باہر پھیلا ہوا تھا اور اس پر مُردنی چھا رہی تھی۔ میری نظر اس نابکار چوڑی پر پڑی، جو شمع کی سرخ روشنی میں چمک رہی تھی۔ میری آرام سے سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر غم یا پریشانی کا کوئی نشان نہ تھا۔ یہاں تک کہ کانچ کی یہ فتنہ انگیز چوڑی بھی اس کی نیند میں خلل انداز ہوتی معلوم نہ ہوتی تھی۔ آہ، کیا کبھی میں جانوں گا کہ اس کے خواب کیا ہیں! اس نظارے نے مجھے بے خود کر دیا۔ مجھے تکلیف ہونے لگی اور غصہ مجھ پر چھانے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ غبار چھا گیا اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میرے سر میں ارتکاب جرم کا خیال آیا۔ ایک بجلی کی طرح وہ میرے دماغ میں داخل ہوا۔ اور پھر اسے کوئی چیز وہاں سے نہ نکال سکی۔ میں نے نتائج کو پسِ پشت ڈال دیا۔ شاید میں یہ سمجھ رہا تھا کہ اگر ایک مرتبہ میں نے اس کو انجام دے لیا۔ تو ہمیشہ کے لئے میری پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن کیا یہ صحیح تھا؟ کیا میں جانتا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟

میں آہستہ سے میری کے بستر کے قریب پہنچا اور اُس پر جھک گیا۔ میں نے ایک ہاتھ میں سانپ کی دُم اور ایک میں مُنہ پکڑ لیا۔ میں نے کیا کیا؛ میں نے اپنے ہاتھوں کو صرف ایک خفیف سی جُنبش دی۔ آہ! جرم کرنے کے لئے کس قدر کم قوت درکار ہے؟

چوڑی ٹوٹ گئی۔

اس کے ٹکڑوں کو میں نے بستر کی چادر پر بکھر جانے دیا اور اپنے ہاتھوں کو علیٰحدہ کر لیا۔ شکست کی آواز نے میری کو جگا دیا۔ مگر آنکھیں کھولنے سے پہلے اِس نے اپنا دُوسرا ہاتھ چادر کے نیچے سے نکالا اور مجھے یقین ہے۔ کہ ایک نیم شعوری حالت میں اس نے چوڑی کو ٹٹولا۔

چوڑی وہاں نہ تھی۔

شیشے کی ٹکڑیاں بستر پر بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں ۔۔۔۔۔ اور اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ یہ تمام باتیں ایک ذرا سے لمحہ میں گزر گئیں۔ وہ ننگے پاؤں اور کھُلے بازو ہاتھ میں چوڑی کے ٹکڑے لئے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کے بال اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے، مگر اس کی آنکھیں ۔۔۔۔۔۔ کیا میں ان کو کبھی بھُول سکتا ہوں؛ وہ اب تک اسی طرح ہر وقت مجھے نظر آتی رہتی ہیں۔ جیسے اس لمحہ میں نظر آئی تھیں۔ ان آنکھوں کی پتلیاں گوشوں سے میری طرف جھانک رہی تھیں۔ ان کا نیل سیاہی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ان میں سے شعلے نکل رہے تھے اور ان کی سفیدی الم انگیز وحشت کی آگ سے مشتعل ہو رہی تھی۔

مگر یہ ناممکن ہے۔ کہ میں اُس آواز کا نقشہ الفاظ میں کھینچ سکوں جس میں، اس نے مجھے مخاطب کیا:۔

"تم نے اِسے توڑ دیا ہے .... تم نے اِسے توڑ دیا ہے ...... بہت اچھا اب ختم ہو گئی۔ تم نے زنجیرِ محبت کا ایک ایک حلقہ الگ الگ کر دیا ہے .... تم نفس پرست، کم عقل، کھوجی اور جھوٹے ہو! .... تم ابھی سب کچھ جان لو گے۔ مجھے یہ چوڑی کس نے دی تھی۔ اس کے متعلق کوئی کہانی نہیں ہے .... کوئی راز نہیں ہے مجھے اس کے پہننے کا محض ایک وہم تھا۔ تم نے اس کے لئے ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور مجھے مدتوں عذاب میں مبتلا رکھا .... آہ! مجھے تم سے نفرت ہے، تمہارے اِس فعل کے باعث مجھے تم سے گھن آنے لگی ہے۔ جاؤ، خدا کرے کہ میں پھر تمہیں کبھی نہ دیکھوں۔"

حقیقت میں اُس رات کے بعد میں اپنی بیوی سے جُدا ہو گیا۔ دو سال کی ناقابلِ برداشت زندگی کے بعد ہم قانونی طور پر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

اس نے قسطنطنیہ میں پھر شادی کر لی۔ میرے ایک دوست نے جو حال ہی میں اس سے ملا ہے۔ مجھے بتایا ہے کہ وہ ہمیشہ ایک خاص چوڑی پہنے رہتی ہے جو حجر البحر اور سونے کی بنی ہوئی ہے۔

"گریگوری زینو پولو"

ہالینڈ

قاصد

۱۸۶۹ء کے موسم سرما میں مَیں نے اپنا طبی کام کچھ دِنوں کے لئے اپنے دو دوستوں کے سپرد کیا اور خود ماسکو میں بین الاقوامی طبی کانگریس میں شامل ہونے کے لئے پیرس سے روانہ ہوا۔ کانگرس کے پہلے پہلے اجلاس حد درجہ دلچسپ تھے۔ وقت کے مشہور و معروف اطبا نئے نئے نظریے پیش کرتے تھے اور اُن نئے نئے طریقوں اور اصولوں پر بحثیں کرتے تھے جو اب بالکل بھول چکے ہیں۔ اور میں چونکہ اُن دِنوں جوان تھا اس لئے اِن بحثوں میں نہایت گرم جوشی سے حِصّہ لیتا رہا۔ کانگریس کی روایات کے مطابق شام کے وقت تمام نمایندوں کو کھانے اور راگ رنگ کی مجلسوں میں بلا لیا جاتا تھا۔

کانگریس کے انعقاد کے تیسرے روز ایک پروفیسر "مسمریزم" کے ذریعے سے، کہ اُن دِنوں نفسی طِب کے لئے یہی لفظ بولا جاتا تھا، صرع کے عِلاج پر تقریر کرتا رہا۔ ایسی ہی دلچسپ اور رُوح پرور بحثوں کے دوران میں مَیں نے دُور خیالی اور خوابوں کی تعبیر کے متعلق بھی بڑے بڑے حکمار کی تقریریں سُنی تھیں۔ میں اُن سب کو محض توہم پرستوں کے ایجادات سمجھتا تھا مگر اُس دِن جب میں اپنی قیام گاہ کو واپس جا رہا تھا تو مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے میری مادہ پرستی کو کوئی سخت صدمہ پہنچا ہے۔ اور یہی زمانہ تھا جب میں نے زندگی کے

متعلق اپنے خیالات کی اصلاح کی۔

اسی شام کو ماسکو کے گورنر نے نمایندوں کے اعزاز میں ایک دعوت دی۔ یہ ایک ایسا مجمع تھا جس میں بڑے بڑے مدبرینِ سلطنت اور عمایدینِ حکومت، بڑے بڑے علما وفضلا اور خوبصورت عورتیں جمع تھیں۔ اب جب کہ بڑھاپا مجھ پر چھا رہا ہے میں اس دعوت کا خیال کرتا ہوں تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ سب کچھ اب خواب وخیال ہو چکا ہے، جذبات مُردہ ہو چکے ہیں۔ محبت ختم ہو چکی ہے۔ اُس زمانے کے نوجوان لفٹننٹ آج کل بوڑھے جرنیل بن چکے ہیں۔ وہ لڑکیاں جو اُن دِنوں نوجوان اور حسین تھیں اب بوڑھی اور خود غرض دادیاں نانیاں ہو چکی ہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اُن مہمانوں میں سے اکثر جو اس نہ بھولنے والی دعوت میں شریک تھے اب ہمیشہ کی نیند سو رہے ہیں۔

میں ایک سرجن کے پاس بیٹھا تھا جو فرانسیسی زبان سے بہت اچھّی طرح واقف تھا اور میں ابھی اس زبان میں مبتدی تھا۔ میری عمر ابھی اُس منزل کو نہ پہنچی تھی جب دِل سے مشاہیر پرستی کے تمام خیالات یکسر محو ہو جاتے ہیں۔ میری رومانی نظروں کو دنیا کے عظیم الشان انسان آسمان کے درخشاں ستارے معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی ہستیاں مجھے سطحِ عام سے بلند نظر آتی تھیں۔ میری روح کو کسی ایسے وجود کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جس کے سامنے میں اپنا سرِ نیاز جھکا دوں جس کی میں پرستش کروں چنانچہ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا، جیسے امرا اور رؤسا کی اُن لڑکیوں میں سے اکثر کے ساتھ جو اس دعوت میں شریک تھیں مجھے عشق سا ہو گیا ہے۔ اِس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کم از کم اس وقت میرا درجہ اُن تمام بڑے بڑے حکما کے برابر ہے جو یہاں موجود ہیں۔

کِسی نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا یہ ایک عورت تھی جسے میں نہ جانتا

تھا اور جو رُوسی زبان میں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی سازِش سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ زرد رُو تھی اور اس کا جسم زم و نازک تھا۔ اُس کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے نقوش نمایاں تھے اور زردی اُس پر غیر معمُولی طور سے چھائی ہوئی تھی اُس کی موجودگی اس پُر مُسرت اور شگفتہ مجلس میں غم اور افسردگی کے عنصر کی ایک اجنبی آمیزش کر رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی زمہریر کی کھڑکی کُھل گئی ہے جس میں سے برفانی ہوا اپنی پوری تُندی کے ساتھ کمرے میں برف باری کر رہی ہے۔

چونکہ میں رُوسی زبان نہ جانتا تھا اِس لئے میں نے اپنے سرجن دوست سے ترجمان بننے کو کہا، اُس نے مجھے بتایا کہ اِس عورت نے کہیں سے سُنا ہے کہ تم دِل کے امراض کا بہت اچھا عِلاج کرتے ہو اور چونکہ اُس کا ایک رشتہ دار سخت بیمار ہے اِس لئے وہ تمہیں بلانے آئی ہے

ایک سپاہیانہ جوش کے ساتھ میں نے اُسے جواب دیا کہ میں اُس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں گو اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اِس عظیم الشان دعوت کی شرکت سے محروم ہو جاؤنگا۔ مگر یہی میرے لئے عورت کے بلاوے کو منظور کرنے کا سب سے بڑا باعث ہو گیا، کیونکہ نفس کی قربانی میرے نزدیک جوانی کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ اِس کے علاوہ مجھے اس پر ناز ہونے لگا کہ اتنے بڑے بڑے حکما میں سے صرف مجھے منتخب کیا گیا ہے۔ بہر حال میں نے کوئی مزید سوال کئے بغیر اپنی ٹوپی اور اوور کوٹ لیا اور اُس کے ساتھ ہولیا۔

مجھے یہ تمام باتیں اس طرح یاد ہیں جس طرح کوئی کل کا واقعہ ہو۔ مجھے یاد ہے کہ اُس عورت کے ساتھ جب میں محل کے دروازے کی طرف بڑھا تو اس وقت ایک لڑکی جو سفید لباس میں ملبوس تھی سیڑھیوں پر سے اوپر کی طرف سے آ رہی تھی جب وہ ہمارے قریب پہنچی تو کھلے ہوئے دروازوں سے جو روشنی باہر آ رہی تھی اُس وقت اُس کے چہرے پر پڑی۔ میں یہ سب کچھ اپنی چشم تصوّر میں

اب بھی دیکھ سکتا ہوں اور یہ نظارہ مجھے اُس پُرانی تصویر کی طرح نظر آتا ہے جس کا کاغذ زرد پڑ گیا ہو۔ مجھے یہ ماضی کا ایک ڈھانچ معلوم ہوتا ہے جس کی جگہ صرف ایک بوڑھے آدمی کے دماغ میں باقی رہ گئی ہو۔

گزرے ہوئے زمانہ کی یاد جہاں کچھ حسرت آفریں سی ہوتی ہے وہاں اُس میں کچھ مضحکہ خیزی بھی ضرور ہوتی ہے۔ اُن دونوں کے لباس دیکھو تو آج کل کے فیشن کا مُنہ چڑاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اگر آج کوئی اُن عورتوں میں سے کسی کو اپنے بھونڈے لباس میں دیکھ پائے۔ تو کہے کہ ایسی عورت سے بھی کوئی شادی کرے گا!

باہر آکر حُسنِ اتفاق سے ہمیں ایک معمولی گاڑی مِل گئی جو عام طور پر ماسکو کے بازاروں میں چلتی ہے اور جس کے آگے تین گھوڑے جتے ہوتے ہیں۔ عورت اُس سے کرایہ طے کر رہی تھی کہ میں نے گاڑی والے کا چہرہ لالٹین کی روشنی میں دیکھا۔ اُس کے رُخسار سُرخ تھے۔ اور جلد سخت تھی اور اُس پر جھریاں نمودار تھیں، گھنی داڑھی تھی اور ناک عام روسیوں کی طرح خفیف سی +

ہم گاڑی میں بیٹھ گئے اور اُن بازاروں میں سے گزرنے لگے جن کو جگمگاتی ہوئی دوکانوں کی روشنی نے بقعۂ نور بنا رکھا تھا۔ پھر ہم ایسے کھلے اور تاریک مقامات میں آگئے۔ جہاں نظر صرف اشیاء کے بیرونی خطوط کو پہچانتی تھی۔ کہیں کہیں اندھیری فضا کے سامنے روسی کلیساؤں کے سفید سفید گنبد بڑی آن سے کھڑے اپنی شانِ تقابل دکھا رہے تھے جن کو دیکھ کر دِل پر ایک ہیبت طاری ہوتی تھی، تمام راستے میں سوائے بندوقوں سے مسلح سپاہیوں کے ایک دستے کے ہمیں کوئی راہ گیر نظر نہ آیا۔ اب شہر کے نواح سے گزر کر ہم دیہات میں پہنچ چکے تھے۔ قدیم شہر کے شور و غوغا اور چکا چوند کو ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ یہاں تاریکی اور بھی زیادہ تھی۔ ہر طرف موسم سرما کی سکوت آمیز شوکت چھا رہی تھی۔ ہر طرف برف ہی برف نظر آتی تھی۔ زمین پر، درختوں پر، اور درختوں

کی شاخوں پر ہر جگہ برف تھی۔ اور ایک سکون کا مل تھا۔ جس سے اول اول مجھے کچھ تسکین سی ہوئی مگر بہت جلد میرے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے۔ اور میں محل کی روشنی اور گرمی کے لئے جس کو میں نے بے سوچے سمجھے چھوڑ دیا تھا بہت متاسف ہوا۔ میں اپنی حماقت کو صلواتیں سنانے لگا۔ سفر کے سکوت اور یکسانی سے مجھ پر نیند کا سا غلبہ ہونے لگا۔ مجھے اپنی حالت دگرگوں معلوم ہونے لگی۔ کبھی سمجھتا کہ میں گاڑی میں اکیلا ہوں۔ اور کبھی جانتا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ بہت ہی بوڑھا۔ مجھے ڈر آنے لگا کہ کہیں بھیڑیے حملہ نہ کر دیں۔ اور میں نے چاہا کہ کاش میں اپنا پستول ساتھ لے آتا۔ میں نہ جانتا تھا کہ میں اس جرأت کو کیا کہوں جو مجھے یہاں لے آئی تھی۔ کیونکہ ایک ایسے ملک میں جہاں ہر طرف خفیہ انجمنوں کا جال پھیلا ہوا ہو۔ ہر ممکن خطرہ پیش آسکتا ہے۔ کیا میں کسی ایسے ہی دام میں پھنسنے کے لئے جا رہا تھا؟ کیا مجھ پر انہیں جاسوسی کا شک ہوا تھا۔ یا کیا انہوں نے مجھے لوٹنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے لئے انہوں نے کسی امیر آدمی کو کیوں انتخاب نہ کیا۔ میں نے ہزاروں نظریے قائم کئے اور پھر سب کو رد کر دیا۔

میں تقریباً سو رہا تھا جب ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔ کسی کسی مکان کی کھڑکیوں میں سے اب تک روشنی نمودار تھی۔ گھوڑے ہانپ رہے تھے اور اُن کے مُنہ سے کف جاری تھا گاڑی ایک سرائے نما عمارت کے سامنے کھڑی ہوئی۔ دروازہ کھُلا اور مجھے تمباکو کے دھوئیں کے ایک مرغولے میں سے کسی شخص کی تاریک صورت نظر آئی۔ جس نے ایک چغہ اور لمبے بوٹ پہن رکھے تھے۔ ہم گاڑی میں سے باہر آگئے۔ اور مجھے اپنی مضبوط ٹانگیں پھیلا کر ذرا اطمینان حاصل ہوا۔ گاڑی والا سرائے والے سے بات کر رہا تھا مگر وہ عورت مجھے اندھیرے میں اور آگے لے گئی۔ میں اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر حملہ ہوا تو اپنی پوری طاقت سے اُس کی مدافعت کروں گا۔ چاروں طرف کامل سکوت تھا۔ ہم برف میں سے گزر رہے تھے۔ راستے میں ہم نے ایک دوسرے سے کوئی گفتگو نہ کی تھی۔ میں نہایت پریشان تھا۔ اور میرا دماغ عالمِ لاہوت کے متعلق اُن خیالات سے

پُر تھا۔ جن کا تذکرہ ہم شام کے وقت کر رہے تھے۔ مجھے وہ کہانیاں یاد آ رہی تھیں۔ جو میری انّا مجھے سُلانے کے لئے سنایا کرتی تھی، اُن بھوتوں کی کہانیاں جو نئی کھدی ہوئی قبروں کے اوپر منڈلایا کرتے ہیں۔ اور میں اپنے دِل کی آنکھوں سے قبریں، کفن، کالی کالی شمعیں جو ماتم کے دِنوں میں جلائی جاتی ہیں اور تمام وہ وہمی نظارے دیکھ رہا تھا جنہوں نے موت کے خیال کو آلودہ کر رکھا ہے اور اُسے خوفناک اور وحشت انگیز بنا دیا ہے۔ سیاہ اور خاموش تاریکی، اُس کا سحر، رات کی برفانی سردی، یہ سب مجھے اُس رات زندوں کی دنیا کی بجائے مردوں کی دنیا کی چیزیں معلوم ہوتی تھیں۔

آخر کار ہم ایک تاریک سے دیہاتی مکان کے باغ کی دیواروں کے پاس پہنچ گئے۔ مجھے کسی کے پاؤں کی چاپ قریب آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ میں یہ خیال کرکے کہ شاید وہ عورت مجھ سے گفتگو کرنا چاہتی ہے، پیچھے کو مڑا۔ میری حیرت اور خوف کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ غائب ہو چکی ہے۔ میں اب اکیلا تھا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ اتنی جلد اور اتنے نامعلوم طریقے سے وہ کہاں چھپ گئی مگر مجھے اِن خیالات میں محو ہونے کا زیادہ وقت نہ مِلا کیونکہ اِسی وقت دروازہ کھلا اور میں نے اپنے سامنے ایک لڑکی کو پایا۔ میں نے فرانسیسی زبان میں اپنے آنے کا مقصد بیان کر دیا۔ اُس نے رُکتے رُکتے جواب دیا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کیونکہ گھر میں سب کی صحت بہت اچھی ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ آپ اندر جا کر میرے والد سے گفتگو کیجئے وہ فرانسیسی مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ میں بالکل مایوس ہو رہا تھا لیکن پھر بھی اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے میں اُس کے پیچھے ہو لیا۔ کمرے میں ایک بوڑھا آدمی آرام کرسی پر مٹی کے ایک چولھے کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کر کسی ماہر امراض کے لئے یہ معلوم کر لینا بالکل دشوار نہ تھا کہ یہ شخص دِل کی کسی بیماری میں مبتلا ہے۔ اُس کے چہرے کے ارغوانی رنگ میں نیلاہٹ

کی ہلکی سی جھلک نمایاں تھی۔ اور ناک کسی شرابی کی طرح سُرخ تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک سگریٹ تھا جو اُس کے دِل کی حرکت کے ساتھ ساتھ کانپتا تھا۔

میں نے اُسے سلام کیا اور اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ بوڑھے آدمی نے اپنی عینک کے اُوپر سے میری طرف دیکھا اور تیوری چڑھالی۔ ظاہر تھا کہ اُس نے میرے بیان کے ایک لفظ کا بھی اعتبار نہیں کیا۔ اور وہ میرے حقیقی ارادوں سے واقف ہونا چاہتا ہے۔ اُس کے غصّہ کو کم کرنے کے لئے اور بے وقت اُس کے آرام میں خلل انداز ہونے کی توجیہ کے لئے میں نے اُسے سارا قِصّہ سنا دِیا۔ اُس نے نہایت توجّہ سے میری کہانی سنی اور جب میں ختم کر چکا تو اُس نے کہا:۔

”میں نہیں جانتا کہ تمہارے یہاں آنے کو میں کیا سمجھوں۔ کچھ بھی ہو تم غلطی پر ہو۔ یہاں کوئی بیمار نہیں ہے۔ مگر چونکہ تم نے بے فائدہ بہت سی تکلیف اُٹھائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں ذرا دیر آرام لے لو۔ آج رات تم ماسکو واپس نہیں جا سکو گے۔ اس لئے تمہیں یہیں سرائے میں قیام کرنا پڑے گا۔ میں اپنی میزبانی تمہیں پیش کرتا مگر چونکہ ہمارے ہاں مہمان نہیں آتے، اس لئے ہم تمہارے آرام کے لئے کوئی خاطر خواہ انتظام نہ کر سکیں گے۔“

اُس نے سگرٹوں کا ڈبہ میری طرف سرکا دیا اور اُس کی لڑکی میرے لئے چائے بنالائی اِسی عرصہ میں قریباً قریباً ایک نیم شعوری کی حالت میں مَیں نے ایک نظریہ قائم کیا۔ میں نے سمجھا۔ کہ ہو نہ ہو وہ عورت اسی شخص کی حالت کو سمجھ کر مجھے یہاں بُلا لائی ہے۔ گو خود اسے اپنی مرض کا اندازہ نہیں۔ غالباً اُس نے دیکھا ہو گا کہ ڈاکٹر کا مشورہ نہایت ضروری ہے اور اُس نے مصلحت اندیشی سے کام لے کر اپنے آپ کو ظاہر کئے بغیر ایک ڈاکٹر اُس کے پاس بھیج دیا ہے۔ میں نے بھی اپنا کام پوری حکمت عملی سے انجام دیا ہوتا مگر سفر کی کوفت نے مجھے اس کی اجازت نہ دی۔

میں نے بوڑھے آدمی سے کہا۔ "آپ بالکل اچھی طرح ہیں نا"؟ وہ مسکرایا اور کہنے لگا:۔

"میری عمر اس وقت اِکسٹھ برس کی ہے اور اس تمام عرصہ میں مَیں ایک مرتبہ بھی بستر پر نہیں پڑا۔ بڑھاپے کے ساتھ کمزوری یقیناً آجاتی ہے۔ میں اب اتنا طاقتور نہیں جتنا کہ ہُوا کرتا تھا، اور مجھے ضیق النفس کی بھی تھوڑی سی شکایت ہے۔ اگر اُسے نظر انداز کر دیا جائے تو میں بالکل تندرست ہوں۔ نہیں ڈاکٹر! تم مان جاؤ۔ میرے ہاں سے تم ایک پیسہ بھی نہ کما سکو گے"!

گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ کانگریس اور پیرس کی زندگی پر باتیں شروع ہوئیں۔ بوڑھے کی دُبلی پتلی شرمیلی لڑکی اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ لیکن اُس نے گفتگو میں کوئی حصّہ نہ لیا۔ لڑکی کے باپ کی گفتگو میں دانشمندی اور بذلہ سنجی دونوں موجود تھیں۔ اور میں اِن صفات کو ایک گوشہ نشین میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

غالباً میری گفتگو نے اُس کی طبیعت کو شگفتہ کر دیا تھا، کیونکہ اُس نے طالب علمی کے زمانے کی باتیں، اپنی جوانی کی غلط کاریاں اور اُس زمانے کے حالات جب وہ ایک نوجوان وکیل تھا سب سنا ڈالے۔ کوئی ایک گھنٹے تک اُس نے اپنی بھولی بسری جوانی کو اپنی باتوں سے پھر زندہ کر دیا۔ اِسی وقت شمع کچھ اس طرح ٹمٹمائی گویا وہ بُجھنے کے قریب ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اِس سے مجھ پہ ایک گہرا اثر کیوں ہُوا درآں حالے کہ اس میں کوئی غیر معمولی بات بھی نہ تھی۔ مومی بتیاں لائی گئیں مگر اب سحر ٹوٹ چکا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے کوئی نوجوان خاوند یکایک کوئی بدشگونی دیکھ پائے۔ گھڑی بارہ کا گھنٹہ بجا رہی تھی کہ میں وہاں سے رُخصت ہُوا۔ بوڑھے وکیل نے مجھ سے دوسرے دِن دوبارہ مِلنے کو کہا اور میں نے اس کا بے ساختہ وعدہ بھی کر لیا۔ اُس کی لڑکی دروازے تک میرے ساتھ آئی اور کہنے لگی:۔

"ڈاکٹر! مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ تم آگئے گو تمہارا آنا غلطی ہی سے ہُوا۔ میرے والد

سالہا سال سے کبھی اتنے خوش نہیں ہوئے جتنے کہ آج ۔ کل ضرور آنا ۔ میں چاہتی ہوں کہ ہمارے ہاں لوگ آیا کریں ۔ اِس سے اُن کی صحت اچھی رہے گی "۔

میرے دِل میں رہ رہ کر یہ خیال اُٹھتا تھا کہ میری خاموش ہم سفر مجھے ضرور راستے میں ملے گی لیکن مجھے کوئی نظر نہ آیا ۔ سرائے میں ابھی شمعیں جل رہی تھیں اور جب میں اندر داخل ہوُا تو سرائے والا کچھ لوگوں کو جنہوں نے روسی طرز کی پوستینیں پہن رکھی تھیں ، اخبار سنا رہا تھا ۔ اُن سب کے لمبے چہرے اور لمبے بال تھے اور وہ ایک ہی انداز میں یعنی اپنی ٹھوڑیوں کو اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر بیٹھے ہوئے تھے ۔ دوسری طرف کچھ تو ایک قسم کی تیز رُوسی شراب پی رہے تھے اور اکثر حقہ نوشی میں مصروف تھے ۔

سرائے کی فضا میں دم رُکا جاتا تھا اور تمباکو کے دھوئیں کا ایک دَل بادل چھت کو چڑھ رہا تھا ۔ میں نے اشاروں سے سرائے والے کو سمجھایا کہ مجھے رات گزارنے کے لئے کمرے کی ضرورت ہے ۔ چنانچہ وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں لے گیا ۔ جہاں ایک بہت بڑا پلنگ بچھا ہوُا تھا ۔

دیوار جس پر سفیدی ہو رہی تھی یونانی علمائے دین کی تصویروں سے مزیّن تھی ۔ سرائے والا موم بتیاں لے آیا اور لکڑیوں کا ایک ڈھیر لگا کر اُسے بھی آگ لگاتا گیا ۔ میں سونا نہ چاہتا تھا اس لئے میں نے سگار سُلگایا اور ایک آرام کُرسی پر بیٹھ کر شام سے لے کر اب تک جو جو واقعات پیش آئے تھے اُن پر غور کرنے لگا ۔

میں اپنا سگار ختم کر چکا تھا کہ مجھے سیڑھیوں میں سے کسی کی آواز سنائی دی ۔ میں کانپ گیا ۔ میں نے سمجھا یقیناً یہ کوئی جال ہے جس میں میں آ پھنسا ہوں اور لُٹا ہی چاہتا ہوں ۔ مگر میں نے جلد ہی معلوم کر لیا کہ سرائے والا اور بوڑھے وکیل کی بیٹی جن کے گھر میں مَیں نے

شام کا وقت گزرا تھا میری طرف آ رہے ہیں لڑکی پریشان معلوم ہوتی تھی لیکن پھر بھی اُس نے اپنے حواس کو برقرار کر رکھا تھا۔

لڑکی نے کہا "حسن اتفاق کی بات ہے کہ تم یہیں تھے۔ والد ابھی اپنے بستر میں لیٹے ہی تھے کہ اُن پر مرض کا ایک زبردست حملہ ہوا، شاید آج رات زیادہ ہلنے جلنے سے انہیں تکلیف ہو گئی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں تکلیف دی مگر مجھے اُمید ہے کہ تم میرے ساتھ ضرور چلو گے شاید تم اُن کے لئے کچھ کر سکو"

جس کمرے میں وہ مجھے لے گئی وہ بلند اور نامرغوب سا تھا۔ ہوا میں سے نوشادر کی تیز بُو آ رہی تھی۔ میز پر ایک لمپ جل رہا تھا اور وہ تمام چیزیں اُس پر رکھی تھیں جو عموماً پلنگ کمرے میں ہوتی ہیں۔ مثلاً بالوں کا برش، استرا، گھڑی اور ایک بڑا سا ٹائی پن جس پر اُبھرے ہوئے نقش بنے تھے۔

انگیٹھی میں آگ کے آخری شعلے بجھ رہے تھے۔ بستر کے پردے ہٹا دیئے گئے تھے ایک بوڑھا نوکر بستر کے پاس کھڑا اُونگھ رہا تھا اور ایک نوکرانی کرسی پر بیٹھا رو رہا تھا۔

میں نے بوڑھے مریض کے دل کی حرکت سننی چاہی مگر اُس کے سینے میں اب کوئی سانس باقی نہ رہی تھی۔ موت اپنا کام کر چکی تھی اور اعضا میں سختی نمودار ہو رہی تھی۔ میں نے لڑکی کو اُس کے باپ کی موت کی خبر جس قدر نرم پیرایہ میں ممکن تھی سنا دی۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی سمجھ چکی تھی اور اُس نے اپنی پوری نسوانی قوت سے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔

میں اپنے ہاتھ دھو رہا تھا اور دن کے تمام واقعات پر غور کر رہا تھا کہ میری نظر ایک تصویر کے چوکھٹے پر پڑی۔ اُسے مصور نے ۱۸۳۰ء کے انداز مصوری پر بنایا تھا اور جس نوجوان عورت کی یہ تصویر تھی اُس کا لباس لمبا اور بال گندھے ہوئے تھے۔ کسی شک و شبہ کے بغیر میں نے

اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی عورت تھی جو ماسکو کے محل کے ہال میں مجھ سے ملی تھی اور میرے ساتھ یہاں تک آئی تھی۔ میری حیرت اس قدر بڑھی کہ میرے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ لڑکی اور اُس کے نوکروں نے متعجب ہو کر میری طرف دیکھا۔

تصویر کی طرف اشارہ کر کے میں نے کہا "یہ کون ہے؟ یہی عورت تو مجھے یہاں لائی تھی"

لڑکی نے غور سے میری طرف دیکھا۔ اُس کے اُوپر کے ہونٹ میں ذرا سا خم آگیا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ اُس نے میری بات پر اعتبار نہیں کیا۔ مگر مجھ کو بے چین دیکھ کر اُس کے چہرے کا رنگ بھی زرد پڑ گیا۔

اُس نے کہا "یہ میری ماں ہے۔ بیس برس ہوئے جب میں پیدا ہوئی تھی تو وہ مر گئی تھی"۔

"فرٹز ہاپمین"

بلجیم

ویرے کی رُوح

چوک والی سرائے کی لڑکی نے مجھ سے پُوچھا "کیا تم نے اُس لڑکے کو دیکھا ہے جو ہر وقت اپنے راگ کی دُھن میں محو گلیوں میں گھومتا پھرتا ہے؟" میں اُس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ تین روز سے میں ویرے میں مقیم تھا مگر اب تک اس وضع کا کوئی شخص مجھے وہاں نظر نہ آیا تھا "میرے اللہ!" میں نے اپنے دِل میں کہا "کیا ویرے میں کوئی ایسا احمق بھی ہے جو اس جنون میں مبتلا ہے؟ موسیقی کو یہاں کون سنتا ہے؟ اکثر گھروں کے دروازے بند ہیں۔ شاذونادر ہی کوئی بوڑھا یا کوئی بڑھیا، یا کوئی خوبصورت لڑکی اُس افتادہ وضع کی ٹوپی پہنے جس کے دونوں رُخوں پر جھومر لٹکتے ہیں کسی کھڑکی میں کھڑی نظر آتی ہے۔ اُس کے نغموں کو کون سنتا ہو گا! ویرے کے اس عجیب وغریب چھوٹے سے گاؤں میں یہ سب لوگ ممیوں کی طرح نظر آتے ہیں جو اپنے سبز اور نیلے شیشوں میں نمائش کے لئے رکھی گئی ہوں۔"

یہ ہے میرا خیال اس جگہ کے متعلق۔ اگر میں اتفاقاً اس لڑکے سے کہیں ملتا تو میں اپنی اُنگلی کو اپنے ہونٹوں پر رکھ کر اسے متنبہ کرتا کہ دیکھو وہ سکوت جو اِن گھروں کے کونے کونے پر محیط ہے تمہارے راگ کی آواز سے ٹوٹ جائیگا۔ آفتاب خود یہاں محوِ خواب رہتا ہے۔ اُس کی دھوپ سونے

ڈھکیلیوں کی طرح سنسان گلیوں میں بکھری رہتی ہے۔ وہ اِس بستی کو جگا جگا کر تھک گیا ہے جو کبھی زندہ تھی اور اب ایک گہری نیند میں پڑی سوتی ہے۔ اُس کی روشنی مکانوں کی دہلیزوں پر اُس سائل کے قدموں کے نشانوں کی طرح ماند پڑ جاتی ہے۔ جو ہر روز صبح آ کر ایک ایسے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے جسے کوئی نہیں کھولتا۔ اِن گھروں کے دروازوں کو اندرونی ظلمت نے زنجیریں ڈال رکھی ہیں۔

اگر میں سو سال بھی زندہ رہوں تو میں وِیرے کی اس گلی کو اور اُن چھوٹے چھوٹے مکانوں کو نہ بھولوں گا جو سڑک پر اس طرح باہر کو نکلے ہوئے ہیں جیسے کوئی ہاتھ جوڑ کر دعا مانگ رہا ہو زندگی اس مقام سے اتنی دور ہے کہ بعض اوقات انسان خود اپنی ہستی پر شک کرنے لگتا ہے اِس کے آگے آگے ایک دُھندلا سا سایہ چلتا معلوم ہوتا ہے۔ وہ نہیں جان سکتا کہ یہ اسے کہاں لے جائے گا مگر یہ گرجا کی طرف لے جاتا ہے جہاں اور سب لوگ جا چکے ہیں۔ اِس سے آگے فصیل کے پار سمندر موجیں لے رہا ہے اور جہاز کھڑے ہیں۔ آسمان کا گنبد بادلوں کے بوجھ سے سمندر کی وسعت پر جھکا پڑتا ہے۔ اِس مقام پر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں خود بخود مر رہا ہوں، جیسے میرا کمزور دِل بھیڑا جا رہا ہے، مگر میری انگلیاں سورج کی طرف ایک نامعلوم سا اشارہ کرتی تھیں۔

میں نے اپنے دِل میں کہا "یا تو یہ شریر لڑکی میری سادگی سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہی ہے اور یا اُس نے کسی ایسی بات کا تذکرہ کیا ہے۔ جسے واقع ہوئے مدتیں گزر چکی ہیں جب ابھی یہاں سب زندہ تھے"

اسی وقت گھنٹے کی سُریلی اور دھیمی آواز میرے کان میں پڑی۔ یہ آواز نہایت سست رفتار کے ساتھ گھنٹہ گھر سے نیچے اُتر اُتر کر مجھے محزون و مغموم کئے دیتی تھی۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میں نے یکایک ایک ایسا راگ سُن لیا ہے جو ویرے کی آخری گھڑیوں کے کرب و اضطراب کی

کہانی سنا رہا تھا۔

چوک ہی میں ایوانِ بلدیہ کی خوبصورت عمارت تھی، جسے نایاب موتیوں کی ڈبیا کی طرح سجایا گیا تھا۔ خوبصورت تاکوں میں بادشاہوں اور اولیاء و صلحا کے بلند قامت مجسمے رکھے تھے۔ میں سمجھتا ہوں ــــــ لیکن اب ویرے کی تاریخ کون جانتا ہے؟ ــــــ مجھے یقین ہو گیا کہ شاید یہی گھنٹہ ہو گا جس کی نسبت اس عجیب و غریب آنکھوں والی لڑکی نے مجھ سے کہا تھا۔ اور میرے دل میں اُن قدیم مجسموں کی نسبت نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگے جو یوں بے باکانہ ہر وقت سمندر کی طرف ٹکٹکی باندھے رہتے تھے۔ انہیں یہاں کھڑے صدیاں ہو گئی تھیں اور وہ اپنی اکڑی ہوئی گردنیں اُٹھائے ہوئے کسی اُس واقعہ کے منتظر تھے جو کبھی وقوع میں نہ آیا تھا۔ شاید اِن کی اندھیری آنکھیں جو پتھر کو تراش کر بنائی گئی تھیں، اُن بیڑوں کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں جنہوں نے مدتیں ہوئیں ایک دن اس بندرگاہ سے لنگر اُٹھایا تھا۔ چوک کے قریب ہی ایک قدیم گرجا کا مینار تھا جس کی کنجیوں کو سمندر کی تہ میں سوتے ہوئے زمانے گزر گئے تھے۔

زمانے کی نیرنگی پر میں ذرا مسکرایا۔ اِس بستی کو سب چھوڑ گئے تھے اور شہر پناہ کے باہر سمندر کے کنارے کنارے جا بسے تھے، صرف چند لوگ پیچھے رہ گئے تھے ــــــ وہ عمر رسیدہ لوگ جن کی ناکوں کے نیچے اس قسم کی میل نمایاں تھی جیسے موت کی پھپھوندی لگی ہو لیکن پتھر کے بت ہاتھوں میں تلواریں اور بادشاہی عصا تھامے ہوئے کھڑے تھے جیسے وہ اب بھی لوگوں پر حکومت کر رہے ہیں۔

میں گرجا کے دروازے پر گیا اور اُسے تین دفعہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔ میں نے یہ حرکت محض بہ سبیل تمسخر کی تھی ورنہ میں جانتا تھا کہ خدا کے اِس قدیم گھر میں میری دستک کو سننے والا کوئی نہیں۔ میں حیران رہ گیا جب یکایک دروازہ کھلا اور اُس میں سے ایک عجیب و غریب

آنکھوں والا سجیلا نوجوان نمودار ہوا۔ اُس نے چاندی کے بٹنوں والی مخمل کی ایک چھوٹی سی جاکٹ پہن رکھی تھی جیسی عام طور پر زی لینڈ کے لوگ پہنتے ہیں۔ اُس کے پاس ایک بربط تھا جیسا عموماً بندرگاہ کی دکانوں میں فروخت ہوتا ہے اور جسے جہازی ملّاح بجاتے ہیں اور شام کی تیرہ فامی کو اُس کے سیمیں سُروں سے روشن کر دیتے ہیں، کبھی اس میں سے ایک تھرتھراتا ہوا نغمہ پیدا کرتے ہیں اور کبھی ایک ہی لمبی تان سے سننے والوں کو مست کر دیتے ہیں، نوجوان کی صورت سے ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے اسے گہری نیند سے زبردستی بیدار کر دیا گیا ہے۔ متعجب ہو کر میں نے خیال کیا، کیا یہی وہ لڑکا ہے، جس کے متعلق مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ ہر وقت اپنے راگ کی دھن میں محو گلیوں میں پھرتا رہتا ہے؟

میری طرف دیکھے بغیر وہ میرے ساتھ ہو لیا اور ہم درے کی عمارتوں کی گلابی دیواروں پرانے شیشے کی لمبی لمبی کھڑکیوں اور گوبی اور پیاز کے چھوٹے چھوٹے باغوں کے پاس سے گزرتے چلے گئے۔ چُپ چاپ وہ چوک سے آگے نکل آیا۔ اِسی وقت ایک مرتبہ پھر جرس کی بلوریں آواز ویرے کے آخری کرب و اضطراب کا اُداس گیت گاتی ہوئی سنائی دی۔ ہوا نہایت نرمی سے اِس نغمے کو منتشر کرتی ہوئی سمندر کی جانب مکانوں کی چھتوں پر اڑاتی پھری۔ انوکھے نوجوان نے بربط کو اپنے کندھے کا سہارا دے لیا اور اس کی انگلیاں بربط کے تاروں پر رقص کرنے لگیں مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نغمے کے معنی صرف اُس کے لئے ہیں اور کسی کے لئے نہیں۔ اُس نے اپنے سر کو جھکا کر بربط کے قریب کر لیا اور کچھ اس انداز سے مسکرایا کہ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے اب اُس کو اس دنیا کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری روح کے عمق عمیق میں کوئی کہہ رہا ہے کہ اس لڑکے کی عقل و ہوش پر کسی نامعلوم صدمہ کا اثر ہے اور ویرے کے گاؤں کا راز بھی اس سے کچھ تعلق رکھتا ہے۔ لیکن یہ احساس مجھ پر ناقابل

بیان طور پر طاری تھا۔

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے مجھے سخت تکلیف ہوئی۔ نوجوان نے نظر اٹھائی۔ اور اُن عظما و ابطال کی طرف دیکھا جو اپنی بلند کرسیوں پر کھڑے تھے اور پھر ایک نگاہ سمندر کی دوریوں پر ڈالی۔ اُس کی آنکھیں اس طرح روشن تھیں جیسے ان میں کسی اور دنیا کی روشنی چمک رہی ہے۔ بربط زیادہ تیزی اور تندی سے بجنے لگا، اُس کی آواز میں دیوانگی سرایت کر گئی اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے بستی کی قدیم روح اس نوجوان کی چابک انگلیوں کے نیچے یکایک مرتعش ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ ایک جہازی ملاح کی بین کی طرح اپنے ساز کو ایک عجیب رقص کے ساتھ بجاتا ہوا گلیوں سے گزرتا گیا وہ زمین کو اپنے پاؤں کے نیچے اپنی ایڑیوں سے دہلاتا تھا، اپنے بربط کو سر سے اونچا اٹھا کر گھماتا ہوا اس تیزی سے نیچے لاتا تھا کہ وہ زمین کو چھونے لگتا تھا۔ اور پھر یکایک شاندار متانت کے ساتھ ایک جگہ کھڑے ہو کر، آنکھیں بند کر کے چہرے پر ایک پُر تکلف تبسم پیدا کرتا تھا۔ جو ہمیشہ اُس کے اُس پُر سوز رقص و سرود کا ہم آہنگ ہوتا تھا جس میں ایک قاتل یا عاشق کا شوق تباہ تڑپ رہا ہوتا۔

پھر اُن چھوٹے چھوٹے گھروں میں بتدریج جان پڑنے لگی اور زندگی، جو بند دروازوں کے اوجھل مدتوں سے سوئی پڑی تھی از سر نو بیدار ہونے لگی جیسے وہ صرف اس زردرو بربط نواز نوجوان کے لئے چشم براہ تھی، کھڑکیوں میں اُن نوجوان لڑکیوں کے ہنسی سے کھلے ہوئے چہرے نظر آنے لگے جن کے سروں کے لباس پر زیبائش کے لئے عجیب قسم کی پُر پیچ دھاریاں بنی تھیں جیسے ہرن کے سینگ ہوں۔ ویرے کی تمام حسین لڑکیاں ڈوری دار پردوں کے پیچھے منہ کھولے ہوئے یوں آ کھڑی ہوئیں جیسے گلاب کے پھول شہد کی مکھیوں کے دل بادل میں سے نظر آ رہے ہوں۔ انہیں یوں تر و تازہ چہروں کے ساتھ موت کی گہری تاریکیوں میں سے نکل

کر کھڑکیوں کے پاس آتے ہوئے دیکھ کر مجھے خیال ہؤا کہ یہ گھر درحقیقت گڑیوں کے مکان ہیں جن میں سحر کے ذریعہ سے زندگی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں ——— وِیرے کی اُن گڑیوں کے گھر جن کی باہیں حسین و ملیح ہیں۔ جن کے بڑے بڑے اُبھرے ہوئے لہنگے ہیں جن کے زنگین سر اور سمندر کی سی نیلی آنکھیں ہیں۔

نوجوان سازندہ یوں ہی گلیوں میں پھرتا رہا، اپنے وحشی راگ کی مغموم و مسحور دھن گتیں بجاتا ہؤا جن کو سُن کر آنکھوں میں آنسو بھر آئیں کیا یہ وِیرے کی رُوح تھی جو اپنی کھوئی ہوئی محبت پر خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی اور اُن لڑکیوں کے لئے تاسف انگیز آہیں بھر رہی تھی جو اب اپنی قبروں میں سو رہی تھیں اور اُن نوجوان مردوں کے لئے جنہوں نے اپنے جہاز سمندر میں ڈالے، اور پھر کبھی واپس نہ لوٹے؟ آخر بربط کی یہ آواز دور سمندر کے ریتلے ساحل میں جا کر جذب ہو گئی۔

جب میں واپس ہوٹل میں آیا تو میں نے اس لڑکی سے کہا "تم نے درست کہا تھا، یہاں ایک لڑکا ہے جو اپنے راگ کی دُھن میں محو گلیوں میں گھومتا پھرتا ہے۔ بے شک وہ ایک رُوح ہے عذاب میں مبتلا، کیا یہاں کوئی جانتا ہے کہ اس پر کیا مصیبت پڑی ہے؟" اِس گربہ چشم شریر لڑکی نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔

"اُس سے پوچھو"۔ اُس نے کہا "وہ مجھ سے بہتر طریق پر تمہیں بتا سکے گا"۔

کہانی بالکل معمولی تھی ایک دِن یہ لڑکا اُن گڑیا سی لڑکیوں میں سے ایک کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گیا جو اب آ آ کر کھڑکیوں میں کھڑی ہوتی ہیں۔ ایک شام کا ذکر ہے کہ یہ اپنا بربط لئے ہوئے ناچنے گانے کے لئے اُس لڑکی کے گھر آیا۔ اور لڑکے بھی اِسی گھر میں آیا کرتے تھے اور اُن کو بھی اس لڑکی سے اُنس تھا لیکن اُس کو یہ ناگوار تھا۔ اِس لئے جب وہ رشکِ رقابت سے سُلگنے لگا تو لڑکی نے کہا "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ مجھے تم سے محبت ہے مگر مجھے اُس سے بھی

محبت ——— اُس لڑکے سے جس کے گھر کا دروازہ ہمارے دروازے کے سامنے ہے۔ اور مجھے اُس لڑکے سے بھی محبت ہے جو تمہارے جانے کے بعد یہاں آتا ہے . . . . . . مجھے یہ سب اچھے لگتے ہیں!" ایک دفعہ ایک جھاڑی کے پیچھے سے اُس نے دیکھا کہ وہ اُس نوجوان کی آغوش میں ہے جو اس سے پہلے یہاں پہنچ چکا ہے۔ اُس نے جھٹ چاقو نکالا اور دونوں کو مار ڈالا"۔

"اور اُس دن سے اب تک وہ گلیوں میں اپنا بربط بجاتا پھرتا ہے وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا بچے اس پر پتھر پھینکتے ہیں اور لڑکیاں ہنستی ہیں۔ وہ اُن کی طرف دیکھتا تک نہیں" اُس شخص نے کہا جو کہانی سنا رہا تھا۔

لیکن مجھے اس بیان پر پوری طرح یقین نہ آیا۔ اشیاء کا ظاہر ہی حقیقی معلوم ہوتا ہے ورنہ بڑے بڑے حقائق کے پردے میں بھی کچھ پوشیدہ معانی ہوتے ہیں انہیں کی جستجو کرنی چاہئے کیونکہ یہ ظاہر سے زیادہ خوبصورت ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ لڑکا ویرے کی رُوح ہے۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ وہ کیوں گرجا کے دروازے سے نمودار ہوا! + تو اے ویرے کی بستی اور یہ نیم مجنون لڑکا ایک ہی جنونِ خاموش کا شکار ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کی ہواؤں نے تمہارے سر پھیر دیئے ہیں۔ تم کسی ایسی چیز کو کھو چکے ہو جو اب کبھی تمہیں نہ مِل سکے گی۔ وہ چیز جس کے نغمے تمہارا جرس گاتا ہے اور جس کی زاریاں اس بربط کی ہچکیوں میں ہم سنتے ہیں۔

ویرے میں ایک نوجوان شخص ہے جو عموماً ساحل کے رنیتلے ٹیلے کی طرف جاتا ہے اور سمندر کی غیر متناہی وسعتوں کے نظارے میں محو ہو جاتا ہے +

"کیملّے لی مونیر"

بلگیریا

مسرّت

وہ نوجوان نازک بدن اور خوبصورت تھا۔

کون سی چیز تھی جو اُسے حاصل نہ تھی؛

......مسرّت تھا......۔

ہمیشہ، ہر وقت، ہر جگہ تمنا ایک سایہ کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے رہتی تھی.... بیتاب تمنا۔ دن بھر اُس کا لگاتار چلنے والا دل اُس کی گرفت میں رہتا تھا اور اُس کی تمنا سے بھری ہوئی نگاہیں فضا میں نامعلوم سرزمینوں کے لئے آوارہ رہتی تھیں۔

اور وہ کیا چاہتا تھا؟

....کچھ.....سب کچھ!

بلبل کلی کو سینے سے لگا کر پُردرد گیت گانے لگی اور اُس کی ایک ایک گنگری صبح کی ہلکی نسیم کی طرح دور دور پہنچنے لگی۔

ہر چیز خاموش ہو گئی، تمام سننے والوں نے اپنی سانس روک لی۔ اور آسمان اور تارے اور چاند تک مسحور ہو کر یہ نغمہ سننے لگے۔

وہ سن رہے تھے اور کیف اور محبت کے جوش سے بےخود ہو رہے تھے۔

کبھی کبھی جب بلبل ذرا ٹھہر جاتی تھی تو کیف اور پرشوق آرزو کی ایک آہ کائنات میں

گونج جاتی تھی۔

"آہ!" زمین کے منہ سے نکلا۔ اور یہ آہ درختوں تک، گھاس تک، ستاروں تک اور چاند تک پہنچ گئی اور دور پہاڑوں کی چوٹیوں سے اس کی ایک دھیمی سی گونج سنائی دی۔

ہر چیز اس خواب سحر میں مدہوش آہیں بھر رہی تھی، اور ان آہوں میں محبت زدہ تمنا چھپی ہوئی تھی بلبل گاتی رہی...... چھٹکی ہوئی پرکیف چاندنی نے گلاب کی جھاڑیوں کو اور بلبل کو اپنی نرم نرم آغوش میں لے رکھا تھا اور ستارے محبت کے راگ کو سن رہے تھے اور ایک نازک تبسم اُن کے ہونٹوں پر کھیل رہا تھا اور وہ کہتے تھے "گائے جا، پیاری بلبل، گائے جا!"

بلبل اپنے لطیف نغموں میں ڈوبی ہوئی محبت کے سوز میں مگن تھی اور گلاب کی کلی کو اپنے سینے سے لگا لگا کر کہہ رہی تھی: "کھل اے محبوب! مجھے بس ایک دفعہ اپنی اچھوتی خوشبو سے اپنا مشام جاں معطر کر لینے دے! بس ایک مرتبہ میرا سر اپنی سُرخ سُرخ پنکھڑیوں میں بس جانے دے!......"

یوں ہی بلبل منتیں اور التجائیں کرتی رہی اور گاتی رہی یہاں تک کہ بہت سی رات گزر گئی۔ اور پھر اس کے کھنکھناتے ہوئے نغمے دھیمے پڑنے شروع ہوئے۔ اُس کی بلند سے بلند تر ہونے والی آوازیں ناسکوں پذیر تمنا سسکیاں بھرنے لگی یہاں تک کہ آخر یہ مغنیہ ایک لمبی آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

اور اس آہ میں سے جو دیر تک گلاب کے پودوں کے اُوپر منڈلاتی رہی آرزو ناکام آرزو کے آنسو ٹپکتے رہے۔

نوجوان دیر تک بلبل کا گانا سنتا رہا۔ بلبل خاموش ہو گئی۔ مگر وہ وہاں سے نہ ہلا۔ بے خواب رات کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھائے وہ کھڑا رہا۔

آرزو کا کھوکھلا کر دینے والا گھن اُس کی رُوح کی گہرائیوں میں اترتا جاتا تھا اور اُس کے قلب میں اپنی گرفت مضبوط کرتا جاتا تھا......

جنگل کے قدیم درختوں کے سائے میں سبز سبز گھاس کے اُوپر وہ دن رات پڑا رہا۔ اُس کی نظریں صاف آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہیں۔

کہیں سے نسیم کا ایک جھونکا آیا، ابھی وہ باغ کے پتوں سے پوری طرح چھوا بھی نہ ہوگا کہ گھاس کی ننھی ننھی کونپلوں کو ہلکی ہلکی گدگدی کرکے گزر گیا۔

بڑے بڑے درخت اور موٹی موٹی ٹہنیاں بے حس وحرکت کھڑی رہیں۔ اُن کے تنفس کے ساتھ قدیم نیند باہر نکلتی تھی کیونکہ وہ گہری نیند سو رہے تھے اور اُن کے سرمدی خواب میں عظیم الشان اسرار پوشیدہ تھے۔ سبک رو نسیم چلتی تھی، تو وہ بھی اُن کے پتوں کو تھپکاتی ہوئی گزر جاتی تھی کہ کہیں اِن کے سکونِ استراحت میں خلل نہ پڑ جائے۔

مگر یہ مُردوں کی سی گہری نیند اِن پر کیوں طاری تھی؟

شاید اس لئے کہ اُن کے خوابِ مسحور میں اس نوجوان کو اپنی آرزو کا حل تلاش کرنا تھا؟

وہ پہاڑی ندّی کے سرود کو سنتا رہا۔

ندی پہاڑوں کی اُن چوٹیوں پر سے نیچے اُتر رہی تھی جہاں برف کے تودے کبھی نہیں گلتے یہ غراتی شور مچاتی، گول گول پتھروں سے دست وگریباں ہوتی، ٹیلوں ٹیکروں کو گراتی، ڈھلوان پہاڑ کے سینے کو چھیل چھیل کر گھاؤ بناتی ہوئی چلتی تھی اور اس کی کف آلود لہریں چٹانوں کے ٹکڑے اُڑا اُڑا کر دیوانہ وار ایک دوسرے سے ٹکراتی تھیں۔

ندی کہاں جاتی تھی؟

اُسے خود خبر نہ تھی ......

ابد سے وہ یوں ہی دیوانہ وار بہ رہی تھی، اپنی منزل سے ہمیشہ بےخبر وہ سمندر میں جا کر ملے گی یا کسی بڑے دریا میں یا کسی وسیع ریگستان میں جذب ہو جائیگی، ندی کو یہ معلوم نہیں ——

اور اس کا شور و غل؟ .... کیا یہ کسی نامعلوم کے لئے اُس کا غصّہ ناتواں نہیں ہے؟ ......

آرزو!

آرزو کے بارِ گراں سے نوجوان کی پشت دُہری ہوگئی۔ اب اس کا تھامے رکھنا اُس کی قوت سے باہر تھا!

اور اس لئے مسرّت کی جستجو میں اُس نے دنیا کو طے کرنا شروع کیا۔

بہت دفعہ آفتاب طلوع ہُوا اور غروب ہوگیا۔ دِن راتوں سے تبدیل ہوئے اور وقت کی ندی میں سالوں کی لہریں بہتی چلی گئیں۔

اور نوجوان پھر بھی دنیا کی خاک چھانتا پھرا!

بہت سے گاؤں اُس نے دیکھ ڈالے۔ ایک گاؤں میں ایک دفعہ اُس نے مشقت سے تھکے ہوئے کسانوں کو گہری نیند سوتے ہوئے دیکھا۔ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں پر اندھیرا گھُپ چھا رہا تھا قبرستان جیسا سکون، خاموشی خوف طاری کر رہی تھی ...... اور یہ عالم تھا کہ کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی کوئی بمشکل سنتا تھا۔

"مسرت! تُو کہاں ہے؟" نوجوان نے چِلّا کر کہا۔

کوئی جواب نہ مِلا۔

وہ ایک جھونپڑی کے دروازے پر پہنچا۔ اُس کا دِل کسی نامعلوم اندیشہ سے دھک دھک کرنے لگا کچھ دیر بعد دروازے کے اندر سے اُسے پہلے ایک دبی ہوئی ہائے کی آواز اور پھر ایک مایوس آہ سُنائی دی۔

شاید یہ مسرت تھی جو اتنی رات گئے اس سنسان جھونپڑی کی تاریکی میں پڑی کراہ رہی ہے۔

نوجوان مغموم ہو کر وہاں سے چل دیا۔

اُس نے دریاؤں، جھیلوں، وادیوں کو طے کرڈالا بلکہ ایک بلند پہاڑ پر بھی چڑھ گیا۔
وہاں اُس نے دیکھا کہ ایک چرواہا اپنے ریوڑ کو چرا رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سخت گھاس پر اوس کے قطرے چمک رہے تھے۔ ہوا بھیڑوں کی اون کے ساتھ اٹکھیلیوں میں مصروف تھی۔ اور بھیڑیں جو صبح کی سردی سے کانپ رہی تھیں چڑھتے ہوئے سورج کی کرنوں سے اپنے آپ کو گرمانے کی کوشش کر رہی تھیں۔
چرواہا جو ایک نوجوان شخص تھا اور جس کی پیٹھ پر ایک تھیلا لٹک رہا تھا، ایک چٹان پر بیٹھا ہوا بانسری بجا رہا تھا اور اپنے خیالات میں گم نیلی دوریوں کو دیکھ رہا تھا۔ سورج کی پہلی پہلی کرنوں کی سی ہلکی ہلکی میٹھی راگنیاں جن میں کسی حسینہ کی آنکھوں کا کیف ملا ہوا ہو اُس کی بنسی میں سے نکلتی تھیں اور ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر دور پہاڑوں کی سفید کہر میں مل جاتی تھیں ——— اور اسی طرح ——— گھاس پر، پہاڑیوں پر اور جنگلوں پر رینگتی پھرتی تھیں۔
چرواہے کا ریوڑ بھی اُس کے راگ کو سنتا تھا۔
"بتاؤ، مجھے بتاؤ، یہ تم کس کے لئے گا رہے ہو؟"
"کس کے لئے؟ کیا ہوا بھی کسی کے لئے گاتی ہے؟ میں تو اس لئے گاتا ہوں کہ میں موسیقی کے بغیر رہ نہیں سکتا ..... آہ افسوس! ..... میں اُس کے لئے گاتا ہوں جو نہیں ہے؟"
"کیا تم مسرّت کو جانتے ہو؟"
"مسرّت! اپنی اِن پہاڑیوں میں مجھے وہ کبھی نہیں ملی۔ یہاں میں ہوں یا میری بھیڑیں ہیں جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو اور کچھ یہ برف اور کہر ہے .... مسرّت یقیناً کوئی جنگل کی پری تو نہیں ہے ——— اُن کو میں جانتا ہوں ——— ہر ایک کو .... لوگ کہتے ہیں اس طرف دُور ——— دور، دیکھتے ہو؟ ——— ایک نہایت خوبصورت شہر ہے۔ شاید مسرّت وہاں رہتی .... مگر میں

نہیں جانتا...... میں ابھی وہاں نہیں گیا......"

نوجوان کی خواہش اور تیز ہو گئی اور وہ پہاڑ سے اُتر کر اس حیرت انگیز شہر کی طرف چل دیا۔
شہر واقعی حیرت انگیز تھا۔ اُس نے اُس کی نظیر کہیں نہ دیکھی تھی۔ عظیم الشان عمارتیں، کھلے بازار، تجارت کے مرکز، تماشا گاہیں، باغات، محلات..... اور یہ سب آنکھوں میں چکا چوند کر دینے والی روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔ دولت، شوکت اور حشمت ہر جگہ جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔
ایک بازار سے نکل کر وہ دوسرے بازار میں داخل ہوا۔ ایک پُرفضا باغیچے کے جنگلے کے پاس ایک ننھا سا فقیر لڑکا کھڑا سردی سے کانپ رہا تھا اور اندوہ گین آواز کے ساتھ خیرات مانگ رہا تھا۔
نوجوان وہاں سے بڑھ گیا......

ایک تماشا گاہ کے باہر کھڑے ہو کر کھڑکی سے اُس نے اندر کی طرف جھانکا۔ حاضرین نے ایک نوجوان حسن کار کے اختتام پر ایک نا مختتم جوش کے ساتھ تحسین و آفرین کا ایسا شور برپا کر رکھا تھا جیسے یہ اُن کی کوئی دیوی تھی۔ اور وہ بھی کچھ عجیب کریمانہ انداز سے جھکی اور ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کی مسکراہٹ میں سے مسرت کی کرنیں نکل رہی ہیں۔
لیکن چند لمحوں کے بعد ہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک کسل مند انداز سے اُس نے اپنے آپ کو ایک کرسی میں گرا دیا، مایوسانہ طریق سے اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے بجایا، اور ملول ہو کر رونا شروع کر دیا۔
نوجوان نے اس شاندار شہر کو خیرباد کہی اور اُس کی طرف مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔
ننھے فقیر کی غم انگیز سسکیاں اور تماشائیوں کی ممدوح دیوی کا مایوسانہ گریہ اُسے آگے ہی آگے لئے جاتا تھا۔

مدتوں وہ آوارہ و سرگرداں رہا۔ آخر وہ ایک تنگ سے پہاڑی درّے میں آ کر کھڑا ہو گیا

جہاں کچھ دشوار گزار ٹیلوں کے درمیان ایک گہرے غار کے اندر ایک قدیم جوگی رہتا تھا ۔ لوگوں سے دُور اور خدا کے قریب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اُس نے غار کے اندر جا کر نہایت نرمی کے ساتھ بوڑھے حکیم سے پوچھا "بابا کیا تمہیں معلوم ہے مسرّت کہاں رہتی ہے ؟"

بوڑھا اپنے آس پاس قدیم تاریخی تحریروں کے ڈھیر لگائے ہوئے قرنوں اور صدیوں کی دانش و حکمت کے موتی رول رہا تھا ۔ مدتیں ہو گئیں ، وہ زمین پر بسنے والے اِس نوجوان کے بے حاصل اور عبث سوال کا جواب دے چکا تھا اُس نے اپنا سفید سر اوپر اُٹھا کر اپنی بے نور سی آنکھیں نوجوان کی آنکھوں میں ڈال دیں اور ایک تلخ تبسم اُس کے اُترے ہوئے چہرے پر نمودار ہوا ۔

کیا اُسے اپنی گزری ہوئی جوانی کا خیال آ رہا تھا ؟

"مسرّت ؟ تمہارے لئے ؟" پیرِ دانا نے پوچھا اور رشک اُس لہجے میں لرز رہا تھا ۔

پھر وہ بحرِ خیال میں غرق ہو گیا ۔۔۔۔۔

جب اُس نے اپنا سر اُٹھایا اُس کے لہجے میں درشتی پیدا ہو چکی تھی ۔

"دھوکا ، آہ دھوکا ! ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مسرّت کہیں بھی نہیں ہے ! سب ایک خواب ہے !"

نوجوان رونے لگا ۔

"پھر مجھے زندگی کی کیا ضرورت ہے ؟ یہ مصائب و آلام میں کس لئے برداشت کر رہا ہوں ؟ میرے اس اتنے طویل سفر کا حاصل کیا ہے ؟"

بوڑھے حکیم کا دِل نرم ہو گیا ۔ اُسے نوجوان خیال پرست پر رحم آ گیا ۔

"مت رو ! جس راہ کی تجھے تلاش ہے وہ یہ ہے ! جا ! تُو ابھی جوان ہے ! اس راہ سے اب تک کوئی واپس نہیں آیا ، اگر تُو واپس آ گیا تو دنیا میں تُو مسرّت لے کر آئے گا !"

اور نوجوان چلا گیا۔ اور اس کے طویل سفر کی سب کلفت دور ہوگئی۔ کیونکہ اُس کے دل میں امید پیدا ہوگئی اور ہر روز آرزو کے ساتھ ساتھ بڑھنے اور پرورش پانے لگی۔

وہ دشوار گزار راستوں سے بلندیوں پر چڑھتا گیا .... اُس کے آس پاس کی بھوری چٹانیں ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری شعاعوں میں عجب منحوس انداز سے چمک رہی تھیں بلندیوں پر موت منڈلا رہی تھی۔ اور اپنے سانس سے ہوا میں تلاطم پیدا کر رہی تھی، زندگی یا جوانی کا یہاں ذکر تک نہ تھا۔ ہر چیز پر ایک بھیانک خاموشی طاری تھی جیسے لعنتِ ابدی کا بادل مسلط ہو رہا ہو۔

نوجوان کی راہ میں جلد ہی ایک قعرِ عمیق آ گیا۔ وہ اس سے چند قدم کے فاصلہ پر رک گیا اور اُس کے دل پر تحیّر اور خوف کی ایک پُر احترام کیفیت طاری ہوگئی۔

قعر پہاڑ کے اندر ایک بہت بڑی درز کی وجہ سے بنا تھا۔ جس کی گہرائی پہاڑ کی چوٹی سے لے کر اُس کی جڑ تک پہنچتی تھی۔ یہ کچھ زیادہ چوڑا نہ تھا۔ ایک کنارے سے دوسرے تک پھاندنے کے لئے صرف ذرا سی کوشش درکار تھی۔

اس کے عمق میں ایک دھند سی اُٹھتی تھی، اور تحت الارض نہروں اور ندیوں کا شور و غل اپنی گونج کے ساتھ اُلجھ کر اُس کی تہ سے اوپر آتا تھا، جس سے ہوا پُر ہیبت اور خوف انگیز ہو جاتی تھی۔

اور غار کے مُنہ پر کھڑا ہونے والا سنتا تھا کہ کس طرح یہ وہ ظلمت کے نیچے عناصر اپنی وحشت انگیز دیوانگی میں اُبلتے اور جوش کھاتے ہیں۔

مگر ان میں سے کوئی بات بھی نوجوان کو ڈرا نہ سکی۔

دوسرے کنارے ایک گائے سے ڈھکی ہوئی بھوری چٹان پر اپنے بازو کے سہارے

ایک جنگلی پری لیٹی ہوئی تھی۔

ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں میں اُس کے سنہری بال چوکھے سونے کی طرح چمک رہے تھے۔ نوجوان نے دیکھا کہ اُس کے بلورین جسم میں سے خون کی روانی صاف نظر آرہی ہے اُس کی چھاتیوں میں ایک نہایت متوازن و متناسب تموّج برپا ہے۔ اور اُس کی نیم وا آنکھوں میں سے پُراسرار اور مسحور کن نگاہوں کے تیر چھوٹ رہے ہیں۔

نوجوان کے پاؤں اسی جگہ گڑ گئے۔ اُس نے بیقراری سے اپنے ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیئے۔ دفعتہً اس پر منکشف ہوا کہ بلبل کیوں گاتی ہے، پہاڑی ندیاں اس تیزی سے کدھر جاتی ہیں، قدیم اشجار پر پُراسرار خاموشی کیوں چھائی رہتی ہے۔ اور چرواہے کی بانسری کی اگنیاں کہاں کی دعوت دیتی ہیں۔

وہ ملتجیانہ انداز میں اس کے سامنے جھکا ہوا تھا اور اُس کی مسحور آنکھیں اُس کے رُخ سے نہ ہٹتی تھیں ——— اس مسرت ارضی کے رخ سے!

جنگل کی اس دیوی کی اوٹ میں موت بیٹھی ہوئی تھی۔ بداندیشانہ وہ اپنے لوٹے پھوٹے ہولناک دانت نکال نکال کر منہ چڑاتی تھی اور اپنے تیز خنجر کو قعر کے اوپر گھماتی تھی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں اس کی چمکتی ہوئی دھار پر پڑتی تھیں اور اُن کا ہلکا سایہ تو اُس گہرے بادل پر باقی رہ جاتا تھا جو قعر میں سے اُٹھ رہا تھا۔

بن دیوی وہیں لیٹی ہوئی ہاتھ کے اشارے سے اُسے بلاتی تھی، آنکھوں سے اُسے مسحور کرتی تھی اور اپنے اچھوتے حسن سے اسے مسرور و مدہوش بناتی تھی۔

خنجر ہاتھ میں لئے ہوئے موت ہنستی تھی۔ . . . . اور خنجر کی آب ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی۔

...... احمق! ...... کدھر جاتا ہے؟

نوجوان نے جو اتنی مدت تک مسرت کی جستجو میں مصائب برداشت کرتا رہا تھا، اُس کے حسن سے مسحور ہوکر، ایک نظر میں قعر کی پہنائی کا اندازہ کیا اور کود پڑا........ مسرّت کی آغوش میں نہیں بلکہ موت کے خنجر کی دھار پر۔

اُس دن سے لوگ اس قعر کو قعرِ مسرّت کہنے لگے۔

"ٹڈو پاناف"

رومانیہ

ایجادِ عظیم

ایک اتوار کی صبح کا ذکر ہے ۔ شیطان خدا کی تلاش میں نکلا اور اُس نے اُسے پالیا ۔ شیطان نے کہا ،" اے خدائے بزرگ و برتر ! تو انسانوں کی وجہ سے کیوں پریشانیوں میں مبتلا ہوتا ہے ؟ ... . کیا تو نہیں جانتا کہ یہ کیسی ناکارہ جنس ہیں ؟ .... انہیں میرے حوالے کر دے اور اُن سے خود کوئی سروکار ہی نہ رکھ ! یہ تو ایک فکرِ عبث ہیں ؛ بدکردار اور احمق !"

مگر خدا نے جس کی طبیعت اُس وقت کسی ہرزہ درائی کے سننے کے لئے تیار نہ تھی ذرا درشتی سے جواب دیا :" نکل جا یہاں سے ، پاجی اور ملعون ، میں آج کے دن ایسی نابکار شکایات سُننا نہیں چاہتا ۔"

" اے قدوس و ...."

" بس بس ! وہ احمق کیسے ہو سکتے ہیں ، جب میں نے اُنہیں اپنے نمونے پر پیدا کیا ؟ وہ کیوں کر احمق ہو سکتے ہیں ؟"

" سچ ہے ، تو نے اُنہیں اپنے نمونے پر پیدا کیا ، لیکن تو نے ہی اُن کے دماغوں میں ایک کجی بھی رکھ دی ۔ اگر تیری عظمت و جبروت مجھے اجازت دے تو میں کہوں کہ ...."

خدا نے سختی سے کہا ،" خاموش ! دُور ہو جا یہاں سے .... قنوطی ! مجھے غصّہ میں نہ لا ! .... کیوں تُو یہاں ایسی جھوٹی کہانیاں سُنانے آتا ہے ؟ میری مخلوق

احمق کیوں ہو؟ .... میں تو اُن کو احمق نہیں دیکھتا!

ابلیس نے کہا: "اے ذاتِ پاک تجھے اس لئے معلوم نہیں کہ اُس دن سے —— لیکن پہلے اس واقعہ کے اظہار کی جرأت کے لئے تجھ سے ہزار بار معافی مانگتا ہوں —— تجھے یاد ہے؟ ...... جب انھوں نے تیرے رُخِ انور کی توہین کی تھی تو نے اُن کے اُل نزول نہیں فرمایا؟"

"کیا؟ .... میری توہین؟ .... کب؟ خدا نے چیں بہ جبیں ہو کر پوچھا، اور ایک بناوٹی فراموشی کے آثار اُس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگے —— یا، کون جانتا ہے کہ حقیقت کیا تھی؟ شاید وہ سچ مچ بھول گیا ہو، کیوں کہ خدا سے ہر بات ممکن ہے اور وہ جامع صفات ہے۔

"کیا تجھے یاد نہیں؟ اُن دو چوروں کے ساتھ .... ایک پہاڑی پر جب ......"

خدا نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "ٹھیک! ٹھیک! تھوڑا ہی عرصہ گذرا۔ کیا اُن لوگوں میں تو بھی تھا؟"

"ہاں، اے قادرِ مطلق! میرا گزارا ہی اور کس بات پر ہے؟ میں دن رات اُن کے ساتھ ہوتا ہوں، حتیٰ کہ نیند میں بھی .... میری ہی آغوش میں تو وہ پرورش پاتے ہیں اور میری ہی حفاظت میں وہ جیتے ہیں! میرے سوا اور کون ان کو سیدھا راستہ دکھانے والا ہے؟ مگر وہ احمق ہیں! اُن کو پڑھاتے ہوئے مجھے صدیاں گزر گئیں مگر سب اکارت گیا، وہ بڑے ہی غبی ہیں!"

پطرس نے دیکھا کہ خدا کو اَب غصہ آ رہا ہے اس لئے انھوں نے مداخلت کر کے کہا: "ہاں ہاں! ہم تجھے اچھی طرح جانتے ہیں! خدا ثبوت چاہتا ہے، صرف الفاظ یہاں کام نہیں آتے ... . ہٹ اپنی مزخرفات سے ہمارے کانوں کو نہ بھر .... اپنا راستہ لے ورنہ تیرے کانوں کو کھینچ گز گز بھر کا کر دوں گا!"

غریب شیطان کیا کرتا ، وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا ، کیوں کہ وہ سمجھ گیا تھا کہ پطرس نے مذاق نہیں کیا ، لیکن اُس نے دِل ہی دِل میں کہا :" تم ثبوت مانگتے ہو ؟ اب تمہیں ثبوت ہی لاکر دونگا .... اور بہت سے !"

سو وہ چلتا رہا ۔ چلتا رہا یہاں تک کہ غروبِ آفتاب کے وقت وہ ایک جرمن شہر میں پہنچ گیا جو دو دریاؤں کے درمیان اَمن سے بستا تھا ، جونہی وہ شہر کے دروازے میں سے گزرا اُس نے اینجیلوس کی آواز سنی ۔ شیطان کا رُواں رُواں کانپ اُٹھا اور وہ ٹھہر گیا .... اپنی حلقہ دار دم کو لپیٹے ہوئے اور اپنے تیز تیز ناخنوں کو ہتھیلیوں میں چبھوئے ہوئے وہ اُس وقت تک وہاں کھڑا رہا ۔ جب تک اُس آواز کی گونج فضائے شام میں جذب نہ ہوگئی ۔ پھر وہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا شہر میں داخل ہوگیا ، اور فی الفور ایک ایسے شخص سے مخاطب ہوا جس کی ڈاڑھی ناف تک پہنچی ہوئی تھی +

" گٹن برگ صاحب تسلیم ! مزاج تو اچھے ہیں آپ کے ؟"

اور .... وہ دوست بن گئے ۔ ایک چیز سے دوسری اور دوسری سے تیسری میں ہوتے ہوئے آخر وہ ایک لکڑی کے تابوت میں سما گئے ۔ یہاں وہ بڑی دیر تک آپس میں گفتگو کرتے رہے لیکن جو کچھ شیطان نے اُس نیک آدمی سے کہا اُسے صرف شیطان جانتا ہے اُسی سے اندازہ کرلو کہ گٹن برگ کو اُس رات نیند نہ آئی اور خیالات نے اُس کے دماغ میں ایک تلاطم برپا کئے رکھا ۔ اس کے بعد راتیں اسی طرح گزر گئیں اور اُس کی پلک سے پلک نہ لگی ، وہ ہزاروں منصوبوں اور ارادوں ، تدبیروں اور تجویزوں کے ساتھ مصروفِ جنگ رہا ۔ اچھے اچھے منصوبوں کو اُس نے توڑ مروڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور بُرے بُروں کو انتخاب کرلیا ۔ اسی طرح بہت سے دن اور بہت سی راتیں گزر گئیں ، یہاں تک آخر بڑی کاوش کے بعد اُس نے چھاپے کا پریس ایجاد کیا !

تو اب ...... کاغذ کو مضبوطی سے تھامے رہو! چھاپو .... اور چھاپو .... اور چھاپتے ہی چلے جاؤ!

پہلے پہل یہ کارخانہ کسی حد تک آہستہ آہستہ چلتا رہا مگر شیطان کا فکر بلند ہے اُس نے دیکھا۔ کہ پہیے اُس کی منشا کے مطابق تیز نہیں چلتے ۔ سو اُس نے پہیے کو اپنی دم کے بیچ میں لپیٹ لیا اور لو! سرعتِ رفتار پیدا ہو گئی .... اب وہ اُس وقت تک دم نہیں لیتا جب تک فی گھنٹہ دس لاکھ صفحے چھاپ کر ، گنے جا کر ، بند ہو کر مہریں لگ کرا دہ ڈاک کے ساتھ شامل ہو کر ریل کی سڑک پر نہیں پہنچ جاتے ہیں ، یہاں پھر وہ اپنی دُم کو گاڑی کے پہیوں میں پھنسا دیتا ہے ، اور اُسے سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلاتا ہے ۔ ذرا اپنے مطالب کی اشاعت کے لئے اُس کی عجلت پسندی ملاحظہ کیجے ۔

بہت عرصہ نہیں گزرتا کہ پطرس جنت کے دروازے پر ایک خطرناک شور سُنتے ہیں ، جیسے فتنۂ تاتار بیدار ہو کر آگیا ہو ۔ سیٹیوں ، نعروں اور گانوں سے آسمان گونج اُٹھتا ہے اور فضا غبار آلود ہو جاتی ہے!

"یہ کیا ہے؟ .... یہ کیا ہے؟"

یہ شیطان ہے ، جو ایک دو دہ گاڑی کو الہام ، فلسفہ اور قانون کی کتابوں اور نئے پُرانے اخباروں اور رسالوں سے لاد کر لایا ہے ۔ ملعون ان تمام کو پہلے نیچے اتارتا ہے اور پھر اس انبار کو اُٹھا کر بے تحاشا خدا کی طرف بھاگتا ہے ۔

خدا کہتا ہے "ناکارہ ، بدمعاش! تو پھر یہاں آگیا؟

"ہاں اے قادر مطلق!"

"تو کیا خبر لایا ہے؟"

"ایک معمولی سی اے علم و فضل کے مالک - یہ گڑگڑاتے ہوئے حاضر ہوا ہوں - ثبوت تو نے مانگا تھا ثبوت ہی لایا ہوں۔ .... محترم پطرس! مجھے ممنون فرمایئے - اپنی عینک لگا لیجئے اور ذرا آپ بھی دیکھئے۔ .... شیطان نے تمام چیزیں خدا کو اور پطرس کو دکھادیں۔

خدا اور پطرس حیران رہ گئے - دونوں ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔

"اے حی و قیوم، کیا میں سچا نہیں ہوں؟"

خدا کچھ جواب نہیں دیتا۔

"جناب پطرس، کیا میں سچا نہیں ہوں؟"

پطرس بھی کچھ جواب نہیں دیتے۔

کچھ دیر کے بعد خدا پوچھتا ہے "اچھا، تو تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"یہی کہ انسانوں کو میرے حوالے کر دے جیسا کہ معاہدہ ہوا تھا۔"

خدا تنگ آکر جواب دیتا ہے: "ہاں! لے جاؤ ان کو اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

شیطان خوشی سے اچھلتا کودتا چل پڑتا ہے۔

"ٹھہر! .... بے ہودہ کار .... کہاں جاتا ہے؟"

"ان پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے۔"

"کیا؟ ...... اور یہ خیانت تو مہیں کیا جائے گا؟ .... اٹھا اس سب کو! ..... اور اگر مجھے پھر کبھی معلوم ہوا کہ تو ایسی بے ہودگی لے کر یہاں آیا ہے تو میں پطرس سے کہہ کر تیری دم کٹوا دوں گا - سنا؟"

چنانچہ شیطان نے تمام انبار سمیٹ کر اپنے سر پر رکھ لیا اور دم دبا کر وہاں سے بھاگا۔

اس طرح نوع انسان نے کتاب خانے اور دار العلوم بنانے سیکھے تاکہ زمانہ ان کی عقل و دانش کو تباہ نہ کر سکے۔

(آئی - ایل - کیراگی ایل)

سپین

چھلاوہ

پیمیریز نے اخبار ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا "آج اس میں میرے ایک دوست کے انتقال کی خبر ہے۔ میں نے صرف ایک دفعہ اُسے دیکھا ہے۔ مگر وہ اکثر میرے خیال کی آنکھوں کے سامنے رہا ہے، کیا خوب آدمی تھا!

"رات کا وقت تھا اور گاڑی بلنسیہ سے میڈرڈ کی طرف جا رہی تھی۔ میں ایک اول درجہ کے کمرے میں تھا اور میرا ایک ہی ہم سفر کہیں راستے میں اتر چکا تھا۔ تنہائی مجھے ناگوار نہ تھی، کیوں کہ اب میں جس قدر چاہتا پھیل سکتا تھا، اور نرم نرم گدیلے مجھے دعوت استراحت دیتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ میں نے لمپ بجھا دیا، اپنا اوورکوٹ اوڑھا اور اطمینان کا ایک لمبا سانس لیتے ہوئے دراز ہوگیا، کہ اب وہاں کوئی نہ تھا جسے میرے پاؤں پھیلانے سے تکلیف ہوتی۔

"گاڑی اب ایک وسیع میدان میں سے گزر رہی تھی۔ انجن پوری رفتار پر جا رہا تھا اور میرا کمرہ کسی پرانے "یکے" کی طرح ہچکولے کھاتا رواں تھا۔ یہ ہچکولے مجھے اپنے کندھوں کے بل پر آگے اور پیچھے مسلسل جنبش دے رہے تھے، سر کے اوپر میرے سوٹ کیس میں سے ایک باریک آواز نکل رہی تھی۔ کھڑکیاں کھٹ کھٹ بج رہی تھیں اور پہیوں اور بریکوں سے ہولناک چیخوں کی سی آواز آ رہی تھی۔ لیکن جونہی کہ میں نے آنکھیں بند کیں اس شور کی لے مجھ پر چھانے لگی، میں اپنے آپ کو پھر بچپن کے زمانے میں پانے لگا اور مجھے اپنی کھلائی کی لوری کی شیریں آواز

آنے لگی ٭

" اِنہیں مہمل خیالات میں مجھے نیند آگئی ۔ گاڑی چلتی رہی اور اُس کا شور میرے کانوں میں گونجتا رہا ٭

یکایک کمرے کی فضا متغیر ہوگئی، اور میں جاگ اُٹھا۔ میرے مُنہ کے قریب تیز سرد ہوا چل رہی تھی ۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو کمرہ بدستور خالی تھا اور میرے سامنے والا دروازہ بھی بند تھا مجھے پھر نیند آرہی تھی کہ رات کی سرد ہوا کا ایک اور تھپیڑا آکر مجھے لگا ۔ میں نے اُٹھ کر دیکھا تو میرے سر کی طرف کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور فرش پر ایک شخص بیٹھا تھا جس کے پاؤں پائیدان پر تھے ٭

" میرے حواس باختہ ہو گئے ۔ کیوں کہ میرا دماغ ابھی نیم بیداری کی حالت میں تھا ۔ سب سے پہلے مجھ پر متوہمانہ خوف سا چھا گیا ۔ کیوں کہ پوری رفتار سے جاتی ہوئی گاڑی میں یکایک کسی انسان کے ظاہر ہونے پر یہی خیال ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی بھوت ہے ۔ پھر مجھے گاڑیوں میں آگھسنے والے لٹیروں، اچکوں اور خونیوں کا خیال آیا اور میں نے محسوس کیا کہ میں اکیلا ہوں اور گو میرے اور دوسرے مسافروں کے درمیان صرف ایک لکڑی کا تختہ حائل ہے، لیکن میں کسی ذریعہ سے بھی اُن کو اپنے خطرے سے آگاہ نہیں کر سکتا ۔ یہ شخص ضرور کوئی ڈاکو ہے ٭

حفاظت نفس کے جذبے سے مجبور ہو کر میں اُس پر ٹوٹ پڑا اور اپنی کہنیوں اور گھٹنوں سے اُسے باہر کی طرف دھکیلنے لگا ۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا ۔ لیکن دروازے کو بے تحاشا پکڑے رہا ۔ اور میں اُس کی گرفت ڈھیلی کرکے اُسے باہر پھینکنے کی سعی میں مصروف رہا ۔ اِس میں شک نہیں کہ میں ایک محفوظ جگہ پر کھڑا تھا اور مجھے یہ فوقیت حاصل تھی ٭

" خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو، میں تمہیں کوئی مضرت نہ پہنچاؤں گا!" یہ الفاظ اُس نے ایسی

لجاجت سے کہے کہ مجھے اپنے سلوک پر شرم آ گئی اور میں نے اُسے چھوڑ دیا - ہانپتا کانپتا وہ پھر بیٹھ گیا، میں نے وہاں سے ہٹ کر لمپ روشن کر دیا۔

اِس کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کون ہے، وہ ایک غریب کسان تھا اور اُس نے موٹے سُوتی کپڑے پہن رکھے تھے - اس کی سیاہ ٹوپی اُس کے چہرے سے کچھ زیادہ تاریک نہ تھی جس میں اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور پیلے پیلے دانت نمایاں تھے - وہ احمقانہ ممنونیت میں کھلکھلا رہا تھا - لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے تھیلے میں سے کچھ تلاش بھی کر رہا تھا - یہ دیکھ کر میں اپنی نیکی پر افسوس کرنے لگا - ابھی وہ تلاش میں مصروف تھا کہ میں نے اپنے ریوالور پر ہاتھ ڈالا - اَب وہ بے خبری میں مجھ پر حملہ نہ کر سکتا تھا۔

آہستہ سے اُس نے کوئی چیز اپنے تھیلے میں سے نکالی، اور میں نے بھی اُس کی تقلید میں اپنا ریوالور آدھا باہر نکال لیا - لیکن میں نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ میں محض ایک فرسودہ کاغذ کی چھوٹی سی کتر تھی، جسے وہ خوشی سے میری طرف بڑھا رہا تھا۔

"دیکھ لو، میرے پاس ٹکٹ موجود ہے"

"میں نے اُس کی طرف دیکھا اور ہنس پڑا -

"میں نے کہا، لیکن یہ تو پرانا ہے! یہ تو سالہا سال سے بیکار ہو چکا ہے - اور اِس کے علاوہ کیا یہ تمہیں چلتی گاڑی میں چھلانگیں لگانے اور یوں لوگوں کو ڈرانے کی معافی دے سکتا ہے"

"اِس پر اُس کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا، اُسے پھر خوف ہو گیا ہے کہ میں اسے باہر پھینک دوں گا - لیکن اپنی حساسیت کے باعث مجھے اُس پر رحم آنے لگا۔

"میں نے کہا تم اندر آجاؤ اور دروازہ بند کر دو"

"نہیں صاحب، شکریہ!، اُس نے کڑی آواز سے کہا مجھے اندر آنے کا حق نہیں ہے"

میں نہیں باہر بیٹھوں گا - میں اُس جگہ کے قابل نہیں ؛

" اور وہ دروازے ہی میں بیٹھا رہا - میں بھی اُس کے قریب ہی بیٹھا تھا اور میرے گھٹنے اُس کے کندھوں کو چھو رہے تھے - گاڑی کی رفتار کے ساتھ ہوا طوفان کی طرح اندر آ رہی تھی - اور روشنی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دروازے میں سے چھن کر اور ہمارے بے ڈول سایوں کو ساتھ لے کر بنجر میدان کو چھوتا ہوا ہمارے ساتھ سفر کر رہا تھا - تار کے کھمبے رات کے سیاہ پردے پر زرد رنگ کے عمودی نقوش کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتے چلے جاتے تھے، اور چنگاریوں کے جگنو انجن سے نکل نکل کر پیچھے کی طرف بھاگتے تھے *

" وہ مضطرب سا نظر آتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے اطمینان سے بیٹھنے کی عادت ہی نہیں - میں نے اُسے ایک سگار پیش کیا ذرا سی دیر کے بعد اُس نے باتیں شروع کر دیں *

اُس نے مجھے بتایا کہ وہ ایسا سفر ہر ہفتے کیا کرتا ہے - وہ سٹیشن سے دُور کھڑا گاڑی کا انتظار کرتا رہتا ہے، اور جب وہ قریب پہنچتی ہے تو دوڑ کر ایک ہی چھلانگ میں اُسے پکڑ لیتا ہے، اور پائیدان پر کھسکتا ہوا کسی خالی کمرے تک پہنچ جاتا ہے - پھر گاڑی کے کسی سٹیشن پر داخل ہونے سے پہلے ہی کود جاتا ہے اور جب وہ چل پڑتی ہے تو پھر اُس پر چڑھ آتا ہے - اور وہ ہمیشہ اپنی گاڑی بدل لیتا ہے - تاکہ سنگ دِل گاڑی والوں کی نظر سے بچا رہے *

" میں نے پوچھا 'لیکن تم کہاں جا رہے ہو؟ اور ہر ہفتے تم اِتنے بڑے خطرے میں کیوں پڑتے ہو؟'

" معلوم ہوا کہ وہ اتوار کی چھٹی اپنے بال بچوں میں گزارنا چاہتا تھا - مگر وہ اور اُس کی بیوی انتہائے غربت کے باعث اِکٹھے نہ رہ سکتے تھے - وہ ایک شہر میں کام کرتا تھا اور اُس کی بیوی کسی دوسرے شہر میں - پہلے پہل وہ یہ سفر پیدل طے کیا کرتا تھا اور ساری رات چلتا رہتا تھا، مگر

جب وہ وہاں پہنچتا تو بے حال ہو کر گر جاتا تھا اور تکان کے باعث نہ اپنی بیوی سے بات کر سکتا نہ بچوں سے کھیل سکتا تھا، رفتہ رفتہ وہ بے باک ہو گیا اور اب اُس نے گھر پہنچنے کا ایک آسان رستہ نکال لیا بچوں کو دیکھ کر اُس کے اعضا میں بقیہ ہفتے کے لئے زیادہ تن دہی سے کام کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی تھی - اُس کے تین بچے تھے - سب سے چھوٹی لڑکی ابھی اچھی طرح چل بھی نہ سکتی تھی، لیکن وہ اپنے باپ کو پہچانتی تھی اور جب کبھی وہ آتا پیار لینے کے لئے اُس کی طرف اپنی باہیں پھیلا دیتی تھی *

"میں نے اُس سے کہا لیکن کیا تم ڈرتے نہیں کہ کسی دن یہ سفر تمہارا آخری سفر نہ ہو جائے"

"وہ مسکرایا اور اُس کے مسکرانے سے معلوم ہوتا تھا کہ اُسے اپنے پر اعتماد ہے - نہیں"

جب گاڑی کسی گسستہ عنان گھوڑے کی طرح شعلے اگلتی اُس کی طرف بڑھی چلی آتی تھی تو اُس کو ڈر نہ آتا تھا - وہ کافی دلیر تھا، ایک ہی جست میں وہ اُس کے اوپر ہوتا اور گو کبھی کبھی اُترتے وقت اُسے ایک آدھ دھکا لگ جاتا لیکن وہ پہیوں کی زد سے اپنے آپ کو صاف بچا لیا کرتا *

"اُسے صرف مسافروں کا خطرہ ہوتا تھا - اوّل درجہ کی گاڑیاں اُسے عموماً خالی ملتی تھیں لیکن آج کی طرح کے مواقع بھی اُسے پیش آ ہی جایا کرتے تھے - ایک دفعہ وہ ایسی جگہ پہنچ گیا جو عورتوں کے لئے مخصوص تھی، وہاں دو عورتیں بیٹھی تھیں اُن کی چیخوں نے اسے ایسا ڈرایا کہ اُسے گاڑی سے اُترتے ہی بنی اور باقی راستہ پیدل چل کر جانا پڑا *

ایک رات جب وہ چوری چوری ایک دروازہ کھول رہا تھا کسی نے اُس کے سر پر اس زور کی ضرب رسید کی کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا - بس اُس دن اُسے یقین تھا کہ یہ اُس کا آخری سفر ہے! یہ بات سناتے سناتے اُس نے اپنی پیشانی پر مجھے ایک بہت بڑا داغ دکھایا *

"آہ، اُس کے ساتھ بڑی بدسلوکی ہوئی تھی لیکن اس کو اُس کی شکایت نہ تھی، اُسے لوگوں

سے گلہ نہ تھا۔ کہ کیوں وہ اس سے ڈرتے اور اپنی حفاظت کی کوشش کرتے ہیں۔ جو سلوک اُس سے ہوتا تھا وہ اپنے آپ کو اُس کا مستحق سمجھتا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ کا۔ مگر جرم کے سوا اُس کے پاس چارۂ کار ہی کیا تھا جب کہ وہ مفلس و قلاش تھا اور اُسے اپنے بچوں کو دیکھنے کی آرزو بھی تھی +

" اتنے میں گاڑی کی رفتار کم ہونی شروع ہوئی جیسے کوئی سٹیشن آ رہا ہو وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا +

" میں نے کہا 'دیکھو، تمہارے سٹیشن پر پہنچنے سے پہلے راستے میں ایک قیام اور ہو گا۔ تم بیٹھے رہو اور تمہارا کرایہ میں ادا کر دوں گا'۔

" اُس نے بلا تامل جواب دیا 'نہیں صاحب، گارڈ پھر بھی مجھے دروازے سے گزرنے نہ دے گا اُس نے کبھی مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور نہ میں چاہتا ہوں کہ وہ دیکھے۔ مگر میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کو یہ سفر مبارک ہو۔ میں نے آپ جیسا رحم دِل اور نیک کوئی آدمی نہیں دیکھا +

" یہ کہہ کر اُس نے پائیدان پر پیر رکھا اور غائب ہو گیا۔

" جلد ہی گاڑی ایک چھوٹے سے سٹیشن پر ٹھہر گئی۔ مجھ پر پھر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی کہ یکایک مجھے پلیٹ فارم پر اشتعال آمیز آوازیں سنائی دیں۔ یہ قلی وغیرہ تھے جو گاڑی کے محافظوں کو کسی کے تعاقب کا رستہ دکھا رہے تھے +

" وہ جا رہا ہے! تم میں سے ایک دوسری طرف ہو جاؤ تاکہ وہ بچ کر نکل نہ جائے! .....

..... لو وہ گاڑی کے اوپر چڑھ گیا! .... جلدی کرو!،

" اور چند ہی لمحوں میں میرے کمرے کی چھت غضبناک پولیس کے بھاری بھاری قدموں سے ہلنے لگی +

"میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا تو اگلی گاڑی کے چھت سے ایک آدمی نیچے گر رہا تھا۔ ایک تودے کی طرح وہ زمین پر آ پڑا، پھر بے تحاشا بھاگ اٹھا اور جلد ہی رات کے سیاہ پردے میں چھپ گیا۔

"گارڈ اور اُس کے دوسرے ساتھی زور زور سے بول رہے تھے اور طیش سے ہاتھ ہلا رہے تھے۔

"میں نے اُن میں سے ایک سے پوچھا 'یہ کیا بات ہے؟'

"اُس نے کہا 'یہ وہی ہے وہی سواری کا چور! یہ چھلاوہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا، ہم ضرور اسے پکڑ کر رہیں گے!'

"چھلاوے، کو میں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اکثر سردی کی راتوں میں مَیں یہ سوچ سوچ کر حیران ہوا ہوں کہ آیا وہ اس وقت بھی کہیں برف و باران کے طوفان میں کھڑا ناساز گار گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہا ہوگا، اور پھر دشمن کے مورچے کو مسخر کر لینے والے کسی بے باک سپاہی کی طرح وہ اُس پر چڑھ رہا ہوگا"۔

پھر پیریز نے اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" اور آج اس میں لکھا ہے کہ البا سط کے قریب کسی کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑے ہوئے پائے گئے یہ وہی ہے ——— مجھے یقین ہے کہ یہ وہی ہے۔ آہ، وہ جو خطرے کو ڈھونڈتا ہے، اُس میں پڑتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے، چاہے طویل سالوں تک اُس نے اپنا یہ وظیفہ جاری رکھا، جب اُس کا دل اپنے بچوں کو چومنے کے لئے چاہا وہ کسی وحشی درندے کی طرح اپنے شکار پر جھپٹا کیا، یہاں تک کہ آج صبح کی روشنی نے اُسے اُس رستے پر پڑا پایا جس پر تاریک رات نے اُسے اکثر ایک بہادر انسان کی طرح موت کو دعوت مقابلہ دیتے ہوئے دیکھا تھا۔

(وی۔ بلاسکو ابانیز)

پولینڈ

غروب

سوکول مر رہا تھا۔ دیر سے وہ اسی حالت میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ وہ بیمار ہو گیا تھا اور لوگوں نے اسے لوتھ پوتھ جان کر ایک طرف پھینک دیا تھا۔ اچھے لوگ کہتے تھے اُسے مار دینا غلطی ہوگی خواہ اُس کی کھال سے کیسا ہی اچھا چمڑہ تیار کیوں نہ ہو، ہاں! اچھے لوگ کہتے تھے کہ اُسے آہستہ اکیلے اور فراموش شدہ حالت میں مر جانے دو۔ یہی اچھے لوگ تھے جو کبھی کبھی آ کر پاؤں کی ایک ٹھوکر سے اُسے بتا جاتے تھے کہ وہ بہت آہستہ مر رہا ہے۔ اس کے سوائے وہ اُس کی طرف اور کوئی توجہ نہ کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ تازی کتے جن کے ساتھ کبھی زمانے میں وہ شکار کے تعاقب میں بھاگا کرتا تھا، اُس کے پاس آ کر کھڑے ہوتے تھے۔ مگر کتوں کی روحیں بد روحیں ہوتی ہیں۔ اور یہ اس لئے ہے کہ وہ انسان کے ساتھ بہت گھُل مل کر رہتے ہیں۔ چنانچہ جوں ہی ان کے آقا انہیں آواز دیتے تھے وہ جھٹ سوکول کو چھوڑ کر بھاگ اُٹھتے تھے۔ صرف لیّا جو سائبیریا کا ایک تازی تھا اُس کے پاس دوسروں سے زیادہ دیر تک ٹھہرتا تھا۔ وہ اُس کی کھُرلی کے نیچے بیٹھ کر اونگھا کرتا تھا۔ سوکول کی حالت دیکھ کر اُس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا تھا۔ اُس کی آنسوؤں سے بھری ہوئی بڑی بڑی سراپا زبان آنکھیں اُس کو خوف زدہ کر دیتی تھیں۔

کچھ اس قسم کی بے کسی اور بے بسی کی حالت میں بڈھے گھوڑے کو چھوڑ دیا گیا تھا مگر دنوں نے اُس کا ساتھ نہ چھوڑا...... سنہری اور گلابی دنوں نے، اور اُن اداس اور ابر آلود دنوں نے

جو آ آ کر اُس کے تھان پر اپنے آنسوؤں کا مینھ برسا جاتے تھے، ہر روز آ کر اُس کی آنکھوں میں جھانکتے تھے - اور پھر خاموشی سے یوں روانہ ہو جاتے تھے، جیسے وہ اُس کی آنکھوں میں کچھ دیکھ کر ڈر گئے ہیں۔

لیکن سوکول صرف راتوں سے ڈرتا تھا، مختصر، خوفناک، خاموش، گلا گھونٹ دینے والی جُون کی راتوں سے اب اُسے بھی معلوم ہونے لگا تھا کہ وہ مر رہا ہے - اور موت کا خوف اُسے قریباً پاگل بنا رہا تھا - وہ اپنی رسّی کو تڑاتا تھا - وہ اپنے سموں کو زور زور سے دیوار کے ساتھ مارتا تھا ......

...... وہ بھاگ جانا چاہتا تھا......... دوڑنا......... بس دوڑنا۔

ایک دن غروبِ آفتاب کے وقت وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دیوار کی درزوں میں سے جو کرنیں اندر آ رہی تھیں انہیں گھورنے لگا - پھر ایک مغموم آواز کے ساتھ دیر دیر تک ہنہنانے لگا - ڈوبتے ہوئے دن کی بوجھل اور نہ ٹوٹنے والی خاموشی میں سے اُسے کوئی جواب نہ ملا - ابابیلیں اڑنے لگیں اور اپنے گھونسلوں میں سے شور مچانے لگیں - یا پرواز تیروں کی طرح مچھروں کی اس سنہری فوج پر جھپٹنے لگیں، جو سورج کی آخری شعاعوں میں بھنبھنا رہے تھے دُور کی چراگاہوں میں سے گھاس کاٹنے والی درانتیوں کے بجنے کی پیہم آوازیں آ رہی تھیں - اور دانے کے کھیتوں اور پھولوں کی کیاریوں میں سرسراہٹ، بھنبھناہٹ اور سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔

سوکول کے آس پاس ایسی عمیق اور خوفناک خاموشی چھا رہی تھی - جس سے وہ بار بار کانپ اُٹھتا تھا - معاً اُس پر ایک ہول سا چھا گیا - اُس نے اپنی رسی کے ساتھ دیوانہ وار کش مکش شروع کر دی - آخر رسّی ٹوٹ گئی اور وہ بھاگ کر صحن میں آ گیا۔

سورج کی روشنی نے اُس کی آنکھوں کو چندھیا دیا اور ایک وحشی درد نے اُس کی انتڑیوں کو کاٹ کھایا - اُس نے اپنا سر جھکا لیا - اور بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا جیسے کسی کو سکتہ ہو جائے

آہستہ آہستہ وہ پھر اپنے آپ میں آیا۔ کھیتوں جنگلوں سبزہ زاروں کے دھندلے دھندلے نقوش اس کے دماغ میں تیرنے لگے۔ اس کے دل میں دوڑنے کی ناقابل ضبط آرزو جاگ، نئی، وسیع فاصلوں پر غلبہ پانے کی خواہش پیدا ہوگئی۔ زندگی کا پُرکیف جام ایک مرتبہ پھر پینے کی پیاس اُسے محسوس ہوئی۔ اُس نے بہت تلاش کی کہ کہیں صحن میں سے نکلنے کا راستہ مل جائے، مگر اُس کی یہ جستجو بیکار ثابت ہوئی، اُس نے بار بار کوشش کی، حالانکہ وہ بمشکل اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو سکتا تھا، حالانکہ ہر حرکت اُسے ناقابل بیان تکالیف پہنچا رہی تھی اور اُس کے پُرانے زخموں میں سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔

آخر وہ آکر لکڑی کے ایک جنگلے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس میں سے جاگیردار کا مکان صاف نظر آرہا تھا۔ باغ کے سامنے پھولوں سے ڈھنپا ہوا گھاس کا ایک تختہ تھا، جہاں کتے دھوپ تاپ رہے تھے۔ اُس نے مکان کی طرف دیکھا جس کی کھڑکیاں سورج کی سنہری کرنوں میں چمک رہی تھیں اور پھر نہایت رحم انگیز طریقہ سے ہنہنانا شروع کیا۔

اگر اس وقت کوئی آتا اور محبت آمیز الفاظ میں کچھ کہتا یا پیار سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا تو یقیناً جوش محبت میں وہ وہیں لیٹ جاتا اور جان دے دیتا۔ مگر ہر طرف تنہائی خاموشی اور سکون برس رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی نہ آیا۔

مایوس ہو کر اُس نے کٹہرے کو کاٹنا شروع کیا اور دروازے پر اپنا سارا بوجھ ڈال کر اُسے کھولنے کی کوشش کی دروازہ کھل گیا اور وہ باغ میں جا پہنچا۔ وہ مغموم آواز سے ہنہناتا ہوا دروازے تک بھی پہنچ گیا، مگر اُس کی آواز کو کسی نے نہ سنا وہ دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ وہ ان کھڑکیوں کو دیکھتا رہا جن پر پردے پڑے ہوئے تھے بلکہ اُس نے سیڑھیوں پر چڑھنے کی کوشش بھی کی۔ پھر اُس نے سارے مکان کے اردگرد ایک چکر لگایا۔

یکایک ایسا معلوم ہُوا کہ وہ سب کچھ بھول گیا ہے اُسے اپنے تصوّرات میں صرف اناج کے وسیع کھیت نظر آنے لگے۔ اتنے وسیع جتنا کہ سمندر، جس کی وسعت اُفق کے بُعد لا متناہی کو چھو رہی ہو۔ اِن خیالات سے مسحور ہوکر اس گھٹتی ہوئی قوّت کے ساتھ اُس کے قدم آگے کو لڑکھڑانے اور ڈگمگانے شروع ہوئے جواب اس کے جسم میں باقی رہ گئی تھی۔

سوکول کانپ گیا۔ وفورِ درد سے اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اُس کی سانس بھاری چلنے لگی، اُس نے اپنے تپتے ہوئے نتھنے ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس سے لگا دیئے وہ پیاسا تھا مگر نکل بھاگنے کی ناقابل تردید خواہش سے مجبور ہوکر اپنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے ہی آگے چلا جاتا تھا۔ وہ گندم کے پٹھوں پر سے گزر رہا تھا کہ اُس کے قدم بوجھل ہونے شروع ہوئے۔ ہل کی اونچ نیچ اُس کے لئے بڑے بڑے گڑھے بن گئی۔ گھاس اُس کے پاؤں سے لپٹ لپٹ کر اُسے نیچے گرانے لگی۔ جھاڑیوں نے اُس کا راستہ روک لیا۔ تمام زمین اُسے اپنی جانب کھینچنے کے لئے تلی ہوئی معلوم ہوئی۔

اُس کی بے کس، بے زبان روح خوف و ہراس کی تاریک گہرائیوں میں نیچے ہی نیچے ڈوبتی گئی۔ کسی چیز کو نہ پہچانتے ہوئے اُس کے قدم آگے ہی آگے لڑکھڑاتے رہے...... اس طرح جیسے کوئی اندھا دھند کہر کی تاریکیوں میں چلتا چلا جائے۔ ایک تیتری جو اپنے انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھی اچانک اُس کی دونوں ٹانگوں میں سے ہوکر اُڑی، ڈر کے مارے وہ چونک اُٹھا۔ پھر بے حس و حرکت کھڑا ہوگیا۔ ہلنے جلنے کی جرأت اُس میں نہ رہی۔ کوّے جو خاموشی سے کھیتوں میں اڑ رہے تھے۔ اُس کو دیکھ کر تھم گئے۔ اور ناشپاتی کے ایک درخت پر بیٹھ کر اپنی کرخت آواز سے کائیں کائیں کرنے لگے۔

وہ میدان میں بے تاب و تواں ہوکر گر پڑا۔ اُس نے اپنی ٹانگوں کو پھیلا دیا۔ آسمان کی وسعت

پر ایک نظر ڈالی اور ایک حسرت آمیز آہ بھری - کوّے درختوں سے نیچے اُتر آئے - اور زمین پر اُس کے نزدیک اور نزدیک آتے گئے - اناج کے پٹھے اُس پر جُھک گئے، اور اپنی لالہ گوں آنکھوں سے اُس کی طرف گھورنے لگے - کوّے اپنی چونچوں کو گھاس کے سخت سخت پتّوں سے تیز کرتے ہوئے اور آگے بڑھے - کچھ اُڑاتے ہوئے اُس کے اوپر منڈلانے لگے، یہاں تک کہ اُس نے ان کی خوفناک آنکھیں اور کُھلی ہوئی چونچیں دیکھیں - مگر وہ حرکت نہ کر سکتا تھا - وہ اپنے سموں کو زور زور سے زمین پر مارنے لگا - شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ تازی کتّوں کے ساتھ کسی شکار کے پیچھے میدان میں سرپٹ دوڑ رہا ہے - اور اُس کی رفتار کی تیزی ہوا کو بھی پیچھے چھوڑ رہی ہے*

اس کا درد و کرب اتنا بڑھا کہ اُس نے ایک وحشت انگیز چیخ ماری اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا کوّے کائیں کائیں کرتے ہوئے اُڑ گئے ....

مگر اَب وہ کچھ نہ دیکھتا تھا کچھ نہ سمجھتا تھا - ہر چیز اُسے گھومتی ہوئی نظر آئی، ہر چیز اُسے ٹکراتی، گرتی اور ٹوٹتی ہوئی نظر آئی اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کسی دلدل کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے - ایک سرد لرزش اُس کے بدن پر دَوڑ گئی اور اُسے ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کرتی گئی *

سورج ڈوب گیا - شفق کی چادر نے ہر چیز کو اپنے اندر چھپا لیا - دُور سے کسی کتّے کے بھونکنے کی آواز آئی *

لپّا بھاگا ہوا اپنے دوست کے پاس آیا - مگر اب سوکل اُسے نہ پہچانتا تھا - وہ اُس کے پاؤں چاٹنے لگا - پھر اُس نے دیوانہ وار اپنے پنجوں سے زمین کو کریدنا شروع کیا - پھر کھیتوں میں اِدھر سے اُدھر بھاگ کر اور بھونک کر اُس نے کسی کو مدد کے لئے بلانا چاہا - مگر کوئی اُس کی آواز سُن کر نہ آیا *

گھاس آ آ کر تسو کول کی کھلی ہوئی آنکھوں میں جھانکنے لگی - درخت اپنی پنجہ نما ٹہنیوں کو درندوں کی طرح بڑھا بڑھا کر اُس کے قریب آنے لگے - پرندے خاموش ہو گئے - ہزاروں حشرات الارض اُس کے بدن کو کاٹنے اور پھاڑنے کے لئے جمع ہو گئے - کوّے خوف زدہ ہو کر کائیں کائیں کرنے لگے +

دہشت کے مارے لپّا کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے - اور وہ دردانگیز آواز سے چلّا رہا تھا +

ولیڈ سلار ہمینٹ

یوگوسلافیہ
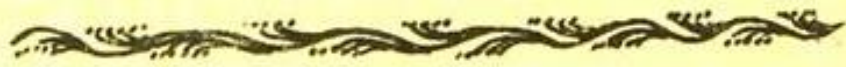
دیوِ خونخوار

سیر و تفریح کی ایک دخانی کشتی قسطنطنیہ سے ہمیں جزیرہ پرنکی پو کے ساحل پر لے آئی اور ہم وہاں اُتر پڑے۔ کشتی میں کچھ زیادہ آدمی سوار نہ تھے۔ ایک پولی خاندان کے چار افراد ماں، باپ، اُن کی بیٹی اور اُس کا شوہر اور ان کے علاوہ ہم دو، بس۔ ہاں مگر جب ہم لکڑی کے اُس پل پر سے گزر رہے تھے جو شاخِ زرّیں اور قسطنطنیہ کو عبور کرتا ہے تو ایک یونانی جسے نوجوان ہی کہنا چاہیئے ہم سے آملا۔ یہ غالباً کوئی مصوّر تھا کیوں کہ اُس نے اپنی بغل میں ایک اُس قسم کا بستہ داب رکھا تھا، جیسا مصوروں کے پاس ہوتا ہے۔ بالوں کی لمبی لمبی لٹیں اُس کے کندھوں پر پڑ رہی تھیں۔ اُس کا چہرہ زرد تھا اور اُس کی سیاہ آنکھیں گہرے حلقوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے لئے مجھے اُس سے دلچسپی پیدا ہوگئی، خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ متواضع تھا اور اُسے جزیرے کے مقامی حالات کا بھی علم تھا۔ لیکن وہ اتنا باتونی تھا کہ آخر میں تنگ آکر اُس کے پاس سے ہٹ گیا۔

یہ پولی گھرانا بھی نہایت خوش اخلاق واقع ہوا تھا۔ باپ اور ماں دونوں پُر تکلف تھے۔ اور ان کا داماد وجیہہ و شکیل ہونے کے علاوہ ایک سلجھی ہوئی اور آزاد طبیعت کا مالک تھا۔ پرنکی پو میں یہ لوگ لڑکی کی خاطر جو کچھ مریض سی معلوم ہوتی تھی گرمیوں کے چند مہینے گزارنے آئے تھے۔ لڑکی حسین تھی مگر اُس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یا تو وہ کسی

سخت بیماری سے صحت یاب ہوئی ہے یا کوئی خوفناک مرض اُس کے جسم پر اپنی گرفت مضبوط کر رہا ہے۔ وہ اکثر اپنے شوہر کے بازو کا سہارا لے کر چلتی تھی اور راہ میں عموماً دم لینے کے لئے بیٹھ جاتی تھی۔ اُس کی سرگوشیوں کو بار بار ہلکی ہلکی خشک قسم کی کھانسی منقطع کر دیتی تھی۔ راستے میں اُس کو کھانسی کا دورہ ہوتا تھا تو وہ اور اُس کا شوہر دونوں ٹھہر جاتے تھے۔ وہ اپنی ہمدردانہ تشویش کی نگاہیں اُس پر ڈالتا تھا۔ اور یہ اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتی تھی جو کہتی تھیں :۔ "کچھ نہیں، کچھ نہیں، میں اچھی ہوں!" اُن کا یقین صحت اور مسرت میں تھا۔

اُس یونانی کے کہنے پر، جو کشتی سے اترتے ہی ہم سے جدا ہو گیا۔ ہم نے پہاڑی پر کے ہوٹل میں قیام کا انتظام کر لیا ہوٹل والا کوئی فرانسیسی تھا اور اُس نے عمارت کو آرام و آسائش کے تمام سامانوں سے فرانسیسی طرز پر منظم و مزین کر رکھا تھا۔

ناشتا ہم سب نے اکٹھا ہی کیا اور جب دوپہر کی گرمی ذرا کم ہوئی تب بھی ہم تقریباً ایک ساتھ ہی پہاڑی پر چڑھے اور وہاں سائبیریا کے چیڑوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر کوہستان کے پر فضا نظارہ سے مسرّت حاصل کرنے لگے۔ ابھی ہم جگہ انتخاب کر کے بیٹھے ہی تھے کہ وہ یونانی پھر نمودار ہوا۔ اُس نے ہمیں آہستہ سے سلام کیا، اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ہم سے چند قدم کے فاصلہ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنا بستہ کھولا اور تصویر بنانے میں مشغول ہو گیا۔

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ جان بوجھ کر چٹانوں کی جانب پیٹھ کر کے بیٹھا ہے تاکہ ہم اس کی تصویر کی طرف نہ دیکھ سکیں"۔

نوجوان پول نے کہا "ہمیں اس کی ضرورت بھی کیا ہے، ہمارے سامنے دیکھنے کے لئے بہت کچھ ہے" ذرا ٹھہر کر اُس نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تصویر میں ہمیں بھی شامل کر رہا ہے، اچھا، اِسے کرنے دو!"

حقیقت میں ہمارے سامنے دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔ پرنکی پو جیسی خوب صورت اور پُر فضا جگہ ساری دنیا میں نہ ہوگی۔ مشہور شہیدِ وطن آرین نے جو چارلس اعظم کا ہمعصر تھا اپنی جلاوطنی کا ایک مہینہ یہیں گذارا تھا۔ اگر میں ایک مہینے تک یہاں رہ سکتا تو اپنی تمام بقیہ عمر اس مقام کے تصوّر کی مسرت میں گذار دیتا۔ بلکہ میں اس ایک دن کو کبھی نہیں بھولوں گا جو میں نے وہاں بسر کیا۔

ہوا ایسی صاف تھی جیسے چمکتا ہُوا ہیرا، اور ایسی نرم و خوشگوار کہ انسان کی ساری روح اُس کے ساتھ مِل کر مصروفِ پرواز ہو جاتی تھی۔ دائیں طرف سمندر سے پرے ایشیائی پہاڑوں کی چوٹیاں اپنے بھورے بھورے سر اُٹھائے کھڑی تھیں۔ اور بائیں جانب دُور یورپ کے ڈھلوان ساحلوں پر شفق کے بادۂ ارغواں کا انعکاس ہو رہا تھا۔ چاکی، "مجمع الجزائر سلطانیہ" کے نو جزیروں میں سے وہ جزیرہ جو ہماری ہمسائیگی میں واقع تھا ایک مغموم خواب کی طرح اپنے سرو و صنوبر کے جنگلوں سمیت آسمان کی پُر امن بلندیوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اور اُس کے سر پر تاج کی طرح ایک عالی شان عمارت تھی جو اُن لوگوں کا مسکن تھی جن کے دِل بیمار ہوں +

بحیرہ مارمورا کے پانیوں میں بلور کے ایک چمکدار ٹکڑے کی طرح رنگ برنگ لہریں اُٹھتی تھیں۔ دُور پانی دودھ کی طرح سفید تھا، پھر اس سے ادھر گلابی، دونوں جزیروں کے درمیان نارنگی کی طرح آتشین اور ہمارے عین نیچے سبزی مائل نیلا جیسے صاف شفاف نیلم ہو اور اُس کے حُسن کا پرتو خود اسی میں پڑ رہا تھا۔ اُس کی سطح پر بڑے بڑے جہاز کہیں بھی نظر نہ آتے تھے۔ صرف دو چھوٹی کشتیاں جن پر انگریزی جھنڈے لہرا رہے تھے ساحل کے ساتھ ساتھ اُڑی چلی جا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک جو اتنی بڑی تھی جتنی کسی پہرہ دار کی کٹی ہوتی ہے دخانی کشتی تھی، دوسری کو درجن بھر آدمی چپوؤں سے چلا رہے تھے اور جب چپو یک لخت پانی سے اوپر اُٹھتے تھے تو پگھلی ہوئی چاندی کے سے قطرے اُن سے گرتے تھے سادہ لوح مچھلیاں پانی سے باہر سر نکال نکال کر

جھانکتی تھیں اور بگلے محراب دار اڑانیں لگاتے ہوئے اُن کے اوپر اوپر منڈلاتے تھے کبھی کبھی نیلگوں آسمان پر دونوں برّاعظموں کے درمیان خاموش اور مطمئن عقاب مصروفِ پرواز نظر آتے تھے۔

پہاڑی کی ڈھلوان جس کی چوٹی پر ہم بیٹھے ہوئے تھے تمام کی تمام گلاب کے پھولوں سے ڈھنپی ہوئی تھی اور ہوا اُن کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ اُس قہوہ خانے سے جو سمندر کے قریب واقع تھا موسیقی کی لہریں صاف ہوا کے ساتھ مل ملا کر ہم تک پہنچتی تھیں اور راستے کی دُوری سے دھیمی ہو ہو جاتی تھیں۔

یہ کیفیت مسحور کن تھی۔ ہم سب خاموش بیٹھے تھے اور اپنی روحوں کو ہم نے اس جنّت کی تصویر میں غرق کر رکھا تھا۔ وہ نوجوان لڑکی اپنے سر کو اپنے شوہر کے سینے کا سہارا دیئے گھاس کے مخملیں فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے زرد بیضوی نازک چہرے پر ہلکی سی سرخی نمودار ہوئی اور اس کی نیلی آنکھوں سے یک لخت آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ یہ دیکھ کر سب کا دل بھر آیا۔ اُسکی ماں کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں اور میرے دل میں بھی درد کی ایک ٹیس اُٹھنے لگی۔

لڑکی نے آہستہ سے کہا یہاں روح اور جسم دونوں کو اچھا ہونا چاہیئے۔ آہ، یہ جگہ کیسی فرحت خیز ہے"!

لڑکی کے باپ نے کہا" خدا جانتا ہے میرا کوئی دشمن نہیں ہے لیکن اگر کوئی ہو بھی تو یہاں میں اُسے معاف کر دوں"!

اور پھر سب خاموش ہو گئے۔ ہم پر کچھ عجیب کیفیت طاری تھی۔ ایسی عجیب کہ زبان بھی اُس کے اظہار سے قاصر ہے! ہر ایک اپنے آپ میں مسرت کی ایک دنیا پاتا تھا اور ہر ایک تمام دنیا کو اِس دنیائے مسرت میں شریک کر لینے پر آمادہ تھا۔ سب کے دل کی ایک سی کیفیت تھی، اور

اسی لئے کوئی ایک بھی دوسرے سے تعرض نہ کرنا چاہتا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اُس یونانی نے اپنا بستہ لپیٹا، ذرا جھک کر ہمیں سلام کیا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ہم وہیں بیٹھے رہے۔ ہم میں سے کسی نے اُس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔

آخر کئی گھنٹوں کے بعد جب جنوبی منظر کی دوریوں پر تیرہ فام اداہٹ کی سحرکاری نمایاں ہونے لگی تو لڑکی کی ماں نے کہا کہ اب واپس جانے کا وقت ہے۔ ہم اُٹھے اور بے فکرے بچوں کی طرح ہلکے اور سبک قدم اُٹھاتے ہوئے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر ہم ہوٹل کے نفیس برآمدے میں بیٹھ گئے۔

اتنے میں نیچے سے کسی کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہمارا یونانی ہوٹل والے سے دست و گریباں ہو رہا تھا۔ ہم اُن کی لڑائی کا لطف اُٹھاتے رہے، مگر یہ تماشا کچھ زیادہ دیر تک نہ رہا۔ ہوٹل والا اب زینہ کو طے کر کے ہماری طرف آ رہا تھا اور غصہ میں کہہ رہا تھا "جیسے میرے پاس اور مہمان نہیں ہیں۔"

جب وہ قریب آ پہنچا تو نوجوان پولی نے کہا "ذرا مجھے بھی بتانا یہ شخص کون ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟"

ہوٹل والے نے زہر آلود نظروں سے نیچے جھانکتے ہوئے کہا "اِس کا نام؟ اس کا نام کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہم اِسے دیوِ خونخوار کہا کرتے ہیں۔"

"یہ مصور ہے نا؟"

"بھلی تجارت ہے!" ہوٹل والے نے کہا "یہ مُردوں کی تصویریں بناتا ہے۔ اُدھر کوئی قسطنطیہ میں یا یہاں گرد و نواح میں مرا۔ اِدھر اس کے ہاں مرنے والے کی تصویر مکمل ہوئی۔ یہ اُس کی موت سے پہلے ہی تصویر کھینچنی شروع کر دیتا ہے ——— اور اِس سے کبھی غلطی نہیں ہوتی ———

یہ گدھ ہے گدھ"!

دہشت کے مارے پولی عورت کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی ۔ اُس کی آغوش میں اُس کی بیٹی سرسوں کے پھول کی طرح زرد اور بے حس و حرکت پڑی تھی ۔ اُسے غش آگیا تھا +

ایک جست میں پولی لڑکے نے سیڑھیوں سے اُتر کر یونانی کو جا دبوچا ۔ ایک ہاتھ سے اُس نے اُسے قابو کیا ، اور دوسرے سے اُس کا بستہ چھیننے لگا +

ہم بھی اس کے پیچھے اُتر آئے ۔ دونوں ریت میں لوٹ رہے تھے ۔ بستہ کی تمام چیزیں نکال کر بکھیر دی گئیں ، ایک ورق پر اُس لڑکی کی تصویر تھی ۔ آنکھیں بند تھیں اور ماتھے پر پھولوں کا ایک ہار تھا +

جان نیروڈا

فرید

کیا تم چٹانوں کے سمندر کا تصوّر کر سکتے ہو؟ ایسا مقام کہ جدھر تم نگاہ ڈالو چٹان ہی چٹان نظر آئے ـــــــ سفید، نیلی، برہنہ چٹان آسمان سے باتیں کرتی ہوئی ـــــــ اسی کی آسمانی نیل کو چھوتی ہوئی چوٹی کو دیلی کہتے ہیں ۔ چٹانوں کے درمیان ایک جھیل ہے، بے حد لمبی، کیچڑ اور زرخیز ریت سے بھری ہوئی ـــــــ اسے بلاٹو کہتے ہیں ۔

اِسی جگہ میں فرید بے سے واقف ہُوا ۔ میں ایک چٹان کے پیچھے چھپ کر جنگلی بطخوں کے اترنے کا انتظار کر رہا تھا اور کوئی دو سو قدم کے فاصلہ سے اُس کی بندوق کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی ۔ جب شام کا اندھیرا چھا گیا تو نئے چاند کی روشنی میں وہ چٹان کے پیچھے سے نمودار ہُوا ۔ وہ مجھے ایک جِن کی طرح نظر آتا تھا، اور اُس کی بندوق اُس کے کندھے پر توپ کی طرح معلوم ہوتی تھی ۔

حقیقت میں اس کی بندوق میری بندوق سے کوئی ڈیڑھ گز لمبی تھی ۔ اور اس کی نالی ایک موٹے تازے بچّے کی کلائی سے زیادہ چوڑی تھی ۔ میں اپنی جگہ مُسکرایا ـــــــ میں جس کے پاس دونالیوں والی ہلکی لنکاسٹر تھی ۔ مگر جب میں نے فرید کو ایک بطخوں سے بھرا ہُوا تھیلا اُٹھائے ہوئے دیکھا تو میں نے اُسے سلام کیا اور ہم گہرے دوست بن گئے، شکار کے دَوران میں دل کا

پیمانہ چھلکنے کے قریب ہوتا ہے اِس لئے دوستیاں بہت جلد پیدا ہو جایا کرتی ہیں +

خزاں کے اُس موسم میں ہم تقریبًا ہر روز ایک دوسرے سے ملتے تھے - یہ وہ زمانہ تھا جب بوسینا والوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر رکھا تھا +

فرید نے مجھ سے کہا "تم بڑے شجاع ہو جو یہاں تک آنے کی جرأت کرتے ہو"

میں قہقہہ مار کر ہنسا۔

"کیا یہ شجاعت ہے کہ میں اپنی جان کی پروا نہیں کرتا؟ اور پروا کیوں کروں؟ آج میں موجود ہوں کل میرا نام و نشان بھی نہ ہو گا"

"سچ" فرید نے کہا، مگر میں نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھ کر جانا کہ وہ مجھے یُوں ہی دم دے رہا ہے ورنہ دراصل وہ میرا ہم خیال نہیں ہے +

فوجی افسر اور فرید کے دوست ہمارے ربط و اتحاد کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوا کرتے تھے کیونکہ فرید ایسا شخص تھا جو اپنے سوا کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا - صدی بھر کی آزادی اور امارت نے اُس کے دماغ میں پندار شرافت بھر دیا تھا +

مصروفیت کی وجہ سے میں کچھ روز کے لئے فرید سے نہ مِل سکا - باغیوں نے پھر ہمارے ایک افسر اور چار سپاہیوں کو قتل کر دیا تھا اور تقریبًا قلعہ کی تمام فوج قاتلوں کو گرفتار کرنے کے لئے بھیج دی گئی تھی +

اکتوبر کا مہینہ تھا لیکن جولائی کا سا گرم دن - سہ پہر کے وقت میں اپنے آدمیوں سمیت ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچا - گاؤں کے پہلے ہی مکان کے قریب مجھے بہت سے سپاہی نظر پڑے تقریبًا ساری کی ساری پلٹن وہاں موجود تھی - کرنل نے مجھے دیکھ کر مسرورانہ لہجے میں کہا "ایک تو ہمیں مل گیا"

میں بہت خوش ہؤا اور مجھے دن بھر کی کلفت بھول گئی۔" خوب ہؤا - اب ہم اچھی طرح اپنے ساتھیوں کا انتقام لیں گے!"

کرنل نے کہا" اُدھر دیکھو - ہم نے اُسے گولی سے اڑا دینے کا فیصلہ کیا ہے!"

میں نے دیکھا تو فرید بے دیوار کے ساتھ لگا ہؤا تھا اور آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا" کیا یہ ممکن ہے؟ اور تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟"

کرنل نے مسکرا کر جواب دیا" ثبوت وہ ہیں!" ایک چٹان پر دو آدمی سر جھکائے بیٹھے تھے اور کنکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے - یہ دونوں فرید بے کی رعایا تھے، اُسی کی قوم میں سے تھے اور اُسی کی زبان بولتے تھے - یہی فوج کو اس گاؤں میں لائے تھے اور کہتے تھے کہ ہم نے فرید بے کو اپنی آنکھوں سے ایک چٹان کے پیچھے چھپ کر فوجی افسر کو بندوق کا نشانہ بناتے دیکھا ہے"

میں حیران ہو گیا - مجھے اُس مجنونانہ پرخاش اور حسد کا اچھی طرح علم تھا جس کی آگ پوری ایک صدی سے اُن لوگوں کے دلوں میں اپنے حاکم کے خلاف سلگ رہی تھی، اِس لئے مجھے اُن "گواہوں" کی صداقت پر شبہ سا ہؤا میں نے اُن سے سوالات کرنے شروع کئے اِس خیال سے کہ شائد افسروں سے اُن کی بات سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو - اُنہوں نے من وعن واقعہ کو دھرا دیا - اُن کی بات ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ میرے پیچھے سے کسی نے گرج کر کہا:-

"تم جھوٹے ہو"

میں نے مڑ کر دیکھا تو فرید بے وہیں کھڑا تھا - اُس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں اور گردن تنی ہوئی تھی +

شاہد ہنس ہنس کر اُس کا مُنہ چڑا رہے تھے - غداری کا انعام اُن کی جیب میں تھا +

پھر میں فرید بے کے پاس گیا +

"تم اپنی برأت کیوں نہیں پیش کرتے، میاں ؟"

"مجھ سے کوئی پوچھے بھی ــ وہ تو ان حرام خوروں کی بات سنتے ہیں"۔

اُس کے شاندار قد و قامت، اُس کی پُر تمکنت خاموشی کو دیکھ کر وہ مجھے ایک بطلِ عظیم، ایک شہید معلوم ہو رہا تھا ۔ میرے دل میں خون جم گیا ۔ اب میں کرنل کی طرف متوجہ ہوا ۔ جس نے اس دوران میں گولی مارنے والوں کے انتخاب اور ترتیب کا حکم دے دیا تھا +

میں نے کہا "ہمارا افسر کس دن اور کس وقت مارا گیا تھا ؟"

اُس نے جواب دیا "پرسوں بدھ کے دن شام سے ذرا پہلے"

"پرسوں، بدھ کے روز دوپہر کے بعد سے رات تک تو فرید بے بلاٹو کے کنارے میرے ساتھ مصروفِ شکار تھا"

کرنل نے نہایت مایوس ہو کر کہا "کیا یہ ممکن ہے ؟"

"میرے افسر کا قول اُس کے لئے ضمانت ہے !"

"اور وہ گواہ ؟"

"کتوں کی طرح بکتے ہیں"۔

"اِن کو شکنجے میں کس دو !"

میں نے فرید بے کے ہاتھ کھول دیئے ۔ اُس کا بدن اس طرح کانپ رہا تھا جیسے ایک پتہ تیز و تند ہواؤں میں کانپتا ہے، اور اُس کی زبان خاموش تھی +

کچھ دیر کے بعد جب ہم دونوں قہوہ پی رہے تھے فرید نے دلی جوش کے ساتھ مجھ سے کہا "میرے آقا، میرے بھائی، اِس احسان کے بدلے جو کچھ بھی تم چاہو میں اُس کے لئے حاضر ہوں"

اُس دن کے بعد ہم نہایت گہرے دوست بن گئے - فرید کے ساتھ مجھے اُسی لمحہ سے محبت پیدا ہو گئی تھی جب میں نے اُسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا لیکن اب اُس کی شجاعانہ تصویر میری آنکھوں میں کھب گئی تھی ———— وہ عام لیکن اِس کے باوجود نجیبانہ تصویر، اور میں نے اپنے آپ سے پوچھا "کیا دریائے نربدا کے ساحلوں پر اس پتھر کے بنے ہوئے پُل کے سوا رُومی عظمت وشرافت کا کوئی اور نشان باقی نہیں رہ گیا ہے"

فرید جو عمر میں مجھ سے دس برس چھوٹا ہوگا، کس طرح میری خدمت کرتا اور میرا خیال رکھتا ہے! شکار میں میری بندوق اور تمام دوسرا سامان وہ خود اُٹھاتا ہے اور جب کبھی میں اُس کے گھر جاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ میرے بیٹھنے کے لئے اِتنی معزز اور آرام دہ جگہ بنانے کے نا قابل ہے جتنی اُس کا دِل چاہتا ہے، وہ اکثر اپنے گھر کے تمام گدیلے اور سرہانے اکٹھے کر لاتا او قہوہ، لیمونیڈ اور سگاروں سے میری اتنی تواضع کرتا کہ عموماً میں بیمار ہو جاتا - اب وہ میرے لئے ایک بطلِ عظیم نہ تھا بلکہ ایک ننھا بچہ، ایک شفیق محبُوب +

وہ اکثر آرزومندی کے لہجہ میں کہا کرتا "کاش کہ میں تمہارے کسی کام آسکوں...... کاش کہ مجھے معلوم ہو سکے کہ تمہاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے!"

ایک روز ایک ناشائستہ اور نازیبا خیال میرے سر میں سمایا - معلوم نہیں یہ حد سے بڑھے ہوئے مذاق کی ایک شکل تھی یا غیر معمولی خوشی نے میری عقل پر پردہ ڈال رکھا تھا کہ جب فرید ایک بند دروازے کو ذرا سا کھول کر چائے کا سامان لے رہا تھا تو دروازے کی اِس مختصر سی درز میں سے میری آنکھوں نے ایک خواب سا دیکھا - مشرقی حرم اور اُن کی پری وش کنیزیں میری نظروں کے سامنے پھرنے لگیں - کسی کی سحر طراز آنکھ کی ایک جھلک نے مجھ پر بجلی سی گرا دی تھی - پل بھر میں ایک خیال نے میرے دماغ کو اپنی لپیٹ میں جکڑ لیا - اور میں کہہ اُٹھا :-

"لو، فرید، میری ایک خواہش ہے"

"ہاں، بھائی، تم کہو، یہ پوری ہو کر رہے گی!"

ایک لمحہ کے لئے میں نے تامل کیا اور کچھ محجوب سا ہو گیا، لیکن میرا وحشی شوق راستبازی سے زیادہ طاقتور تھا۔ میں نے کہا:۔

"تمہاری بیوی کو مجھ سے چھپنا نہیں چاہیئے، جب کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ میں اُسے ایک مرتبہ دیکھنا چاہتا ہوں"

فرید جو ایک ابریق میں سے میرے لئے قہوہ انڈیل رہا تھا ایک لمحہ کے لئے ٹھہر گیا اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت متانت اور سکون سے دیکھا اور پھر غیر معمولی نرم آواز میں اُس نے کہا:۔

"کیا سچ مچ تمہاری یہی خواہش ہے؟"

ایسے لہجہ سے جس میں شوخی اور شوق بھرا ہوا تھا میں نے کہا "ہاں، یہی!"

وہ خاموش ہو گیا۔ اپنا ہاتھ سر کی طرف اٹھا کر اُس نے ٹوپی کو گردن کی طرف سرکا دیا اور اپنے چہرے اور سر کو ہاتھ سے ملنے لگا۔ پھر نظریں نیچی کر کے جھک کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر یکایک وہ پلٹا۔ میں جلدی سے اُٹھ کر اُس کے سامنے آ گیا۔ دو بڑے بڑے آنسو اُس کی آنکھوں سے نکل رہے تھے جنہیں اُس نے فوراً پونچھ ڈالا۔

میں نے ان دو آنسوؤں میں وہ تمام درد و کرب دیکھ لیا جس نے اُس کے قوی دل کو پگھلا دیا تھا۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی اور میں نے کہا:۔

"خدا کے لئے، فرید، مجھے معاف کر دو میں نہ جانتا تھا کہ میری فرمائش اتنی عظیم اور مشکل ہو گی، یقین جانو، مجھے اِس کا علم نہ تھا! لو، میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ مجھے اُس کے دیکھنے سے انکار ہے،

قطعی انکار۔ میری بات کا اعتبار کرو! میں نے تو اِسے ایک غیر اہم بات سمجھ کر کہہ دیا تھا، میں صرف مذاق کر رہا تھا۔"

میں اسی طرح اُس کی منتیں کر رہا تھا اور فریدہ رو رہا تھا، اب اُس کے آنسو تھم گئے۔ اور اُس نے کہا:۔

"اور تمہارے اس مذاق کے بدلے شاید زاہدہ جان سے چلی گئی ہوتی۔"

"وہ کیوں کر؟ خدا نا کردہ! تم نے کیا ارادہ کیا تھا؟"

"آج تم نے دوسری دفعہ میری جان بچائی .... اِس کے بعد کہ تمہاری آنکھیں اُسے دیکھ لیتیں۔ اِس پستول کی آنکھ کے سِوا کوئی زندہ آنکھ اُس پر نہ پڑ سکتی۔"

اُسی وقت اُس نے چاندی میں منڈھا ہوُا ایک پستول نکالا۔ پھر میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس سے پہلے کہ میں جانوں کہ وہ کیا چاہتا ہے اُس نے اُسے چوما اور پھر پیشانی سے لگا لیا۔

جب حقیقت میں میں نے اُس کی جان بچائی تھی تو تشکّر و امتنان کا ایک لفظ بھی اُس کی زبان سے نہ نکلا تھا اور اب وہ میرا ہاتھ چُوم رہا تھا۔

اُس وقت پہلی دفعہ میں شکسپیئر کے ان الفاظ کو سمجھا "محبت خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو بغیر رشک کے ہوا کو بھی محبُوب سے ہم آغوش ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

ولیڈی مرٹرسک

یہودی

یتیم

جب کولاک بیدار ہوا تو اُس نے بچے کو روتے ہوئے پایا، اُس نے بغیر آنکھیں کھولے اپنی بیوی کو آواز دی "گولڈا! دیکھنا اِس چھوکرے نے کیسا شور مچا رکھا ہے۔"

گولڈا نے کچھ جواب نہ دیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور دیکھا کہ وہ گھر میں نہ تھی وہ کچھ حیران سا ہوا لیکن پھر اُس نے سوچا کہ وہ شاید نہانے گئی ہے۔ اُس نے کپڑے کا ایک ٹکڑا اُٹھا کر بچے کے منہ میں ٹھونس دیا تاکہ اُس کے رونے کی آواز بند ہو جائے اور خود کپڑے پہننے میں مصروف ہو گیا۔

اُدھر وہ کپڑے پہن رہا تھا اور اِدھر دِل ہی دِل میں سوچ رہا تھا کہ چاندی کے جو شمعدان میں نے رات چرائے تھے اُن کی فروخت سے مجھے کیا ملے گا، وہ اسی خیال کی اُلجھن میں سامان کا جائزہ لینے کے لئے بالاخانہ پر چڑھ گیا۔ وہاں کچھ نہ تھا! اُس نے کونہ کونہ چھان مارا مگر وہاں کچھ نہ تھا!

جلدی سے وہ چھلانگ لگا کر نیچے اُترا اور اُس کی طرف گیا جہاں اُس کی بیوی کی چیزیں لٹکی رہتی تھیں۔ ایک جھٹکے سے اُس نے اُس کپڑے کو پھاڑ ڈالا جو اُن کو ڈھانکے رکھتا تھا۔ یہ چیزیں بھی جا چکی تھیں .... بس اب اُسے معلوم ہونے لگا کہ وہ بھاگ گئی ہے مگر کس کے ساتھ؟

"اچھا اُسے بھاگنے دو .... اُسے جہنم میں بھیجو .... میں تو اُس پر خاک بھی نہیں ڈالتا" یہ الفاظ نہایت بے پروائی کے ساتھ اُس کے منہ سے نکلے +

اُس نے بچے پر نظر ڈالی -

"مگر اس مردود بچے کو اب میں کیا کروں" اُس نے آہستہ سے کہا " اگر میں جانتا کہ وہ کہاں ہے تو میں اسے اُس کے دروازے پر جا کر ڈال آتا، کہ اِسے لے لو، یہ تمہارا ہی ہے"

یکایک اُس کے دِل میں ایک تاریک خیال پیدا ہوا جس سے اُس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ اپنے اوپر کے ہونٹ کو دانتوں میں لے کر کاٹنے لگا، اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ وہ بچے کے قریب پہنچا جو بستر میں بالکل برہنہ لیٹا ہُوا تھا - کمبل کو اُس نے لاتیں مار مار کر ایک طرف پھینک دیا تھا، دونوں ہاتھوں کو منہ میں گھسیڑ رکھا تھا اور کمرے کی تنہا فضا میں ایک عجیب مبہم انداز سے مسکرا رہا تھا +

وہ بچے کے پاس سے ہٹ گیا، جلدی سے اپنی ٹوپی پہنی اور دروازے کو تالا لگاتا ہُوا باہر نکل گیا - وہ بلا ارادہ چلتا گیا لیکن اُس کے دِل کو چین نہ تھا بچے کے رونے کی آواز اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی جیسے وہ اُسے بلا رہا ہے - تصوّر کی آنکھوں سے وہ اُسے اپنے سامنے دیکھ رہا تھا .... لاتیں چلاتے ہوئے اور واویلا کرتے ہوئے .... نہیں، نہیں! مجھے واپس جانا چاہیئے +

اُس نے خیال کیا " اگر اب مجھے اُس عورت پر قبضہ حاصل ہو جائے تو میں اُسے گردن سے پکڑوں اور اُس کا گلا گھونٹ دوں .... اُس کا گلا گھونٹ دوں یہاں تک کہ اُس کی زبان باہر نکل آئے اور یُوں اُسے جہنم میں پہنچا دوں +

وہ ایک نان بائی کی دوکان میں داخل ہوا روٹی خریدی اور واپس گھر کی طرف چل دیا۔

بچہ اُسی طرح پڑا تھا اب بھی اُس کے جسم پر سے کپڑا اترا ہوا تھا مگر وہ مسکرا رہا تھا +

" اس چھوکرے کو شیطان لے جائے، یہ کم بخت تو بڑے آرام سے لیٹا ہوا ہے"۔ یہ کہکر وہ پھر گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ چلتا تھا مگر اُس کے قدم نہ اُٹھتے تھے۔ بچے کے رونے کی آوازیں رہ رہ کر اُس کے کانوں میں گونجتی تھیں اور اُس کے دل میں سوراخ کئے ڈالتی تھیں +

غصّہ میں اُس نے اپنی مٹھیوں کو ایک مرتبہ بند کیا اور گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اِس دفعہ بچہ" رو رہا تھا" مامم ما!......... مامم ما!..........."

اُس نے کہا" اپنی ماما کو بلاتے ہو؟ جاؤ تو ذرا اس امول ماما کو ڈھونڈھ لاؤ ...... اُسے طاعون ہو جائے!"

اُس نے بچے" کو اُٹھا لیا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں سے کسی چیز کو اُس کے ہاتھوں میں پڑا ڈھونڈھ رہا تھا +

اُس نے بچے کو تھپکاتے ہوئے کہا" آگ لگے اُس کی زشت و بد اطوار روح کو .... مت رو میرے بچے، اب چپ ہو جا........ چپ ہو جا، میں تیری منت کرتا ہوں، چپ ہو جا"

بچہ اپنے ننھے سے منہ کے ساتھ برابر کچھ تلاش کرتا رہا، اپنے ہاتھ پھیلاتا رہا اور سر کو ہلاتا رہا، جیسے وہ ابھی بولنے لگے گا۔ اُس نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا اور اِدھر اُدھر دو کی تلاش کرنے لگا۔ آخر اُسے چولھے پر تھوڑا سا دودھ مل گیا جس میں اُس نے ذرا سی روٹی کو بھگویا۔ پھر تھوڑی تھوڑی غذا بچے" کے مُنہ میں ڈالنے لگا۔ اور محبت آمیز آواز میں اُس سے باتیں کرنے لگا" کھا، میرے ننھے، کھا........ تیری ماں .... اُسے شیطان لے جائے...... تجھے چھوڑ کر چلی گئی........ کوئی کتیا بھی اپنے بچوں کو یوں نہیں چھوڑتی........ وہ کتوں

سے بھی بدتر ہے .... مت رو .... نہیں، میں تجھے نہیں چھوڑوں گا ...... مجھے اپنی عزت کی قسم میں تجھے نہیں چھوڑوں گا ۔"

جب بچہّ خاموش ہو گیا تو اُس نے اُسے ایک کپڑے میں لپیٹ لیا اور باہر لے گیا ۔ گلی میں اُس کی آمد سے ایک ہلچل مچ گئی سب نے شور مچا دیا ۔ کراڈک نے دُور ہی سے پکار کر کہا "او کولاک! یہ مینا کہاں سے اُٹھا لائے ؟"

کراڈک کی بیوی ایک جوش کے ساتھ اٹھی اور اپنی باہیں پھیلا کر بچے کی طرف بڑھی، اُس نے وفورِ مسّرت میں کئی مرتبہ اپنے چہرے کو اپنی چادر سے پونچھا .... ہنستی رہی اور ننھے بچے کے چوتڑوں پر ہلکے ہلکے تھپڑ مارتی رہی ۔ پھر کہنے لگی "کولاک کیا یہ تمہارا بچہ ہے؟ مگر میں نے کبھی .... اُس کی پیاری پیاری آنکھوں کی طرف دیکھو ۔ بالکل ماریناَ کی آنکھیں معلوم ہوتی ہیں ۔ اور ناک بھی بالکل اُسی کی سی ۔ کیسا موتی سا بچہّ ہے! اِسے مجھے دو! .... " اُس نے بچےّ کو لے لیا اور اپنے ہاتھوں میں اُسے اچھالنے لگی "اچھا! ..... اچھا! شریر بچے ۔"

بوڑھا کراڈک، چوروں کا اُستاد، آہستہ سے اُٹھا، بچےّ کے پاس پہنچا اُسے اچھی طرح دیکھا اور کولاک کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کہنے لگا "خوب موٹا تازہ چھوکرا ہے .... مکانوں کی سردلوں پر بڑی آسانی سے چڑھ جایا کرے گا .... مگر اس کی ماں کون ہے ؟"

کولاک نے جواب دیا "خدا کرے وہ آگ کی طرح جلے ۔ وہ چاندی کے شمع دان لے کر بھاگ گئی"

"اور بچےّ کو چھوڑ گئی ؟"

"ہاں"

"یہ بہت بُری بات ہے .... یہ بہت بُری بات ہے ۔"

بوڑھا اپنے سر کو کھجلانے لگا - اُس کا بیٹا کولاک کے پاس آیا اور کہنے لگا "اچھا ہوا میں سمجھتا ہوں کہ اب تمہیں اپنا پیشہ چھوڑنا پڑے گا اور بچے کی انّا بن کر اُسے پالنا پڑے گا - اُس نے تمہارے ساتھ خوب داؤ کھیلا - کیوں ٹھیک ہے نا؟"

کولاک نے کہا "تم میرے غم میں اپنا سر نہ پھوڑو - خدا ہر ایک کو روزی دینے والا ہے اور کولاک بھی کولاک ہے!"

اُس نے بچے کو اپنی آغوش میں لے لیا اور شہر سے باہر جنگل کی طرف چل دیا اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لوگ پیچھے اُس کی طرف انگلیاں اٹھا رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں -

جنگل میں پہنچ کر وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا +

آس پاس کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا - درختوں سے پتے گرتے تھے تو وہ ایک غمناک آواز میں سرسراتے تھے - دور ایک پتھروں کو روندتی ہوئی اور ساحل کی چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی ندی کے پانی کا ہلکا اور مبہم سا شور سنائی دیتا تھا +

اُس نے بچے کو اپنے پاس نیچے رکھ دیا اور رقت انگیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا - بچہ اپنا انگوٹھا مُنہ میں ڈالے خاموشی سے اُس کی طرف تک رہا تھا جیسے کسی گہری سوچ میں کھو گیا ہے - کولاک کو کچھ معلوم نہ تھا کہ بچے کو کیا کرے ایک لمحہ کے لئے اُس کو یہ خیال آیا کہ وہ بھی اسے چھوڑ دے لیکن معاً اُس بے کس ننھی سی جان کے لئے، اس اپنے ہی گوشت اور خون کے لئے اس کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہو گیا جس نے پہلے خیال کو بالکل فنا کر دیا - اُس نے پھر بچے کو اپنی گود میں لیا اور اُس کے چہرے کے خوبصورت نقوش پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے اُسے اپنے سینے کیساتھ بھینچ لیا - اُسے اُس کی شکل میں اپنی ہی صورت کا عکس نظر آیا اور اس خیال سے ایک پُر مسرت گرمی اُس کے تمام اعضا میں دوڑ گئی - اُس نے بچے سے کہا "ننھے کولاک! .... ہاں تو

ایک ننھا سا کولاک ہے۔ اور میں شرط بدنے کے لئے تیار ہوں کہ تو بڑا ہو کر بہت ہی خوبصورت اور تناور جوان بنے گا۔ تو مکانوں کی سرلوں تابدانوں اور کھڑکیوں پر چشم زدن میں چڑھ جایا کرے گا، تالے توڑا کرے گا اور لوگوں کا مال و زر چرالایا کرے گا .... اور پھر تیرے بچے ہونگے اور اُن کی ماں اُن کو چھوڑ کر بھاگ جائے گی .... لیکن ــــ کیا تو اپنے بچوں کو ساتھ لے کر در بدر بھیک مانگتا پھرے گا؟ ..... تو کون ہے؟ ..... ایک ڈاکو، میری ہی طرح .... اے تو جو میں ہوں"۔

اُس نے بچے کو دریا کے کنارے کے پاس زمین پر رکھ دیا اور خود ایک درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کیا کرتا ہے .... وہ جلد جلد لاتیں مارتا رہا اپنے ہاتھوں کو چُوستا رہا اور ماما، ماما کہہ کر کھیلتا رہا۔

وہ ایک اور دُور کے درخت کے پیچھے چھپ گیا لیکن یہاں بھی اس کی آواز اُسے آتی رہی اِسی طرح وہ ایک درخت سے دوسرے درخت کی اوٹ میں بچے سے دور اور دور ہوتا گیا یہاں تک کہ اُس کی آواز اُس کے کانوں تک پہنچنے سے رہ گئی اور اُس کی صُورت اُس کی آنکھوں سے چُھپ گئی ......
پھر وہ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ اُٹھا۔ لیکن اس دوڑ میں بھی بچے کی چیخوں کا شور اُس کے کانوں میں گونجتا رہا۔ یکایک اُس کے دل میں خیال پیدا ہوا "کہیں وہ لڑھک کر دریا میں نہ گر رہا ہو"؟ ...... اُس کا سر چکرایا اور اُس کا دل ریزہ ریزہ ہو گیا ...... مگر وہ دوڑتا رہا ....

وہ یک لخت ٹھہر گیا، آس پاس ایک نظر دوڑائی اور تیزی کے ساتھ اُلٹے پاؤں روانہ ہوا۔

بچہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اُس نے اُسے گودی میں لے لیا۔ اور جنگل کے نواح کی جھونپڑیوں کی طرف چل دیا۔ ایک دروازے سے ہٹ کر دوسرے دروازے پر وہ پہنچتا تھا اور ایک شکستہ آواز میں کہتا تھا! "یتیم کو تھوڑا سا دودھ دو .... یتیم کو تھوڑا سا دُودھ دو"۔

شولم ایش

خالد اور حمیدہ

محارب اور ظہیر ایک ہی ماں باپ سے دو بھائی تھے، دونوں اپنی جرأت اور شجاعت کی وجہ سے ملک بھر میں مشہور تھے۔ لیکن محارب قبیلے کا سردار تھا اور ظہیر اُس کا وزیر تھا۔ محارب اُس کے مشورے پر چلتا تھا۔ مگر ظہیر پھر بھی اُس کا تابع فرمان تھا۔ اتفاق ایسا ہُوا کہ اُن کے درمیان کسی معاملہ پر سخت تکرار ہوئی۔ اور بڑا بگاڑ پیدا ہو گیا۔ ظہیر اُٹھ کر اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔ وہ نہایت مغموم تھا اور نہ جانتا تھا کہ اب کیا کرے، اُس کی بیوی نے اس سے پوچھا "اے عربی سرداروں کے سردار! تم اس قدر آزردہ خاطر کیوں ہو؟ کیا تمہیں کسی نے ناراض کیا ہے یا کسی نے تمہاری توہین کی ہے" ؟ ظہیر نے کہا "میں کیا کروں وہ جس نے میرے دل کو زخمی کیا ہے وہ ہے جس پر میں اپنا ہاتھ نہیں ڈال سکتا، جسے میں کوئی مضرت نہیں پہنچا سکتا وہ دنیا میں میرا ایک ہی رفیق، میرا بھائی ہے۔ آہ، اگر وہ کوئی اور ہوتا تو میں اُسے بتا دیتا کہ وہ کیسے شخص کا مدمقابل ہُوا ہے۔ اور اپنی قوم کے رؤسا کے سامنے اُس کی مثال کو ایک عبرت بنا کر پیش کرتا"۔ اُس کی بیوی نے کہا "اُسے اپنے مال و منال سے لطف اٹھانے دو اور تم یہاں سے چلو"۔ اور ظہیر کو آمادہ کرنے کے لئے اُس نے بڑے بڑے شعرا کے شعر پڑھے، جن میں مذکور تھا کہ توہین انسان کو اپنے ماں باپ کی جانب سے بھی قبول نہیں کرنی چاہیئے۔

ظہیر نے اپنی بیوی کے مشورہ کو مان لیا۔ اُس نے رخصت کی تیاری کر لی۔ اپنے خیمے

لپیٹ لئے اونٹوں پر اسباب لادا، اور قبیلۂ سعد کی قیام گاہ کی طرف چل دیا جو اُس کے حلیف تھے مگر اُس کے دِل میں اپنے بھائی سے جدا ہونے پر رہ رہ کر ایک درد اُٹھتا تھا ——— اور اُس نے کہا "اُس سفر میں جو مجھے تجھ سے دُور لے جا رہا ہے مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں ہزار سال چلتا رہوں گا اور ہر سال مجھے تجھ سے ہزار میل دُور لے جائے گا......... اگر اَب تو مجھ پر ہزار مصر کے برابر بھی احسان کرے اور ہر مصر میں ایک ہزار نیل ہوں تو میں اُنہیں حقارت کے ساتھ ٹھکرا دوں گا جب تک میں تجھ سے دُور رہوں گا اپنی کم مائیگی پر قناعت کروں گا اور جدائی کے دِنوں میں اِس شعر کو پڑھوں گا جو تابناک موتیوں کی لڑی سے بھی زیادہ قیمتی ہے "جب کسی شخص کی اپنی ہی قوم اور اپنے ہی وطن میں تحقیر کی جائے تو اُس کے لئے اِس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ تُو جس نے میرے دِل کو یوں زخمی کیا ہے۔ بہت جلد رحمٰن و رحیم خدا کی قوت کو محسوس کرے گا کیوں کہ وہی میرے اور تیرے درمیان فیصلہ کرنے والا اور قائم و دائم ہے۔"

آخر ظہیر قبیلۂ سعد میں پہنچ گیا اور گھوڑے پر سے نیچے اُتر آیا۔ بنو سعد نے اس کا نہایت پُرجوش خیر مقدم کیا، اور اسے اپنے پاس رہنے پر مجبور کیا، اُس کی بیوی جلد ہی ایک بچے کی ماں بننے والی تھی، اور ظہیر نے اُس سے کہا "اگر خدا نے ہمیں لڑکا دیا تو یہ اُس کی عین عنایت ہے لیکن اگر لڑکی پیدا ہوئی تو اُس کا چرچا نہ کرنا اور لوگوں کو اس مغالطے میں رہنے دینا کہ ہمارے ہاں لڑکا ہوا ہے تاکہ میرے بھائی کے لئے وجہ شماتت پیدا نہ ہو۔" آخر وہ وقت بھی آن پہنچا اور ظہیر کی بیوی کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی انہوں نے اُس کا نام جیدہ رکھا لیکن ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا کہ باہر لوگوں میں اُسے جندر کہہ کر پکارا جائے تاکہ وہ اُسے لڑکا سمجھیں، اور لوگوں کو اس کا مزید یقین دلانے کے لئے اُن کے ہاں کئی دن صبح اور شام دعوتیں اور جلسے ہوتے رہے۔

قریب قریب اسی زمانے میں دوسرے بھائی محارب کے گھر بھی لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اس نے خالد رکھا۔ اُس نے یہ نام خدا کی بارگاہ میں شکرانہ کے طور پر منتخب کیا۔ کیونکہ جب سے اُس کا بھائی اُسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کے معاملات سلجھ رہے تھے۔ دونوں بچے جوان ہو گئے، اور ان کی شہرت عرب کے طول و عرض میں پہنچ گئی۔ ظہیر نے بیٹی کو گھوڑے کی سواری اور وہ تمام فنون جنگ سکھا دیئے تھے، جو ایک جری اور بہادر سپاہی کے لئے سیکھنے لازمی ہیں۔ اُس نے اُسے سخت سے سخت اور خطرناک سے خطرناک مہم میں کود پڑنے کا عادی بنا دیا تھا۔ جب کبھی وہ کسی جنگ پر جاتا یا قبیلے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ اسے بھی ہمراہ لے لیتا۔ اور ان جنگی سواروں میں جیدہ نے اپنی شجاعت کے طفیل جلد ہی ایک امتیازی درجہ حاصل کر لیا۔ اور ایسا ہوا کہ وہ بہادری میں اپنے رفقاء سے سبقت لے گئی، یہاں تک کہ وہ تن تنہا شیروں پر اُن کے غاروں میں جا کر حملہ کر دیا کرتی تھی، اُس کا نام سن کر لوگ کانپ جایا کرتے تھے، جب وہ کسی بہادر کو مغلوب کرتی تھی وہ ضرور کہا کرتی تھی "میں جندر ابن ظہیر ہوں جو قبیلوں کا شہسوار ہے"۔

ادھر اُس کے عم زاد بھائی خالد نے بھی اپنے دلیرانہ کارناموں کے باعث بڑا نام پیدا کیا تھا اُس کے باپ محارب نے جو ایک نہایت عقلمند اور دانا سردار تھا اجنبیوں کی تواضع کے لئے محلات تعمیر کرا رکھے تھے جہاں بہادران ملک کی خصوصاً بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی، خالد بڑے بڑے جنگجوؤں کی صحبت میں پلا اور بڑھا تھا۔ یہی وہ مکتب تھا جس میں اُس کے ذوق کی تربیت ہوئی تھی۔ یہیں اُس نے شہسواری کا فن سیکھا تھا، اور اب ایک بے باک سپاہی اور خوف انگیز مبارز بن گیا تھا۔ اُس کے سپاہیوں کو اب علم ہو چکا تھا کہ اُس کے جوش اور اُس کی قوت پر کوئی غلبہ نہیں پا سکتا۔

آخر اُس نے اپنے بھائی جندر کے متعلق سنا اور اُس کے دل میں اُس کے ملنے، اُس کے حالات معلوم کرنے اور اُس کے کرتب دیکھنے کا بے انتہا شوق پیدا ہوا۔ لیکن وہ اپنے شوق کو پورا نہ کر سکتا تھا کیونکہ اُس کا باپ اپنے بھائی کے اُس بیٹے کے متعلق اکثر ناپسندیدگی کا اظہار

کیا کرتا تھا، خالد کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی - یہاں تک کہ اُس کے باپ محارب کا انتقال ہوگیا - جس سے اعزاز دولت اور حکومت اُس کے اپنے قبضہ میں آ گئی، اجنبیوں کی تواضع، غربا اور مساکین کی دستگیری اور بھوکے ننگوں کو کھانا کپڑا دینے میں وہ اپنے باپ کا پیرو تھا اُس نے اپنے بہادر سپاہیوں کی معیت میں بادیہ پیمائی کا سلسلہ بھی جاری رکھا جس نے اُس کی جسمانی قوت اور جرأت کو اور بڑھا دیا - کچھ عرصے کے بعد اُس نے بہت سے قیمتی تحائف جمع کئے اور اپنی ماں کو ساتھ لے کر اپنے چچا سے ملنے کے لئے چل کھڑا ہوا، اُس نے اُس وقت تک اپنے گھوڑے کی لگام نہ کھینچی جب تک وہ ظہیر کے خیمے کے پاس نہ پہنچ گیا - ظہیر اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اُس نے اس کی خاطر و تواضع کا بڑا اہتمام کیا، کیوں کہ اُس نے اپنے بھتیجے کی قابلیت اور شجاعت کی باتیں کئی موقعوں پر سُنی تھیں - خالد جبیرہ سے بھی ملا - اُس نے اُسے سلام کیا اور پھر گلے سے لگا کر اُس کی پیشانی کو چُوما یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ بھی اسی کی طرح مرد ہے - جبیدہ کی رفاقت میں اُسے بے انتہا خوشی حاصل ہوئی اور وہ دس دن تک اپنے چچا کے ہاں مقیم رہا - اِس اثنا میں اس نے شہسواری اور سپہگری کے کتنے ہی مقابلوں میں حصّہ لیا - اُدھر جبیدہ کا یہ حال تھا - کہ جب سے اُس کی نظر خالد کی شجاعت اور حسن پر پڑی تھی وہ سو جان سے اس پر نثار ہو چکی تھی اُسے نیند نہ آتی تھی، اُسے کھانا پینا بھول گیا تھا اور اُس کی محبت اس درجہ بڑھ گئی تھی اور اُسے اپنا دل یہاں تک خالد کے قبضے میں نظر آتا تھا کہ اُس نے اپنی ماں سے کہا "اے میری ماں! اگر خالد مجھے چھوڑ کر چلا گیا تو میں اُس کی جدائی میں مرجاؤں گی"۔ اُس کی ماں نے جب یہ سُنا تو اپنی بیٹی پر اُسے بڑا رحم آیا - اُس نے اُسے کچھ نہ کہا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ ناراض ہونا بےکار ہے اُس نے کہا "جبیدہ، اپنے جذبات کو چھپاؤ اور غم سے اپنے آپ کو نجات دو تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی، کیوں کہ خالد تمہاری پسند کا لڑکا ہے اور اُس کی رگوں میں تمہاری قوم کا خون دوڑ

رہا ہے اُسی کی طرح تم خوبصورت اور دلربا ہو اور اسی طرح تم بہادر اور شہسواری میں فرد ہو ۔ کل صبح جب اُس کی ماں ہمارے ہاں آئے گی تو میں سب معاملہ اُس کے سامنے پیش کردوں گی، پھر ہم جلد ہی تمہاری شادی خالد سے کردیں گے اور آخر کار ہم سب اپنے وطن کو واپس چلے جائیں گے۔

ظہیر کی بیوی آنے والی صبح کا انتظار کرتی رہی ۔ جب خالد کی ماں اُن کے ہاں آئی تو وہ اپنی بیٹی کو اُس کے پاس لے آئی ۔ جیدّہ کے لمبے لمبے بال کندھوں پر پڑ رہے تھے ۔ حسن کی اُس تصویر کو دیکھ کر خالد کی ماں ششدر رہ گئی، اور کہنے لگی:۔ "کیا یہ تمہارا بیٹا جیندر نہیں ہے؟" جیدہ کی ماں نے کہا:۔ "نہیں! یہ جیدہ ہے ——— ماہ حسن کو دیکھو وہ طلوع ہوچکا ہے۔" پھر اُس نے وہ تمام باتیں سنائیں جو اس کے اور اُس کے شوہر کے درمیان بچے کی تذکیر و تانیث کو چھپانے کے متعلق قرار پائی تھیں ۔ خالد کی ماں نے جس کی حیرت ابھی کم نہ ہوئی تھی جواب دیا:۔ "میری پیاری بہن ملکِ عرب کی تمام بیٹیوں میں جو اپنے حُسن کے لئے مشہور ہیں میں نے کبھی اِس سے زیادہ پیارا چہرہ نہیں دیکھا ۔ اِس کا نام کیا ہے؟" جیدہ کی ماں نے کہا "میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اِس کا نام جیدہ ہے ۔ اور اس راز سے تمہیں آگاہ کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ میں یہ حسن وجمال کا تحفہ تمہیں پیش کروں ۔ میری دلی خواہش ہے کہ میں اپنی بیٹی کو تمہارے بیٹے سے بیاہ دوں ۔ اور اس طرح پھر ہم اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔" خالد کی ماں نے فوراً اس تجویز کو مان لیا ۔ اور کہنے لگی:۔ "جیدہ کی رفاقت یقیناً میرے بیٹے کو بہت مسرور کرے گی ۔ وہ فوراً اُٹھی اور خالد کو تلاش کرکے اُس نے جو کچھ دیکھا اور سُنا تھا اُسے بتادیا، اور جیدّہ کے حُسن وجمال کا خاص طور پر ذکر کرتی رہی اُس نے کہا "مجھے اپنے ایمان کی قسم، اے بیٹے، میں نے جیدّہ سے زیادہ خوبصورت لڑکی نہ کبھی صحرا میں دیکھی ہے اور نہ کبھی شہر میں ۔ کوئی چیز اپنے حسن میں اس سے زیادہ کامل نہیں ہے اور کوئی چیز اِس سے زیادہ دلآویز اور اس سے زیادہ دلکش نہیں ہے ۔ جلدی کرو میرے

بیٹے اور اپنے چچا سے مل کر اُس کی لڑکی کو اپنے لئے مانگ لو۔ اگر وہ تمہاری استدعا کو قبول کر لے تو یقیناً تم خوش قسمت ہو گے، جاؤ اور جلد سے جلد اُسے حاصل کر لو۔"

یہ الفاظ سُن کر خالد کی آنکھیں جھک گئیں۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ کچھ متفکر سا ہو گیا، پھر اُس نے کہا، اماں، میں یہاں اب اور نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے اب اپنے سواروں اور فوجیوں سمیت یہاں سے رخصت ہونا چاہیئے۔ مجھے اب جبیدہ سے کچھ نہیں کہنا، مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایک لڑکی ہے جس کا مزاج اور جس کا فلسفہ غیر معین ہے اُس کی سیرت اور اُس کا طرز کلام استحکام اور استقلال سے عاری ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنی زندگی سپاہیوں کے درمیان گذاری ہے۔ جن پر میں ایثار و بے صرف کرتا ہوں اور جن کے ساتھ مل کر میں نے اپنی سپاہیانہ شہرت حاصل کی ہے اب رہی جبیدہ کی میرے لئے محبت، سو یہ ایک عورت کی کمزوری ہے، ایک نوجوان لڑکی کی۔"

پھر اُس نے اپنا زرہ بکتر پہن لیا، اپنے گھوڑے پر سوار ہوا، چچا کو خدا حافظ کہا، اور اسی وقت اپنی روانگی کا اعلان کر دیا۔ ظہیر نے پوچھا "آخر اس جلدی کے کیا معنی ہیں؟" خالد نے کہا "میں اب یہاں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔" اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر یکایک صحرا کی وسعت میں کود پڑا۔ خالد کی ماں بھی وہ تمام گفتگو جو اُس کے اور خالد کے درمیان ہوئی تھی جبیدہ کو بتانے کے بعد ایک اونٹ پر سوار ہوئی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

جبیدہ کی حساس روح نے اس تحقیر کو بڑا محسوس کیا۔ وہ اسی سوچ میں ڈوب گئی —— اُس کی نیند اڑ گئی اور اُس کی بھوک زائل ہو گئی کچھ دن کے بعد جب اُس کا باپ اپنے سواروں کے ساتھ دشمنوں پر ایک حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا تو اس کی نگاہ جبیدہ پر پڑی۔ اُسے یُوں افسردہ اور پژمردہ دیکھ کر اُس نے کچھ نہ کہا۔ اُس نے سوچا کہ کچھ دنوں کے بعد وہ یقیناً پھر اپنے آپ میں آ جائے گی۔

ابھی ظہیر نظروں سے اوجھل ہی ہوا تھا کہ جبیدہ نے جو اپنے آپ کو موت کے بالکل قریب سمجھ رہی تھی اور جس کی اداسی اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی اپنی ماں سے کہا "اماں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں مر رہی ہوں در آنحالیکہ یہ کم بخت خالد اپنی زندگی کی قوتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے، اگر خدا مجھے قوت دے تو میں چاہتی ہوں کہ اسے موت کے قہر و غضب کا تجربہ کراؤں اور اُس کے درد و کرب کا مزہ چکھاؤں " یہ کہہ کر وہ ایک شیرنی کی طرح اُٹھی، اُس نے زرد پہنی اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ماں سے کہنے لگی کہ میں شکار کے لئے جا رہی ہوں - تیزی سے اور بغیر کہیں ٹھہرے وہ چٹانوں اور پہاڑیوں کو طے کرتی ہوئی اور اپنے بڑھتے ہوئے جوش کو بڑھاتی ہوئی خالد کی قیام گاہ میں پہنچ گئی - چونکہ اُس نے بھیس بدل رکھا تھا اِس لئے کسی نے اُس کو نہ پہچانا اور وہ اُس خیمے میں داخل ہو گئی جو اجنبیوں کے قیام کے لئے مخصوص تھا - اُس کے خود کی آنکھیں حجازی سواروں کی طرح جھکی ہوئی تھیں، غلاموں اور خادموں نے اُس کا استقبال کیا اور اس طرح اس کی خاطر و مدارات کی جیسے وہ ملک کی کوئی بہت عالی رتبہ شخصیت تھی - اس رات جبیدہ نے آرام کیا، لیکن دوسرے دن فوجی ورزشوں میں اُس نے حصہ لینا شروع کر دیا بہت سے بہادروں کو دعوتِ مقابلہ دی اور اپنی کارزانی اور بہادری کی ایسی نمائش کی کہ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے - دوپہر سے بہت پہلے اُس نے خالد کے سب بہادروں سے اپنی فوقیت تسلیم کرا لی - خالد خود اُس کی شجاعت کا نظارہ کرنے آیا، اور جب اُس نے اُس کا کمال فن ملاحظہ کیا تو وہ حیران رہ گیا، اور اپنے آپ کو اُس کے مقابلہ کے لئے پیش کیا - جبیدہ فوراً مقابلے کے میدان میں آ گئی اور پھر دونوں لڑائی میں گتھ گئے ایک ایک کر کے اُنہوں نے حملے اور مدافعت کے تمام داؤں آزما ڈالے یہاں تک کہ رات کے سائے اُن پر چھانے لگے - جب وہ جدا ہوئے تو کسی کو کوئی مضرت نہ پہنچی تھی اور دونوں میں سے کوئی بھی نہ کہہ سکتا تھا کہ فریق غالب

کون ہے - یوں جب جیدہ تماشائیوں پر اپنی بہادری کا سکہ بٹھا رہی تھی تو اُس نے دیکھا کہ لوگ اپنے سردار کو ایک اجنبی کے ہاتھوں مجبور دیکھ کر کچھ جز بز سے ہو رہے ہیں - خالد اپنے حریف کے لئے ہر ممکن خاطر و مدارات کے احکام دے کر اپنے خیمے کی طرف چل دیا - اُس کا دل آج کے معرکے کے خیالات سے بھرا ہوا تھا - جیدہ تین دن تک خالد کے ہاں مقیم رہی - ہر صبح وہ مقابلے کے میدان میں آدھمکتی اور جب تک رات نہ ہو جاتی وہ اپنے ہتھیار ہاتھ سے نہ رکھتی - اُس نے ان مقابلوں سے خوب لطف اُٹھایا مگر اپنے آپ کو ظاہر نہ ہونے دیا - اُدھر خالد نے بھی اُس سے کچھ نہ پوچھا کوئی سوال نہ کیا کہ وہ کون ہے اور کس قبیلے سے ہے *

چوتھے دن صبح کے وقت جب خالد حسب معمول اپنے گھوڑے پر چڑھ کر باہر نکلا اور مہمانوں کے خیموں کے پاس پہنچا تو اُس نے جیدہ کو بھی ایک گھوڑے پر سوار دیکھا - اُس نے اُسے سلام کیا اور اُس نے سلام کا جواب دیا - خالد نے کہا " اے شریف عرب، میں تجھ سے ایک سوال کرتا ہوں، گو میں اَب تک اظہار نیازمندی سے قاصر رہا ہوں لیکن اب میں اُس خدا کے نام پر تجھ سے التجا کرتا ہوں جس نے تجھے یہ قوت اور حسین عطا کی ہے مجھے بتا کہ تو کون ہے، اور تیرا تعلق کس بادشاہ سے ہے؟ کیونکہ میں نے تیرے جیسا بہادر جنگجو آج تک نہیں دیکھا - مجھے بتا میں تجھ سے عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کیونکہ میں یہ معلوم کرنے کے لئے سخت بے تاب ہوں "

جیدہ مسکرائی اور خود کو اوپر اُٹھاتے ہوئے اُس نے جواب دیا " خالد میں ایک عورت ہوں جنگجو نہیں ہوں، میں تیرے چچا کی بیٹی جیدہ ہوں جس نے اپنے آپ کو تیرے سامنے پیش کیا تھا، اور اپنا آپ تجھے دے ڈالنے کی خواہش کی تھی مگر تو نے انکار کر دیا ——— اپنے اُس غرور میں جو تجھے اپنی تلوار کے باعث ہے " یہ کہہ کر اُس نے اپنے گھوڑے کا منہ موڑا، ایڑ لگائی اور ہوا کی رفتار سے اُسے اڑاتی ہوئی اپنے گھر کی سمت روانہ ہو گئی *

خالد حیران پریشان اپنے خیمے میں واپس آگیا ، وہ نہ جانتا تھا کہ کیا کرے اور نہ جانتا تھا کہ اس بے تاب محبت کا جو یکایک اُس کے سینے میں لہریں لینے لگی ہے کیا انجام ہوگا۔ وہ اپنے اس جنگجو یانہ ذوق اور اپنی اُن سپاہیانہ عادات سے سخت بیزار ہوگیا۔ جنہوں نے اسے اس رنج اور اندوہ کے کرب و اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا ، عورتوں سے اُس کی نفرت یکا یک محبت سے بدل گئی۔ اُس نے اپنی ماں کو بُلا کر سب ماجرا کہہ سُنایا۔ ماں نے کہا "میرے بیٹے یہ تمام حالات ایسے ہیں کہ جیدہ تمہیں اس سے بھی زیادہ عزیز ہونی چاہیئے ، مگر تھوڑی دیر صبر سے انتظار کرو ، تاکہ میں جا کر اُس کی ماں سے اُس کا رشتہ تمہارے لئے مانگوں"۔ یہ کہہ کر وہ ایک اونٹ پر سوار ہوگئی اور صحرا میں ان نقوشِ قدم پر چل جو جیدہ کے گھوڑے کے سموں سے ریت پر بن گئے تھے ، جیدہ نے گھر پہنچکر تمام واقعہ من وعن اپنی ماں کو سُنا دیا۔ خالد کی ماں نے آتے ہی اپنے آپ کو ظہیر کی بیوی کی جھولی میں ڈال دیا اور اپنے بیٹے کے لئے جیدہ کا رشتہ مانگا۔ کیوں کہ ظہیر ابھی اپنی مہم سے واپس نہ لوٹا تھا ، جب جیدہ نے اپنی ماں سے خالد کی درخواست کو سنا تو اُس نے کہا "یہ کبھی نہ ہوگا خواہ مجھے اِس کے لئے موت کا جام ہی کیوں نہ پینا پڑے۔ جو کچھ اُس کے خیموں کے پاس واقع ہوا اُس کا مقصد محض غم و اندوہ کی اس آگ کی پیاس کو بجھانا تھا جو میرے سینے میں شعلہ زن تھی اور میری روح کو جھلسے ڈالتی تھی"۔

یہ الفاظ سُن کر خالد کی ماں مایوس واپس اپنے بیٹے کے پاس چلی گئی جسے جیدہ کی جدائی میں کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ ماں کو دیکھ کر وہ دفعتہً اُٹھ کھڑا ہوا اور مضطربانہ اپنی نسبت جیدہ کے خیالات دریافت کرنے لگا۔ جب اس نے جیدہ کا جواب سُنا تو اُس کا اضطراب حد سے گزر گیا اور جیدہ کا انکار اُس کے سمندِ شوق پر ایک اور تازیانہ ہوگیا۔ اُس نے کہا "اے میری ماں میں کیا کروں مجھے اِس دام سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا"۔ اُس نے جواب دیا "مگر یہ کہ تم اپنے

تمام شہسواروں کو اکٹھا کرو اور ان دوسرے قبائل کے بہادروں کو بھی جو تمہارے حلیف ہیں، اور اُس وقت تک انتظار کرو جب تمہارا چچا اپنی مہم سے واپس آجائے اور پھر اپنے آدمیوں کو لے کر اُس کے پاس جاؤ اور ان سپاہیوں کے درمیان کھڑے ہو کر اُس سے اُس کی بیٹی کا رشتہ طلب کرو۔ اگر وہ کہے کہ میری کوئی بیٹی نہیں ہے تو اُسے تمام قصہ سنا دو اور اپنا دامن پھیلائے رکھو یہاں تک کہ وہ تمہارے مطالبے کو قبول کرلے۔" اس تجویز نے خالد کے غم کو کسی قدر کم کردیا جونہی اسے معلوم ہوا کہ اُس کا چچا گھر واپس آگیا ہے اُس نے اپنے رؤسا، خاندان کو اکٹھا کیا اور اپنی کہانی اُنہیں کہہ سنائی۔ وہ سخت حیران ہوئے اور معدی کرب جو خالد کا بہادر ترین رفیق تھا یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ "یہ عجیب بات ہے کیوں کہ ہم تو ہمیشہ سے یہی سنتے آئے تھے کہ تمہارے چچا کے ہاں ایک بیٹا ہے جس کا نام جندرہ ہے مگر حقیقت آج کھلی۔ اور یقیناً تم ہی ایک شخص ہو جو اپنے چچا کی لڑکی پر سب سے بڑھ کر حق رکھتے ہو۔ اس لئے ہمارے لئے بہترین طریق عمل یہ ہے کہ ہم سب اس کے سامنے جاکر اپنے سر جھکا دیں اور اُس سے اپنے خاندان میں واپس آنے کی التجا کریں اور کہیں کہ وہ اپنی بیٹی کسی اجنبی کو نہ دے۔" خالد کچھ اور سنے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا، اور اپنے ساتھ ان ایک سو بہادروں کو جو بچپن سے محارب اور ظہیر کے ساتھ پلے اور بڑھے تھے اور پہلے سے زیادہ قیمتی تحائف لے کر روانہ ہوا اور اُس وقت تک دم نہ لیا جب تک وہ قبیلۂ سعد میں پہنچ نہ گیا۔ سب سے پہلے خالد نے اپنے چچا کو جنگ سے اُس کی کامیاب واپسی پر مبارکباد پیش کی۔ خالد کی اس دوبارہ آمد پر سب سے زیادہ حیرت ظہیر کو تھی، خصوصاً جب اُس نے اپنے بھتیجے کو تمام امراء واعیان کے ساتھ دیکھا اُسے سان گمان بھی نہ تھا کہ خالد کے دوبارہ آنے میں اُس کی بیٹی جیدہ کا بھی کچھ تعلق ہے اُس نے خیال کیا کہ وہ اُسے صرف وطن واپس چلنے پر آمادہ کرنا چاہتا ہے ظہیر نے اُن کی بڑی عزت و توقیر کی اُن کے لئے خیمے مہیا کئے اور نہایت تواضع سے پیش آیا اُس نے اونٹ اور بھیڑیں ذبح

کرنے کا حکم دیا۔ اور ان کی ایک عظیم الشان دعوت کی اور تین دن کے لئے ہر قسم کی ضروریات کا انتظام اُن کے لئے کر دیا۔ چوتھے دن خالد نے کھڑے ہو کر اپنے چچا کا شکریہ ادا کیا۔ اور اُس کے بعد جیدہ کے رشتے کے لئے درخواست کی۔ اور اپنے ملک کو واپس چلنے کی التجا کی۔ ظہیر نے کہا کہ جندر کے علاوہ میری کوئی اولاد نہیں۔ لیکن خالد نے جو کچھ اُسے معلوم ہو چکا تھا کہہ دیا۔ اور جو کچھ اُس کے ساتھ گزر چکا تھا بتا دیا۔ یہ باتیں سُن کر ظہیر شرمندہ ہو گیا اور اُس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ کچھ دیر وہ خیالات میں غرق رہا۔ اور یہ سوچ کر کہ کہیں حالات بد سے بدتر نہ ہو جائیں۔ اُس نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا میرے بھائیو! میں اس راز کو زیادہ چھپانا نہیں چاہتا۔ اس لئے میری بیٹی کی شادی اب خالد ہی سے ہوگی۔ کیوں کہ ہر اُس شخص سے جسے میں جانتا ہوں میں خالد ہی کو اس کے لائق پاتا ہوں۔ اُس نے اپنا ہاتھ خالد کو پیش کیا۔ جس نے فوراً اُسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ خالد کے اکابر و اعیان اس معاہدے کے گواہ تھے۔ پانچ سو گھوڑے سیاہ چشم اونٹ اور یمن کی منتخب ترین پیداوار سے لدے ہوئے ایک ہزار اونٹ جہیز قرار پائے۔ لیکن قبیلۂ سعد پر جن کے پاس ظہیر کا قیام تھا اس معاملے کا کوئی بار نہ تھا۔

جب اس بات کے متعلق ظہیر نے اپنی بیٹی کی منظوری کے لئے سوال کیا تو جیدہ کی طبیعت اپنے باپ کے اس طریق عمل پر درہم برہم ہو گئی۔ مگر جب اُس نے لڑکی کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اب وہ اُسے بن بیاہا نہیں رکھنا چاہتا تو اُس نے کہا " ابا! اگر خالد مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو میں اُس وقت تک اس کے خیمے میں داخل نہ ہونگی جب تک وہ میرے بیاہ پر اُن اونٹوں میں سے ایک ہزار اونٹ حلال نہ کرے جو اس وقت تلوار کے دھنی "قاسم بن مالک کی ملکیت میں ہیں "خالد نے اس شرط کو منظور کر لیا۔ لیکن اُس کے افسروں اور سپاہیوں نے اُس وقت تک ظہیر کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک اُس نے تمام مال و اسباب اپنے وطن کو منتقل ہونے کی خاطر جمع نہ

کرلیا، جیسے ہی ہتھیاریاں ختم ہوئیں خالد ایک ہزار سواروں کو ہمراہ لے کر مہم پر روانہ ہوگیا اور اُن کی مدد سے اُس نے قبیلہ عامر کو مغلوب کرلیا۔ تلوار کے دھنی اُکو اُس نے تین دفعہ زخمی کیا، بہت سے بہادروں کو موت کے گھاٹ اتارا، اُن کو لوٹا اور اُس سے بہت زیادہ مالِ غنیمت اُن کے ملک سے لے گیا جتنا جیدہ نے طلب کیا تھا۔ مال و دولت سے لدا ہوا اور فتح کے نشہ سے سرشار وہ واپس آیا مگر جب اُس نے شادی کا دن مقرر کرنے کو کہا تو جیدہ نے اُسے اپنے پاس بلا کر یہ الفاظ کہے، "اگر تم مجھے اپنی بیوی بنانا چاہتے ہو تو سب سے پہلے میری فرمائشوں کو پورا کرو اور جو عہد میں تم سے کرتی ہوں اُس پر قائم رہو۔ میں چاہتی ہوں کہ میری شادی کے دن کسی ذی رتبہ آدمی کی بیٹی، جو اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئی ہو میرے اونٹ کی مہار تھامے۔ وہ ملک کے کسی معزز ترین رئیس کی بیٹی ہو تاکہ اُس دن میں عرب کی معزز ترین بیٹی سمجھی جاؤں۔" خالد نے مان لیا اور اُس کی خواہشات کے حصول کے لئے تیار ہوگیا۔ اُسی روز وہ اپنے سواروں کو لے کر چل کھڑا ہوا اور سرزمین یمن کو تلاش کرتا ہوا بہت سے میدانوں اور وادیوں کو طے کر گیا یہاں تک کہ وہ ملکِ حجاز میں پہنچا۔ اس جگہ اُس نے معاویہ بن مصفل کے قبیلہ پر حملہ کیا۔ وہ طوفان کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑا، اور مدافعین کی صفوں کو چیرتے ہوئے عین اُس وقت اُس نے عمیمہ بنت معاویہ کو گرفتار کیا جب وہ راہِ فرار اختیار کرنے کو تیار تھی۔

اُس نے اپنی تیغ کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کے بہادر سپاہیوں کی سب مدافعت بیکار ہوگئی، اور وہ بھاگ کر منتشر ہوگئے۔ اس علاقے کے عربوں کی تمام دولت اُس نے چھین لی اور پھر گھر کی طرف رخ کیا۔ مگر وہ اُس وقت تک اپنے خیموں میں داخل نہ ہوا جب تک اُس نے وہ سارا مال و دولت اکٹھا نہ کرلیا جسے وہ صحرا کے مختلف مقامات پر چھوڑ آیا تھا۔

جوان لڑکیاں جھانجھیں اور کئی قسم کے دوسرے ساز بجاتی ہوئی اُس کے آگے آگے چلتی تھیں

سارا قبیلہ خوشیاں منا رہا تھا اور جب خالد ظاہر ہوا تو اُس نے بیواؤں اور یتیموں کو کپڑے تقسیم کئے اور رفیقوں اور دوستوں کو اس دعوت پر مدعو کیا جسے وہ اپنی شادی کی تقریب میں تیار کر رہا تھا شادی پر اُس علاقے کے تمام عرب بہت بڑی تعداد میں جمع ہوئے۔ شراب و کباب کی فراوانی سے اُس نے انہیں سرمست کر دیا۔ لیکن جس وقت سب مہمان کھانے پینے میں مصروف تھے، خالد اپنے ساتھ دس غلاموں کو لے کر شیرول شیرنیوں اور اُن کے بچوں کے شکار کے لئے جنگل کی طرف جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس تقریب کے مہمانوں کے لئے ایک انوکھی ضیافت کا سامان مہیا کرے۔

لیکن جیّدہ کو کسی طرح پہلے ہی سے اُس کے ارادہ کا علم ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو زرہ بکتر میں چھپا لیا اور گھوڑے پر چڑھ کر تیز تیز خالد کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ ابھی جشن کے تین دن باقی تھے کہ ایک غار میں ان دونوں کا سامنا ہوا وہ ایک وحشی درندے کی طرح اُس پر ٹوٹ پڑی اور ایک شدید حملے کے ساتھ چلّا کر بولی۔ "اے عرب! اپنے گھوڑے سے اُتر جا اور اپنی زرہ بکتر اتار ڈال اگر تو نے ذرا بھی لیت و لعل کی تو میرا یہ نیزہ ابھی تیرے سینے سے پار ہو گا" خالد نے اُس کے مطالبے کے جواب میں فوراً مدافعت کا ارادہ کر لیا۔ ذرا سی دیر میں ایک شدید جنگ کی صورت پیدا ہو گئی۔ یہ کشمکش ایک گھنٹے سے زیادہ تک جاری رہی۔ پھر خالد کو اپنے حریف کی آنکھوں میں ایک ایسی بات نظر آئی کہ وہ ڈر گیا۔ وہ پھر اپنے گھوڑے پر چڑھ گیا اور لڑائی کی جگہ سے ہٹ کر اُس نے کہا "میں تجھ سے دینِ عرب کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، مجھے بتا کہ تُو اس صحرا کا کون سا بطل جلیل ہے کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ تیرا حملہ اور تیرے وار مجھ سے روکے نہیں جاتے۔ تو نے میرے ارادوں کو اور میری دلی خواہشوں کو خاک میں ملا دیا ہے" یہ الفاظ سُن کر جیّدہ نے اپنا خود اوپر اٹھایا تا کہ وہ اُس کا چہرہ دیکھ لے۔ اُس نے کہا "خالد کیا اس لڑکی کے لئے جس سے تجھے محبت ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ وحشی درندوں کا شکار کرے تا کہ عرب کی بیٹیاں سیکھیں کہ اُس کے واحد اجارہ دار جنگلوں میں

لڑنے والے مرد ہی نہیں ہیں؟" اس چبھتی ہوئی ملامت پر خالد شرم میں غرق ہو گیا اُس نے جواب دیا "خدا کی قسم، جبّیدہ تیرے سوا اور کوئی مجھے مغلوب نہیں کر سکتا۔ لیکن کیا اس ملک میں کوئی ایسا شخص بھی ہے۔ جس نے تجھے دعوتِ مقابلہ دی ہو۔ یا بس مجھ ہی پر تجھے اپنے زور و قوت کو ثابت کرنا تھا؟" جبیدہ نے کہا "خدا کی قسم، میں اس صحرا میں اس لئے آئی ہوں کہ وحشی درندوں کے شکار میں تیری مدد کروں، تاکہ تیرے سپاہی تجھے بیوی کے انتخاب پر طعنہ زنی نہ کر سکیں۔ یہ الفاظ سُن کر خالد جبیدہ کی جرات اور عزم پر حیرت اور تعجب سے مبہوت رہ گیا۔

پھر دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سے اُتر پڑے اور ایک غار میں داخل ہو گئے۔ خالد نے دو خونخوار جانوروں کو اسیر کیا اور جبیدہ نے ایک شیر اور دو شیرنیوں کو مارا۔ یہ مہم انجام دے کر انہوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی، اور جبیدہ خالد کی ہمراہی پر خوش تھی۔ اُس نے کہا "اور میں تمہیں اس وقت تک اپنے خیموں سے جانے کی اجازت نہیں دوں گی جب تک کہ ہماری شادی نہ ہو جائے" پھر یکایک وہ اسے چھوڑ کر تیزی سے اپنی جائے سکونت کی طرف چل دی۔

خالد اپنے غلاموں کی طرف بڑھا جنہیں وہ کچھ فاصلے پر چھوڑ آیا تھا، اور اس نے انہیں درندوں کو اٹھا کر خیموں کی طرف لے جانے کا حکم دیا۔ خوف سے کانپتے ہوئے کہ خالد نے کیا کیا ہے انہوں نے آپس میں کہنا شروع کیا کہ خالد تمام بہادروں سے بڑا بہادر ہے۔

دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا اور جو لوگ آتے تھے اُن کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ دوشیزہ کنیزیں جھانجھیں بجاتی تھیں، غلام اپنی تلواریں ہوا میں ہلاتے تھے۔ اور نوجوان لڑکیاں صبح سے شام تک گاتی رہتی تھیں۔ اس نشاط و سرود کے درمیان خالد اور جبیدہ کی شادی ہوئی عمیمہ بنتِ معاویہ دلہن کے اُونٹ کی مہار تھامے ہوئے تھی۔ اور عورتیں اور مرد جبیدہ کے نام کو بلند کر رہے تھے۔

الاصمعی

ایران

ملّاح اور موتیوں کا سوداگر

بیان کیا جاتا ہے کہ شہر بصرہ میں ایک شخص ابو الفوارس تھا۔ یہ شہر کے تمام ملّاحوں کا سردار تھا کیوں کہ سمندر میں کوئی ایسی بندرگاہ نہ تھی جہاں یہ نہ گیا ہو۔ ایک روز جب وہ اپنے ملّاحوں میں ساحل پر بیٹھا ہوا تھا ایک بوڑھا شخص کشتی کھیتا ہوا آیا اور اُس جگہ اُتر پڑا جہاں ابوالفوارس بیٹھا تھا۔ وہ بولا "دوست! مجھے چھ ماہ کے لئے تمہارے جہاز کی ضرورت ہے جو کچھ تم کہو میں ادا کرنے کو تیار ہوں" ملّاح نے کہا "میں سونے کے ایک ہزار دینار لوں گا"۔ بوڑھے نے اُسی وقت ادا کر دیئے اور جانے سے پہلے کہا کہ وہ کل پھر آئے گا اور کہ اب یہ معاملہ فسخ نہ ہوگا۔

ملّاح روپیہ گھر لے گیا، جہاز کو تیار کیا اور پھر اپنے بیوی بچّوں سے رخصت ہو کر ساحل پر آیا جہاں بوڑھا اپنے غلاموں کو لئے اُس کا منتظر تھا۔ بیس گدھوں کے بوجھ جتنی خالی بوریاں اُس کے ساتھ تھیں۔ ابوالفوارس نے اسے سلام کیا انہوں نے مل کر اسباب جہاز میں چڑھا لیا اور لنگر اُٹھا دیا ایک خاص ستارے کے رُخ تین ماہ تک سفر کرنے کے بعد ان کے ایک طرف ایک جزیرہ نمودار ہوا۔ بوڑھے نے جہاز اس طرف پھیر دیا اور وہ جلد ہی لنگر انداز ہو گئے۔ اپنے غلام سے بورے اُٹھوا کر بوڑھا اپنے ہمراہیوں سمیت ایک پہاڑی کی طرف چل پڑا جو دُور نظر آ رہی تھی۔ چند گھنٹے چلنے کے بعد وہ پہاڑ کی بلندی پر چڑھ گئے، جس پر اُنھیں ایک کھلا میدان نظر آیا جہاں دو سو سے زیادہ گڑھے کھدے ہوئے تھے۔ پھر بوڑھے آدمی نے بتایا کہ وہ ایک سوداگر ہے،

اور اُس نے اس جگہ جواہرات کی کان دریافت کی ہے۔ وہ کہنے لگا۔ "اب جب کہ میں نے تمہیں اپنا رازدار بنالیا ہے مجھے تم سے بھی وفاداری کی امید ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم اس گڑھے میں اُتر جاؤ اور اتنے موتی اُوپر بھیجو کہ یہ بورے بھر جائیں۔ میں نصف تمہیں کو دے دوں گا اور ہم آئندہ زندگی عیش وعشرت میں گذار سکیں گے"۔ ملاح نے پوچھا کہ موتی ان گڑھوں میں کس طرح آگئے۔ بوڑھے نے جواب دیا کہ ایک زمین دوز راستہ ان گڑھوں کو سمندر سے ملا رہا ہے، اسی راستہ سے سیپ تیرتے ہوئے آکر ان گڑھوں میں ٹھہر گئے ہیں اور اتفاق سے اُسے نظر آگئے، اُس نے بتایا کہ وہ ملاح کو صرف اسی لئے لایا ہے کہ اُسے امداد کی ضرورت تھی۔ لیکن اس کی خواہش ہے کہ یہ معاملہ کسی اور پر ظاہر نہ ہونے پائے۔

ملاح نہایت بے تابی سے گڑھے میں اترا۔ جہاں بے شمار سیپ اُسے نظر آئے۔ بوڑھے نے ایک ٹوکرا لٹکا دیا جسے ملاح بار بار بھرتا رہا۔ یہاں تک کہ سوداگر نے چلاّ کر کہا "یہ سیپ ناکارہ ہیں۔ ان میں موتی نہیں ہیں۔ ابوالفوارس اُس گڑھے سے نکل آیا اور دوسرے میں اُتر گیا۔ جہاں اُسے بے شمار موتی نظر آئے۔ شام ہونے تک وہ تکان سے چور ہوگیا اور گڑھے سے نکلنے کے لئے بوڑھے کو امداد کے لئے پکارا۔ جواب میں بوڑھے نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں گڑھے ہی میں چھوڑ دوں کیوں کہ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم مجھے جواہرات کے لالچ میں مار نہ ڈالو۔ ملاّح نے بڑے جوش سے احتجاج کیا، کہ اُس کا ارادہ یہ نہیں ہے، لیکن بوڑھے نے اُس کی منت وسماجت کی طرف سے کان بند کرلئے، اور جہاز میں واپس آکر لنگر اُٹھا دیا۔

تین روز تک ابوالفوارس بھوکا اور پیاسا رہا۔ نکلنے کا راستہ ڈھونڈنے کی جد وجہد کرتے ہوئے اسے انسانی ہڈیاں نظر آئیں۔ وہ سمجھ گیا کہ کم بخت بوڑھا کئی دوسرے آدمیوں کو بھی اسی طرح دھوکا دے چکا ہے۔ مایوسی کے ساتھ وہ اپنے گرد کھودتا رہا، اور آخر کار اُسے

ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آیا، جسے اُس نے ہاتھوں سے فراخ کر لیا - جلد ہی وہ اِس قدر فراخ ہو گیا کہ وہ رینگ کر اُس میں سے نکل گیا، اور اُس نے اپنے آپ کو تاریکی میں کیچڑ پر کھڑا پایا - اُس کیچڑ پر وہ نہایت احتیاط سے چلتا گیا، اور پھر یکلخت وہ گلے تک پانی میں ڈوب گیا، جو مزے میں نمکین تھا - وہ سمجھ گیا کہ وہ اس راستہ میں ہے جو سمندر کو جاتا ہے وہ کچھ راستہ اسی طرح تیرتا رہا یہاں تک کہ اُس کے سامنے مدہم سی روشنی نمودار ہوئی - اُسے دیکھ کر اُس کا دِل بڑھ گیا اور وہ ہمت سے تیر کر راستے کے سرے پر پہنچ گیا - نکلنے پر اُس نے اپنے آپ کو سمندر کے سامنے پایا - اُس نے اپنے آپ کو اس مخلصی کے شکریہ کے لئے سجدے میں گرا دیا، پھر وہ اُٹھا اور کچھ فاصلے پر اُسے اپنا چنہ ل گیا جسے وہ پہاڑی کی طرف روانہ ہوتے وقت چھوڑ گیا تھا - لیکن بوڑھے کا نشان تک نہ تھا اور جہاز غائب ہو چکا تھا +

مصیبت اور مایوسی کی حالت میں وہ ساحل پر بیٹھ گیا، وہ حیران تھا کہ اب کیا کرے، سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے اسے ایک جہاز نظر آیا جو آدمیوں سے بھرا ہؤا تھا، اُسے دیکھ کر ملاح اپنی جگہ سے جھپٹ کر اٹھا، سر سے اپنی پگڑی اُتار کر اپنی پُوری قوت سے ہوا میں ہلائی، اور زور زور سے چلایا، لیکن جب وہ قریب آئے تو اُس نے یہی فیصلہ کیا کہ اپنے نجات دہندوں کو اس جگہ اپنی موجودگی کی حقیقی وجہ نہ بتلائے - اِس لئے جب اُنہوں نے پوچھا کہ وہ کس طرح اس جزیرے پر پہنچا تو اُس نے کہا کہ میرا جہاز سمندر میں ڈوب گیا اور میں ایک تختے سے چمٹا ہؤا ساحل پر پہنچ گیا +

اُس کی خوش قسمتی پر انہوں نے اُسے مبارک باد دی اور اُس کے جواب میں کہ وہ کہاں سے آئے ہیں - بتایا کہ وہ اب سیناسے آئے ہیں اور اب ہندوستان کی طرف جا رہے ہیں - یہ سُن کر ابوالفوارس متامل ہؤا، اور کہا اسے ہندوستان میں کوئی کام نہیں ہے، لیکن اُنہوں سے لُسے یقین دلایا کہ وہ راستے میں بصرہ جاتے ہوئے جن جہازوں سے ملیں گے اسے ان میں سے کسی ایک میں بٹھا

دیں گے - وہ رضامند ہو گیا، اور چالیس روز تک وہ کہیں آبادی کو دیکھے بغیر سفر کرتے رہے، آخر اس نے پوچھا کہ وہ راستہ تو نہیں بھول گئے؟ انہوں نے اقرار کیا کہ پانچ دن سے وہ بے خبری میں سفر کر رہے ہیں، اُنہیں معلوم نہیں کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں یا انہیں کس طرف جانا چاہیئے - سب دعائیں مانگنے لگ گئے، اور کچھ دیر تک دُعائیں مانگتے رہے۔

سفر کرتے ہوئے تھوڑی سی دیر بعد مینارے کی طرح ایک شکل سمندر سے نمودار ہوئی، اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے چینی شیشہ چمک رہا ہو - اُنہیں یہ بھی محسوس ہوا کہ اُن کا جہاز بغیر اُن کے کھینچے کے اور بغیر تیز ہوا کے پانی پر تیزی سے چل رہا ہے - ملاح حیرت زدہ ہو کر دوڑتے ہوئے ابوالفوارس کے پاس پہنچے اور اُس سے پوچھا کہ جہاز کو کیا ہو گیا ہے، کہ اس قدر تیزی سے چل رہا ہے، اُس نے آنکھیں اُٹھائیں اور دُور ایک پہاڑی کو دیکھ کر اُس کی چیخ نکل گئی - اُس نے گھبرا کر اپنے ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے اور چلاّ کر کہا "ہم سب تباہ ہو جائیں گے - میرا باپ اکثر مجھے متنبہ کیا کرتا تھا کہ اگر میں کبھی سمندر پر راستہ بھول جاؤں تو مُجھے مشرق کی طرف چلنا چاہیئے، کیوں کہ اگر میں مغرب کی طرف گیا تو یقیناً "دہان شیر" میں جا گروں گا، اور جب میں اُس سے پوچھتا کہ "دہان شیر" کیا ہے! تو وہ مجھے بتاتا کہ خدا تعالےٰ نے سمندر کے درمیان پہاڑی کے نیچے ایک سوراخ بنایا ہے، وُہی "دہان شیر" ہے، ایک سو فرسنگ سے بھی زیادہ فاصلے سے وہ جہاز پر اثر انداز ہو جاتا ہے اور کوئی جہاز جو ایک مرتبہ اس پہاڑی کے نزدیک آ جائے پھر بچ نہیں سکتا - مجھے یقین ہے کہ یہ وہی جگہ ہے اور ہم پھنس گئے ہیں"

سخت خوف و ہراس سے ملاحوں نے دیکھا کہ اُن کا جہاز بگولے کی طرح پہاڑی کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے - جلد ہی وہ بھنور میں آ گئے جہاں دس ہزار جہازوں کے تباہ شدہ اجزا لہروں کے ساتھ چکر کھا رہے تھے، جہاز کے ملاح اور سوداگر ابوالفوارس کے گرد جمع ہو گئے اور اُس سے ملتجی ہوئے کہ

اَب اُنہیں کیا کرنا چاہیئے اُس نے کہا کہ جہاز پر جس قدر رسّے ہیں اُنہیں تیار کر لو تب وہ تیر کر بھنور میں سے نکلے گا، اور پہاڑی پر پہنچ کر کسی مضبوط درخت سے باندھ دے گا*

پھر وہ اپنے رسّے اُسکی طرف پھینکیں، اور اس طرح وہ اُنہیں تباہی سے بچالے گا۔ خوش قسمتی سے پانی کے بہاؤ نے اُسے خشکی کی طرف پھینک دیا۔ اور اُس نے جہاز کا رسّا ایک مضبوط درخت سے باندھ دیا*

پھر جس قدر جلد ہو سکا ابوالفوارس خوراک کی تلاش میں پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ کیوں کہ کئی دنوں سے نہ اُس نے اور نہ اُس کے ساتھیوں نے کچھ کھایا تھا، جب وہ چوٹی پر پہنچا، تو ایک خوبصورت میدان اسے اپنے سامنے نظر آیا اور اُس کے درمیان ایک بلند گنبد سبز پتھر سے بنا ہوا دکھائی دیا، جب وہ اُس کے قریب گیا اور اندر داخل ہوا تو اُسے لوہے کا بنا ہوا ایک بلند مینار نظر پڑا جس سے زنجیر کے ذریعہ سے ایک نقارہ دمشقی کانسی کا بنا ہوا اور شیر کی کھال سے منڈھا ہوا لٹک رہا تھا۔ گنبد سے کانسی کی ایک بڑی تختی بھی لٹک رہی تھی، جس پر مندرجہ ذیل عبارت کھدی ہوئی تھی "اے وہ جو یہاں تک پہنچا ہے، جان کہ جب سکندر دنیا کے گرد سفر کرتا ہوا "دہانِ شیر" پر پہنچا تو اُسے اس تباہ کن جگہ کا پہلے سے علم تھا اسکے ساتھ چار ہزار حکما تھے جنہیں اُس نے بلایا اور حکم دیا کہ وہ اِس تباہ کن جگہ سے بچاؤ کا کوئی طریقہ ایجاد کریں، مدتوں تک حکما اِس مسئلہ پر غور کرتے رہے، یہاں تک کہ آخر کار افلاطون نے یہ نقارہ تیار کیا، جس میں یہ صفت ہے کہ اگر کوئی اس بھنور میں گھر جائے اور نکل کر تین مرتبہ اِس نقارے کو بجائے تو اُس کا جہاز سطح پر آجائے گا*

جب ملاح نے یہ عبارت پڑھ لی تو جلدی سے وہ ساحل پر اپنے ساتھیوں کے پاس گیا، اور انہیں تمام حال بتایا، بہت مباحثے کے بعد وہ جزیرے پر پیچھے رہ کر اور اپنی جان پر کھیل کر نقارے کو بجانے پر رضامند ہوا۔ لیکن اس شرط پر کہ جب وہ بچ کر بصرے پہنچیں تو اپنے جہاز کی نصف دولت اُس کے بیوی بچوں کو دے دیں، اُس نے اُن سے حلف اُٹھوائے اور پھر گنبد کے پاس واپس آگیا۔ ایک ڈنڈا لے کر تین مرتبہ اُس نے نقارے پر مارا، اور جب اُس کی مہیب

آواز پہاڑیوں میں گونجی تو جہاز بھنور میں سے اِس طرح نکلا جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔ جہاز والوں نے ابو الفوارس کو چیخ چیخ کر الوداع کہی اور بصرے کی طرف چل پڑے، جہاں پہنچ کر اُنہوں نے نصف دولت ملّاح کے گھرانے کو دے دی *

ابو الفوارس کے گھر والوں کو اُس کے نقصان پر سخت غم و افسوس ہُوا، لیکن وہ گنبد میں خوب گہری نیند سو کر اور اپنی جان بچنے پر اپنے مالک کا شکریہ ادا کرنے کے بعد پھر پہاڑی کی چوٹی پر آ گیا، جب وہ میدان پر سے گذر رہا تھا تو اُس نے اُس میں سے سیاہ دُھواں نکلتا ہُوا دیکھا۔ میدان میں دریا بھی تھے جن میں سے تو وہ عبور کر گیا، وہ بھوک اور تکان سے قریب المرگ ہو چکا تھا، کہ یکایک اُس کی نظر ایک سبزہ زار پر پڑی جہاں بھیڑوں کے ریوڑ چر رہے تھے اِس خیال سے اُسے بہت مسرت ہوئی کہ آخر کار وہ انسانی آبادی میں پہنچ رہا ہے۔ جب وہ بھیڑوں کے نزدیک پہنچا تو اُس نے اُن کے ساتھ ایک نوجوان کو دیکھا جو قد میں پہاڑی کی طرح بلند تھا اور جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے سُرخ کپڑے کا لبادہ پہنے ہوئے تھا، اگرچہ اس کا سر اور جسم زرہ میں ملبوس تھا۔ ملّاح نے اُسے سلام کیا، جس کے جواب کے ساتھ نوجوان نے پوچھا "تم کہاں سے آئے ہو؟" ابو الفوارس نے جواب دیا کہ وہ ایک ایسا آدمی ہے جس پر سخت تباہی آئی ہے، اور پھر اپنی تمام سرگزشت کہہ سنائی۔ وہ سُن کر ہنسا اور بولا "اپنے آپ کو اس اتھاہ بھنور سے بچ نکلنے پر خوش قسمت سمجھو، اور اب کوئی خوف نہ کرو میں تمہیں گاؤں میں لے جاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے روٹی اور دودھ اُس کے سامنے رکھ دیا اور کھانے کے لئے کہا۔ جب وہ کھا چکا تھا تو نوجوان نے کہا "تم دن بھر یہاں نہیں رہ سکو گے، میں تمہیں گھر لے جاؤں گا اور تم کچھ دیر آرام کر لینا۔" *

وہ دونوں پہاڑ سے نیچے اُترے جہاں ایک دروازہ تھا اُس کے آگے ایک بہت بھاری

پتھر تھا جسے ایک سو آدمی بھی مشکل سے اُٹھا سکتے، لیکن گڈریلے نے ایک سوراخ میں ہاتھ ڈال کر پتھر اٹھا لیا اور ابو الفوارس کو اندر داخل کر دیا۔ پھر اُس نے پتھر کو اپنی جگہ پر رکھدیا اور آگے چل پڑا۔
دروازے سے گذر کر ملاح کو ایک خوب صورت باغ نظر آیا۔ جہاں درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ اُن کے درمیان ایک کوشک تھا۔ اور ملاح نے خیال کیا کہ ضرور یہی گڈریئے کا گھر ہوگا۔ وہ اس میں داخل ہوگیا۔ اور چھت پر چڑھ کر اِرد گرد نگاہ ڈالی۔ اگرچہ اُسے کئی گھر نظر آئے۔ لیکن اُن میں کوئی مکین دکھائی نہ دیا۔ وہ نیچے اُترا اور ایک نزدیک ترین گھر میں داخل ہوگیا۔ صحن سے گذر کر اُس نے دس آدمی دیکھے سب کے سب ننگے تھے اور اس قدر موٹے تھے کہ اُن کی آنکھیں تقریبًا بند ہوگئی تھیں۔ اپنے سروں کو گھٹنوں پر جھکائے ہوئے سب کے سب نہایت دردناک آواز سے رو رہے تھے۔ لیکن اُس کے پاؤں کی چاپ سُن کر اُنھوں نے سر اٹھائے اور بولے "تم کون ہو؟" اُس نے بتایا کہ گڈریا اُسے بطور مہمان یہاں لے آیا ہے۔ یہ سُن کر اُن کی چیخ نِکل گئی اور بولے "اِس دیو کے پنجے میں ہماری طرح ایک اور بدقسمت آن پھنسا، یہ ایک دیو ہے جو گڈریئے کے بھیس میں پھرتا ہے اور انسانوں کو پکڑ کر کھا جاتا ہے۔ ہم تمام سوداگر ہیں جنہیں ناموافق ہوائیں اس طرف لے آئیں، اس دیو نے ہمیں پکڑ لیا اور اب ہماری یہ حالت ہے"۔
ملاح نے ایک دردناک آہ بھری، اور سوچا کہ آخرکار میری موت آن پہنچی اُسی وقت اُس نے گڈریئے کو آتے دیکھا، اُس نے بھیڑوں کو باغ میں داخل کر دیا اور کوشک میں داخل ہونے سے پہلے اُسی پتھر سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ بادام، کھجور، پستے اور اخروٹوں سے بھرا ہوا ایک تھیلا اٹھائے ہوئے تھا۔ نزدیک آکر اُس نے تھیلا ملاّح کو دے دیا اور کہا کہ دوسروں کو بھی بانٹ دے۔ ابو الفوارس خاموش بیٹھ گیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھانے میں مصروف ہو گیا۔ جب اُنھوں نے کھانا ختم کر لیا گڈریا اُن کے پاس آیا اور ایک کو ہاتھ سے پکڑ کر اُن کے سامنے

مار ڈالا اور بھون کر کھا گیا - جب وہ سیر ہو گیا تو شراب کا ایک مشکیزہ اُٹھا لایا اور اس قدر پی کہ مدہوش ہو کر سو گیا +

ملاح اپنے ساتھیوں کی طرف مخاطب ہو کر بولا "جب مجھے مرنا ہی ہے تو پہلے اِسے کیوں نہ مار ڈالوں - اگر تم لوگ میری مدد کرو تو میں ایسا کر سکتا ہوں" اُنہوں نے جواب دیا کہ اب ہم میں کوئی طاقت باقی نہیں ہے - ابو الفوارس کی نظر اُن دو سلاخوں پر پڑی جن پر دیو نے گوشت بھونا تھا - اُس نے دونوں کو آگ سے سرخ کر دیا، اور پھر ان کو دیو کی آنکھوں میں چبھو دیا +

دیو ایک چیخ کے ساتھ اچھل کر اٹھا، اور ابو الفوارس کو پکڑنے کی کوشش کی، لیکن وہ چھلانگ لگا کر بچ گیا - دیو دوڑ کر پتھر کے پاس پہنچا، اور اُسے ہٹا کر ایک ایک کر کے بھیڑوں کو نکالنا شروع کیا، اِس امید پر کہ جب باغ خالی ہو جائے گا تو وہ آسانی سے ملاح کو پکڑ لے گا - ابو الفوارس فوراً ہی اس کا ارادہ سمجھ گیا، اور اُس نے ایک بھیڑ کو ذبح کر کے اس کی کھال پہن لی - بھیڑوں میں مل ملا کر وہ دروازے تک تو جا پہنچا - لیکن گڈریا اسے چھوتے ہی پہچان گیا کہ یہ بھیڑ نہیں ہے، اور اُسے پکڑنے کے لئے جھپٹا - ابو الفوارس نے کھال اوتار پھینکی اور بگولے کی طرح بھاگ نکلا، جلد ہی وہ سمندر پر پہنچ کر پانی میں کود پڑا - گڈریئے نے چند قدم تک اُس کا تعاقب کیا - لیکن پھر ساحل پر آ گیا - اُسے تیرنا نہ آتا تھا +

ملّاح خوف سے تیرتا گیا - یہاں تک کہ پہاڑ کی دوسری طرف پہنچ گیا - یہاں اُسے ایک بوڑھا آدمی ملا جس نے اُسے سلام کیا اور اس کی سرگزشت سننے کے بعد اُسے کھانا کھلایا اور اپنے گھر لے گیا - لیکن ابو الفوارس کو جلد ہی معلوم ہو گیا، کہ یہ بوڑھا بھی دیو ہے، ابو الفوارس نے نہایت چالاکی سے دیو کی بیوی کو یقین دلا دیا کہ وہ گھر کے استعمال کی بہت سی چیزیں تیار کر سکتا ہے اور اُس نے دیو کو اپنے زندہ رکھنے پر آمادہ کر لیا، کئی روز تک گھر میں بند رکھنے کے بعد اُسے بھیڑوں

کی رکھوالی کے لئے باہر بھیج دیا گیا، وہ روزانہ اپنے بچاؤ کی تدابیر سوچتا رہا۔ لیکن پہاڑ کو عبور کرنے کا ایک ہی راستہ تھا اور اسے بند کر دیا گیا تھا +

ایک روز جب وہ جنگل میں گھوم رہا تھا اُس نے ایک درخت کی کھوہ میں شہد دیکھا اور گھر پہنچ کر دیو کی بیوی سے اس کا ذکر کیا، دوسرے روز عورت نے ابوالفوارس کے ساتھ اپنے خاوند کو بھیجا تاکہ وہ کچھ شہد لادے۔ لیکن راستے میں ملاح دیو پر جھپٹا اور اسے ایک درخت سے باندھ دیا، پھر وہ اُس کی انگوٹھی لے کر اس کی بیوی کے پاس آیا، اور کہنے لگا کہ مجھے اُس نے آزاد کر دیا ہے، اور اس کے ثبوت کے لئے اُس نے وہ انگوٹھی پیش کی۔ لیکن عورت چالاک تھی اُس نے پوچھا کہ "میرا خاوند یہ بتانے کے لئے خود کیوں نہیں آیا" اُس نے اُسے چغہ سے پکڑ لیا، اور کہا کہ وہ خود حقیقت معلوم کرنے کے لئے اس کے ساتھ جائے گی، لیکن ابوالفوارس اُس سے دامن چھڑا کر سمندر کی طرف بھاگا، اُس نے سمجھا کہ شاید اس طرح وہ موت کے پنجے سے بچ جائے وہ خوف کے مارے تیزی سے کئی گھنٹے تک تیرتا رہا۔ یہاں تک کہ آخر کار اُس کو آدمیوں سے بھرا ہوا ایک جہاز نظر آیا جو اس کی طرف آ گئے، اور اُسے اپنے ساتھ سوار کر لیا۔ اُنہوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ وہ کس طرح یہاں پہنچا اور اُس نے تمام سرگزشت سنا دی +

خوش قسمتی سے جہاز کے کپتان کو صرف ایک جگہ ٹھہرنا تھا، اور پھر بصرہ کی طرف جانا تھا اِس طرح ایک ماہ کے عرصہ میں ابوالفوارس خوش وخرم اپنے بیوی بچوں میں پہنچ گیا +

تکالیف و مصائب نے ملاح کے بال سفید کر دیئے تھے۔ کئی روز تک ملاح نے آرام کیا، اور پھر ایک روز جب کہ وہ ساحلِ سمندر پر پھر رہا تھا وہی بوڑھا جس نے ایک دفعہ پہلے اُس کا جہاز کرایہ پر لیا تھا پھر ظاہر ہوا اُس نے ملاح کو نہ پہچانا۔ اور پوچھا کہ کیا وہ چھ ماہ کے لئے اپنا جہاز کرایہ پر دے گا۔ ابوالفوارس ایک ہزار سونے کے دیناروں کے عوض رضامند ہو گیا جو بوڑھے

نے اُسی وقت ادا کر دیئے اور کہا کہ وہ کل سفر کے لئے تیار ہو کر کشتی پر آئے گا ؞

جب بوڑھا چلا گیا تو ملّاح روپیہ لے کر اپنی بیوی کے پاس پہنچا جس نے اُسے ہدایت کی کہ اپنے آپ کو پھر کسی مصیبت میں نہ ڈال دے، اُس نے جواب دیا کہ وہ اپنا اور ان ہزارہا مسلمانوں کا انتقام ضرور لے گا جنہیں یہ خبیث بوڑھا ہلاک کر چکا ہے ؞

دوسرے روز ملّاح نے بوڑھے اور اس کے ایک حبشی غلام کو جہاز پر سوار کر لیا تین ماہ تک وہ سفر کرتے رہے یہاں تک کہ ایک مرتبہ پھر وہ موتیوں کے جزیرے میں پہنچ گئے، وہاں انہوں نے جہاز کو ساحل پر باندھ دیا، اور بوریاں لے کر پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ گئے - وہاں پہنچکر بوڑھے نے ابو الفوارس سے پھر وہی استدعا کی کہ وہ گڑھوں میں اترے، اور موتی جمع کر کے اوپر بھیجے، ملاح نے کہا کہ وہ اس جگہ سے ناواقف ہے، اور یہ بہتر ہو گا کہ پہلے بوڑھا نیچے اترے تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے بوڑھے نے کہا کہ اس میں قطعاً کوئی خطرہ نہیں ہے، اور یہ کہ وہ ایسا بے ضرر آدمی ہے کہ اُس نے عمر بھر میں ایک چیونٹی کو بھی تکلیف نہیں پہنچائی - اور اگر اُسے معلوم ہو کہ اس میں کوئی خطرہ ہے، تو وہ ابو الفوارس کو ہرگز گڑھے میں نہ اتارے، لیکن ملّاح ضدی تھا - اُس نے کہا کہ جب تک اُسے معلوم نہ ہو کہ کام کس طرح انجام دیا جائے گا، وہ ہرگز کام کو ہاتھ میں نہ لے گا ؞

چنانچہ نہایت بے دلی سے بوڑھے نے اپنے آپ کو ایک ٹوکرے اور رسّی کے ذریعے نیچے اتارنے کی اجازت دی اُس نے سیپیوں سے ٹوکرا بھر دیا اور پھر بولا "دیکھو اس گڑھے میں کوئی خطرناک چیز نہیں ہے، اب مجھے نکال لو - کیوں کہ میں بوڑھا اور کمزور ہوں"۔ ملّاح نے کہا، "اب جب کہ تم اُترے ہوئے ہو، یہی بہتر ہے کہ تم کام کو تکمیل تک پہنچانے تک وہیں رہو، کل میں خود دوسرے گڑھے میں اتروں گا اور اتنے موتی لاؤں گا کہ جہاز بھر جائے گا"۔ بوڑھا دیر تک کام کرتا رہا اور موتی بھرتا رہا - آخر کار پھر چلایا "میرے بھائی - میں تھک کر چور ہو گیا ہوں

اب مجھے نکال لو"۔ ملاح غصے سے بولا "یہ کیا ہے کہ تو ہمیشہ اپنی ہی تکلیف کو دیکھتا ہے اور دوسروں کی تکلیف کو نہیں دیکھتا۔ حرامی پلے۔ کیا تو اندھا ہے کہ مجھے پہچانتا نہیں؟ میں ابوالفوارس ملاح ہوں، جسے مدت ہوئی کہ تو ان گڑھوں میں چھوڑ گیا تھا۔ اللہ کی مہربانی سے مجھے مخلصی مل گئی اور اب تمہاری باری ہے، اپنی آنکھیں کھولو اور یاد کرو کہ تم نے بے شمار آدمیوں سے کیا سلوک کیا"۔ بوڑھا رحم کے لئے چلاتا رہا۔ لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کیوں کہ ابوالفوارس ایک بڑا سا پتھر لایا، اور اُس نے گڑھے کا منہ بند کر دیا۔ اُس نے غلام کو بھی دھمکیوں سے مرعوب کر لیا، اور پھر دونوں مل کر موتی جہاز میں لے گئے اور لنگر اٹھا دیا۔ تین ماہ میں وہ بصرہ پہنچ گئے، وہاں ابوالفوارس نے اپنی سرگزشت سُنا کر لوگوں کو حیران کر دیا۔ اُس وقت سے اُس نے جہازرانی چھوڑ دی اور عیش و عشرت میں بسر کرنے لگا۔ آخر کار وہ مر گیا اور یہ کہانی اُس کی یادگار رہ گئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(نامعلوم)

چین

منگ آئی کی کہانی

پانچ سو سال ہوئے خاندانِ منگ کے شہنشاہ ہونگ وو کے عہد میں حیات کے شہر کوانگ چُو فُو میں ایک شخص ٹین پیلو رہتا تھا جو زہد و اتقا اور علم و فضل کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اِسی ٹین پیلو کا ایک نوجوان بیٹا منگ آئی تھا، جو اپنے ہم عمروں میں علمی قابلیت، جسمانی حسن اور نیک اطواری میں ممتاز تھا۔

جب یہ لڑکا اپنی عمر کے اٹھارھویں سال میں تھا تو ایسا ہوا کہ پیلو، اُس کا باپ چنگ ٹو کے شہر میں ناظمِ تعلیمات مقرر ہوا، اور منگ آئی بھی اپنے والدین کے ساتھ وہیں چلا گیا۔ اسی شہر چنگ ٹو کے قریب حکومت کا ایک اعلیٰ عہدہ دار اور رئیس چینگ رہتا تھا جو اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے کسی قابل معلّم کی تلاش میں تھا۔ معزز چینگ نئے ناظمِ تعلیمات کی آمد کی خبر سُن کر اس معاملے میں مشورہ لینے کے لئے اُس کے پاس آیا۔ یہاں اُسے پیلو کے قابل بیٹے سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع بھی ملا اور اُس نے منگ آئی کو فوراً اپنے خاندان کا اتالیق مقرر کر لیا۔

اب چونکہ رئیس چینگ کا محل شہر سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ اِس لئے یہی مناسب سمجھا گیا کہ منگ آئی اپنے آقا کے ہاں ہی رہے۔ چنانچہ لڑکے نے اپنی نئی اقامت گاہ کے لئے تمام تیاریاں مکمل کر لیں۔ والدین نے اُسے رخصت کرتے ہوئے اچھی اچھی نصیحتیں کیں۔ اور لاؤ تسو اور قدیم حکماء کے یہ الفاظ سنائے:۔

"حسین چہرہ ایک عالم کو مسحور کر سکتا ہے لیکن دیوتاؤں کو دھوکا نہیں دے سکتا۔
اگر تو عورت کو مشرق کی طرف سے آتے ہوئے دیکھے تو تُو مغرب کی طرف مُنہ پھیر لے اور اگر تُو عورت کو مغرب کی طرف سے آتے ہوئے دیکھے تو اپنی آنکھیں مشرق کی طرف پھیر لے۔"

اگر منگ آئی اپنی آئندہ زندگی میں اِن نصیحتوں پر عامل نہ رہ سکا تو اس کا سبب اُس کی جوانی اور اُس کے فطرتی خوش باش دِل کی بے پروائی تھا۔

وہ رئیس چینگ کے گھر میں رہنے کے لئے رخصت ہو گیا، خزاں گذر گئی اور سرما بھی۔
جب بہار کے دوسرے چاند کا زمانہ قریب آ رہا تھا۔ اور "ہاؤ چاؤ" کا تہوار قریب تھا تو منگ آئی کے دل میں اپنے والدین سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اُس نے نیک دِل چینگ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، جس نے نہ صرف اُسے اجازت ہی دی بلکہ اس خیال سے چند روپے بھی عطا کئے کہ شاید لڑکا اپنے والدین کے لئے کوئی تحفہ لے جانا چاہے۔ کیوں کہ چین میں دستور ہے کہ لوگ "ہاؤ چاؤ" کے تہوار پر اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو تحائف دیتے ہیں۔ اُس روز فضا پھولوں کی خوشبو سے معطر تھی اور شہد کی مکھیوں کی آواز ہوا میں نغمہ پیدا کر رہی تھی۔ منگ آئی کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس راہ پر وہ چل رہا ہے اُسے مدتوں سے کسی انسانی قدم نے پامال نہیں کیا، اُس پر لمبی لمبی گھاس تھی۔ دونوں طرف بڑے بڑے تناور درخت اپنی ہری ہری اور مضبوط باہیں پھیلائے سایہ کئے ہوئے تھے۔ گنجان پتے پرندوں کے چہچہوں سے تھرتھرا رہے تھے اور فضا گلاب کی خوشبو سے اس طرح معمور تھی جیسے کوئی عبادت گاہ بخور سے مہک رہی ہو۔
خوشگوار دن کی مدہوش کن مسرت منگ آئی کے دِل میں گھر کر چکی تھی۔ وہ نیلے آسمان کے تلے جھومتی ہوئی ٹہنیوں کے نیچے کلیوں کے درمیان ہوا، روشنی اور اس پر فضا سکوت سے لطف اندوز

ہونے کے لئے بیٹھ گیا ۔ وہ آرام سے بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آواز نے اُس کی توجہ اُس طرف پھیر دی۔ جہاں جنگلی شفتالو کے جوبن بھرے درخت کھڑے تھے۔ اُس نے ایک نوجوان عورت کو دیکھا جو اُن گلابی کلیوں سے بھی زیادہ خوبصورت تھی، جن میں چھپنے کے لئے وہ کوشش کر رہی تھی۔ اگرچہ منگ آئی نے صرف ایک لمحہ کے لئے اُسے دیکھا لیکن وہ اس کے چہرے کی خوب صورتی، اُس کے رنگ کی لطافت اور اُس کی اُن عریض آنکھوں کو نظر انداز نہ کر سکا جو تیتری کے پھیلے ہوئے پروں جیسے خمیدہ ابرؤوں کے نیچے چمک رہی تھیں۔ منگ آئی نے فوراً اپنی نظر پھیر لی، اور جلدی سے اُٹھ کر اپنے راستے پر ہولیا۔ لیکن وہ پتوں میں سے جھانکتی ہوئی آنکھوں کے خیال میں کچھ اس طرح کھو گیا تھا کہ جب اُس کی آستین میں سے روپے گر گئے تو اُسے خبر تک نہ ہوئی۔ ذرا سی دیر کے بعد اُس نے اپنے پیچھے ہلکے قدموں کے ساتھ کسی کو دَوڑتے ہوئے سنا، اور کسی نسوانی آواز نے اُس کا نام لے کر پکارا، حیرت سے اُس نے مڑ کر دیکھا تو ایک خوب صورت خادمہ کو پایا جس نے اُس سے کہا "حضور! میری مالکہ نے حکم دیا ہے، کہ یہ روپے اُٹھا کر آپ کو دے دوں جو آپ بے خبری میں راستے پر گرا آئے تھے" منگ آئی نے لڑکی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میری طرف سے اپنی مالکہ کو سلام کہدینا۔ پھر وہ اس شکبار سکوت میں فراموش شدہ راستے کے خوابیدہ سایوں تلے گذرتا ہوا اور خود بھی محبت کے خواب دیکھتا ہوا اپنے راستے پر ہولیا لیکن اُس کا دِل اُس خوبصورت ہستی کے لئے جسے اُس نے دیکھا پایا تھا ایک عجیب اضطراب سے دھڑک رہا تھا۔

ایسا ہی ایک خوشگوار دن تھا جب منگ آئی اُس راستے سے واپس آتے ہوئے اُسی جگہ ٹھہر گیا جہاں اُس نے ایک لمحے کے لئے اِس خوب صورت ہستی کو دیکھا تھا لیکن اس دفعہ درختوں کی ایک دورویہ قطار میں سے ایک مکان دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ کیوں کہ پہلی مرتبہ اُس نے یہ مکان نہ دیکھا تھا۔ یہ ایک دیہاتی قیام گاہ تھی جو اگرچہ عظیم الشان نہ تھی لیکن حد سے زیادہ خوبصورت تھی۔

اُس کی دھندلائے دار دہری خمیدہ چھت کی نیلی چمکدار اینٹیں، درختوں کے سبزے سے بلند ہو ہو کر آسمان کی نیلگوں روشنی میں جذب ہو رہی تھیں، اس کے ایوانوں کی سبز اور سنہری میناکاری کے مقابل سورج کی کرنوں میں نہائے ہوئے پھول اور پتے حقیر نظر آتے تھے، اور اس کے سامنے والے چبوترے کی سیڑھیوں کے اوپر چمن کے دونوں طرف چینی کے عظیم الجثہ سنگ پشت بنے تھے، منگ آئی نے گھر کی مالکہ کو کھڑے دیکھا ———— اپنی والہانہ عشق و محبت کے مجسمہ کو ———— اُسی خادمہ کی معیت میں جو اُس کی ممنونیت کا پیغام لے گئی تھی۔ منگ آئی نے دیکھا کہ وہ بھی اُسی کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ وہ مسکرائیں، اور آپس میں اس طرح گفتگو کرنے لگیں جیسے اُسی کے متعلق کچھ کہہ رہی ہیں، نوجوان اگرچہ شرمیلا تھا، لیکن ہمت کر کے اُس نے حسینہ کو دُور ہی سے سلام کیا۔ وہ حیران رہ گیا جب خادمہ نے اُسے بلانے کا اشارہ کیا۔ اُس زنگ خوردہ دروازے کو کھول کر جسے ارغوانی پھولوں والی بیلوں نے نصف تک ڈھانپ رکھا تھا، وہ اندر داخل ہوا۔ حیرت و مسرت میں غرق وہ اُس سرسبز راستہ پر ہولیا جو چبوترے کو جاتا تھا۔ جب وہ نزدیک پہنچا تو حسینہ نظر سے اوجھل ہو گئی اور خادمہ فراخ سیڑھیوں پر اُس کے استقبال کے لئے ٹھہری رہی، اور جب وہ سیڑھیوں پر چڑھ گیا تو بولی "حضور، میری مالکہ کا خیال ہے کہ آپ اُس معمولی سی خدمت کے لئے شکریہ ادا کرنے آئے ہیں جو کچھ عرصہ ہوا اُن کے حکم سے میں نے سرانجام دی تھی، وہ سلام کہتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ آپ اندر تشریف لے آئیں"۔

منگ آئی شرماتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اُس کے پاؤں سے کوئی آواز پیدا نہ ہوتی تھی کیوں کہ فرش ایسا نرم اور لچکیلا تھا جیسا جنگل کا سبزہ۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو ایک وسیع اور ٹھنڈے ملاقات کے کمرے میں پایا جو تازہ پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا، مکان میں ایک دلکش سکوت طاری تھا اُڑتے ہوئے پرندوں کے سائے روشنی کی اُن کرنوں پر پڑ رہے تھے جو بانس کی چلمنوں میں

سے گذر کر اندر آرہی تھیں، آتشیں رنگ کے پروں والی بڑی بڑی تیتریاں اندر چلی آتیں اور ایک لمحہ کے لئے منقش گلدانوں کے گرد گھوم کر پھر باہر نکل جاتیں، اور پُر اسرار جنگل میں غائب ہو جاتی تھیں۔ انہیں تیتریوں کی طرح خاموشی سے گھر کی مالکہ ایک دوسرے دروازے سے اندر داخل ہوئی اور نہایت نرمی سے لڑکے کو سلام کیا۔ جس نے اپنے ہاتھ سینے پر رکھ لئے اور جھک گیا۔ وہ اُس کے اندازے سے زیادہ لمبی تھی اور خوب صورت نرگس سے زیادہ نازک تھی۔ اُس کے سیاہ بال "چوشاگا" کی ملائم کلیوں میں گندھے ہوئے تھے۔ اُس کا زرد ریشمین لباس اُس کی حرکات سے اس طرح رنگ بدلتا تھا جیسے پانی کے بخارات روشنی کے اختلاف سے رنگ بدلتے ہیں۔

جب اخلاق و آداب کے مراسم ادا کرکے دونوں بیٹھ گئے تو عورت نے کہا "اگر میں غلطی نہیں کرتی تو میرے معزز ملاقاتی کا نام ٹین چو ہے جس کا لقب منگ آئی ہے اور جو میرے معزز رشتہ دار چینگ کے بچوں کا اتالیق ہے۔ چونکہ چینگ کا خاندان میرا اپنا خاندان ہے۔ اس لئے میں اُن کے بچوں کے اتالیق کو اپنا عزیز سمجھتی ہوں۔"

منگ آئی کو ذرا بھی حیرت نہ ہوئی، اُس نے جواب دیا "خاتون، کیا میں آپ کے خاندان کا نام پوچھنے کی جرأت کرسکتا ہوں اور اُس رشتے سے اطلاع پا سکتا ہوں جو آپ کو میرے معزز آقا سے ہے۔"

حسینہ نے جواب دیا "میرے ناچیز خاندان کا نام پنگ ہے جو شہر چنگ ٹو کا ایک قدیم خاندان ہے۔ میں "سی مان ہاؤ" کی بیٹی ہوں۔ میرا نام "سی" ہے۔ پنگ خاندان کے ایک نوجوان "خیننگ" سے میری شادی ہوئی۔ اس شادی سے میرے تعلقات آپ کے آقا سے ہوئے لیکن میرا خاوند شادی سے تھوڑا ہی عرصہ بعد مر گیا اور میں نے اپنا رنڈاپا کاٹنے کے لئے اس گوشۂ تنہائی کو اپنا مسکن بنا لیا ہے۔

اس کی آواز میں ایک مست کر دینے والی موسیقی تھی ۔جیسی ندی کے راگ یا فوارے کے ترنم میں ہوتی ہے ، اور اس کی گفتگو میں ایسی عجیب لطافت تھی جو منگ آئی نے اِس سے قبل کبھی نہ سُنی تھی ، لیکن یہ معلوم ہونے پر کہ وہ ایک بیوہ ہے منگ آئی کا بغیر کسی باقاعدہ دعوت کے اُس کے پاس ٹھہرنا مناسب نہ تھا ، اِس لئے وہ لذیذ چائے پینے کے بعد جانے کے لئے اُٹھا لیکن "سی" اُسے اِس قدر جلد رخصت کرنے پر تیار نہ تھی ۔

اُس نے کہا "نہیں نہیں ، بھائی ، تھوڑی دیر اور ٹھہرو ۔ میں عاجزانہ التجا کرتی ہوں کیونکہ اگر آپ کے معزز آقا نے کہیں سُن پایا کہ آپ یہاں آئے تھے ، اور میں نے ایک معزز مہمان کی طرح آپ کی مدارات نہیں کی ، ایسی ، جیسی میں خود اُس کی کرتی تو مجھے معلوم ہے کہ وہ سخت ناراض ہوگا کم سے کم رات کے کھانے تک تو ٹھہرو "

منگ آئی رُک گیا ، وہ دِل میں خوش تھا ، کیوں کہ "سی" اُسے اِس قدر حسین اور پیاری معلوم ہو رہی تھی کہ اُس نے کبھی کوئی چیز ایسی نہ دیکھی تھی ، اور اسے محسوس ہو رہا تھا ، کہ وہ اُس کے ساتھ اپنے باپ اور اپنی ماں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے ۔ باتوں ہی باتوں میں شام کے لمبے لمبے سائے ارغوانی تاریکی میں جذب ہو گئے شفق کی ترنجی روشنی غائب ہو گئی اور ان کوکبی ہستیوں نے جو "مشیرانِ ثلاثہ" کہلاتی ہیں ، اور جو انسانوں کی زندگی ، موت اور قسمت کی مالک ہیں شمال کی طرف سے اپنی سرد مہر اور چمکیلی آنکھیں کھول دیں ۔ "سی" کے مکان میں منقش فانوس روشن کر دیئے گئے ، اور شام کے کھانے کے لئے دسترخوان بچھا دیا گیا ۔ منگ آئی کھانے پر بیٹھ تو گیا لیکن اُسے کھانے کی طرف بالکل رغبت نہ تھی ، اُسے صرف "سی" کے حسین چہرے کا خیال تھا ، یہ دیکھ کر کہ وہ کھانا نہیں کھاتا "سی" اپنے نوجوان مہمان کو شراب پلانے پر اصرار کرنے لگی ، اور وہ دونوں مل کر کئی ساغر پی گئے ۔ یہ ارغوانی رنگ کی شراب تھی ، اِس قدر ٹھنڈی کہ جب

ساغر میں ڈالی جاتی تو باہر اُس کے گرد شبنم سی جم جاتی لیکن اس کے باوجود وہ اس قدر گرم تھی کہ اسے پی کر رگوں میں ایک آتشِ سیال دوڑنے لگتی، شراب پی کر منگ آئی کو ایسا محسوس ہؤا جیسے تمام چیزیں کسی سحر سے چمک اُٹھی ہیں۔ کمرے کی دیواریں کشادہ ہوگئیں۔ اور چھت بلند ہوگئی، زنجیروں سے لٹکے ہوئے چراغ ستاروں کی طرح چمک اُٹھے، اور "ہی" کی آواز ایسی معلوم ہونے لگی جیسے کسی مدہوش رات میں دُور سے نغمے کی آواز آئے۔ اُس کا دِل اچھل رہا تھا، اُس کی زبان کھل گئی تھی اور اُسے ایسا معلوم ہؤا کہ جو الفاظ اُس کے لبوں سے بے ساختہ نکل رہے ہیں اُنہیں کہنے کی اُسے جرأت نہ ہونی چاہیئے تھی۔ اِس کے باوجود "ہی" اُسے روکتی نہ تھی، اُس کے لبوں پر مسکراہٹ نہ تھی لیکن اُس کی لمبی چمکدار آنکھیں اُس کی تعریفوں پر مسرت سے ہنستی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور اُس کی پُرجوش نگاہِ محبت کا جواب اُسی محبت سے دیتی تھیں۔

اُس نے کہا "مجھے آپ کے یکتا فضائل و کمالات کے متعلق علم ہے، میں موسیقی جاننے کا دعوے تو نہیں کرتی لیکن تھوڑا بہت گانا میں جانتی ہوں اور اِس وقت کہ مجھے موسیقی کے ایک عالم کا شرفِ حضوری حاصل ہے، میں شرم کو بالائے طاق رکھ کر آپ سے التجا کرتی ہوں کہ آپ چند گانے میرے ساتھ مل کر گائیں، میں اِسے کوئی معمولی احسان نہ سمجھوں گی اگر آپ میرے گیتوں کو سُننا منظور فرمالیں گے۔"

منگ آئی نے جواب دیا "عزیز خاتون، احسانمندی اور ممنونیت تو میرے لئے ہے، اور حقیقت میں اِن احسانات کا شکریہ ادا کرنے سے میری زبان قاصر ہے۔"

خادمہ چھوٹے سے چاندی کے گھڑیال کی آواز پر دوڑتی ہوئی آئی اور اشعار دے کر رخصت ہوگئی۔ منگ آئی نے مسودہ اُٹھالیا اور نہایت شوق و مسرت سے اِنہیں دیکھنا شروع کیا۔ یہ پیلے زرد رنگ کے کاغذ پر لکھے ہوئے تھے جو اِس قدر ہلکا تھا جیسے مکڑی کے جالے کا

بنا ہؤا ہو، لیکن تحریر قدیم اور خوب صورت تھی، ایسی، جیسے روشنائی کے ننھے دیوتا" ہی سانگ چی زو"
کے اپنے مُوقلم سے تحریر ہوئی ہو، اور ان اشعار کے نیچے "یوٹین زِن" "کاؤ پین" اور تھاؤ مؤ" جیسے
شہرۂ آفاق شاعروں اور موسیقی دانوں کے دستخط ثبت تھے جو" تھانگ" کے خاندان سے تھے۔ مِنگ
آئی ان گرانمایہ اور نادرِ روزگار خزانوں کو دیکھ کر خوشی سے چیخ اُٹھا۔ وہ اُنہیں ایک لمحہ کے لئے
بھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔

اُس نے کہا" خاتون! یہ ایسی انمول چیزیں ہیں جو بادشاہوں کے خزانوں سے زیادہ بیش قیمت
ہیں، یہ یقیناً اُن بلند پایہ اُستادوں کے لکھے ہوئے نغمے ہیں جو ہماری پیدائش سے پانچسو سال قبل
گاتے تھے۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ یہ اَب تک محفوظ ہیں۔ کیا یہ وہی روشنائی نہیں ہے جس کے
متعلق لکھا گیا تھا" میں صدیوں تک پتھر کی طرح مضبوط رہتی ہوں اور میرے حروف روغن کی طرح
چمکتے ہیں"! اور اِس کی موسیقی کتنی دلربا ہے "کاؤ پین" کا گیت، جو شاعروں کا بادشاہ تھا، اور
آج سے پانچ سو سال پیشتر" زیچوئین" کا حاکمِ اعلٰے تھا"۔

"کاؤ پین" پیارا" کاؤ پین" سی نے آہستہ سے کہا اور اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک
پیدا ہوگئی" کاؤ پین" کی موسیقی مجھے بھی بہت مرغوب ہے۔ پیارے مِنگ آئی آؤ ہم پُرانی لَے پر
اِس کے اشعار گائیں، آہ یہ اُن دنوں کی موسیقی ہے۔ جب انسان آج سے زیادہ بہادر اور زیادہ عقلمند
تھے"۔

اور رات کی معطّر فضا میں سے اُن کی سریلی آوازیں ایک دوسری میں جاذب ہو کر ایک شیریں
وسیّال چشمے کی طرح بہہ نکلیں۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں مِنگ آئی اپنی ہمنوا کی آواز سے مسحور ہو کر
خاموش ہوگیا اور وجد کی حالت میں اس کا نغمہ سُننے لگا۔ خوشی کے آنسو اُس کے رخساروں پر بہہ نکلے
اور کمرے کے چراغ اُسے مدہم اور رقص کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔

وہ باتیں کرتے رہے ، ار غوانی شراب کے خم کے خم لنڈھاتے رہے اور تھنیگ کے زمانے کے گیت گاتے رہے ، یہاں تک کہ بہت سی رات گذر گئی ۔ ہنگ آئی نے کئی مرتبہ اُٹھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ہر مرتبہ "سی" اپنی دلکش آواز میں کسی قدیم عظیم الشان شاعر یا اُس کی معشوقہ کا افسانہ شروع کر دیتی اور وہ پھر مسحور ہو جاتا ۔ یا وہ کوئی ایسا عجیب نغمہ گانے لگتی کہ سوائے سماعت کے اُس کے تمام حواس معطل ہو جاتے ۔ اور آخر کار جب وہ شراب کے ایک پیالے پر اس کا جام صحت تجویز کرنے کے لئے رُکی تو ہنگ آئی ضبط نہ کر سکا ، اور اُس نے اپنی بانہیں اس کے خوب صورت گلے میں ڈال کر اور اُسے نزدیک کھینچکر اُن لبوں کا بوسہ لے لیا جو شراب سے بھی زیادہ سرخ تھے ۔ پھر اُن کے لب جدا نہ ہوئے ــــــــــــــــ رات گذرتی گئی لیکن انہیں اس بات کا ہوش نہ تھا۔

پرندے بیدار ہو گئے طلوع آفتاب کے ساتھ پھولوں نے بھی آنکھیں کھول دیں ہنگ آئی اپنی ساحرہ سے رخصت ہونے پر مجبور ہو گیا ۔ سی چبوترے تک اُس کے ساتھ آئی ، اور اُس کو بوسہ دیتے ہوئے بولی " پیارے ہنگ آئی جب کبھی تم سے ہو سکے یہاں ضرور آیا کرو ۔ جب تمہارا دل تمہیں آنے کے لئے مجبور کیا کرے ۔ مجھے معلوم ہے تم اُن میں سے نہیں ہو جو رازوں کو محفوظ نہیں رکھ سکتے ۔ لیکن ابھی تم نوجوان ہو ۔ ممکن ہے کہ کسی وقت بے پروا ہو جاؤ ۔ ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہماری محبت کا راز سوائے ستاروں کے کسی کو معلوم نہیں ۔ پیارے کسی زندہ انسان سے اِس کا ذکر نہ کرنا اور یہ لو اس پُر مسرت رات کی نشانی ۔"

اور اُس نے ایک خوب صورت ننھی سی چیز دی ۔ بیٹھے ہوئے شہر کا ایک مجسمہ جو زرد عقیق کا بنا ہوا تھا اور جس میں سے قوسِ قزح کی سی جھلک نظر آتی تھی ۔ ہنگ آئی نے پیار سے لیتے ہوئے اس تحفے کو چوما اور اُس ہاتھ کو بھی جس نے اُسے دیا ۔ اور کہا " پیاری ! اگر میں تمہیں دیدہ دانستہ کبھی شکایت کا موقع دوں تو دیوتا مجھے سخت عذاب میں مبتلا کریں ۔" اور اس طرح قسمیں

کھا کر وہ دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہوئے ؂

اُس صبح جب منگ آئی رئیس چینگ کے ہاں پہنچا تو اُس نے اپنی زندگی میں پہلا جھوٹ بولا۔ اُس نے کہا میری والدہ نے کہا ہے کہ رات کے وقت گھر آجایا کرو۔ کیوں کہ اب موسم خوشگوار ہے، اور اگرچہ راستہ کسی قدر زیادہ ہے، لیکن تم اب کافی مضبوط ہو، اور کھُلی ہوا اور ورزش تمہارے لئے مفید ہے۔ جو کچھ منگ آئی نے کہا چینگ نے اُس پر یقین کر دیا اور کسی قسم کا اعتراض نہ کیا۔ اِس طرح منگ آئی کو حسین "سی" کے گھر میں راتیں گزارنے کا خوب موقع مِل گیا، ہر رات وہ اُسی نشاط میں بسر کر دیتے، جس نے اُن کی پہلی ملاقات کو لطف و سرور سے بھر دیا تھا وہ باری باری سے گاتے، گفتگو کرتے اور شطرنج، عقل و تدبر کا وہ کھیل کھیلتے جسے وُو وینگ نے ایجاد کیا تھا اور جو جنگ و جدل کی نقل ہے، وہ پھولوں، بادلوں، ندیوں، پرندوں اور شہد کی مکھیوں پر خوبصورت شعر کہتے۔ لیکن ہر مرتبہ "سی" کے نغمے ہی اُس کے نوجوان محبوب سے بہتر ہوتے، جب کبھی وہ شطرنج کھیلتے تو منگ آئی کا سپہ سالار اور منگ آئی کا بادشاہ ہی محصور ہو کر مات ہوتا، جب وہ شعر کہتے تو سی کی نظمیں ترنم اور رنگینی، بندش کی چستی، اور خیالات کی رفعت کے لحاظ سے ہمیشہ بہتر ہوتیں اور جن موضوعات پر وہ شعر کہتے، وہ ہمیشہ مشکل ہوتے ـــ شعرائے "تھنگ" کے موضوع، اور جو گیت وہ گاتے وہ پانچ سو سال پہلے کے گیت ہوتے ـــ یُون چن، تھوُ مُو، اور سب سے بڑھ کر کاؤ پین کے گیت جو ایک بلند مرتبہ شاعر اور زیچوئن کا حاکم تھا ؂

اور اِسی محبت کے کھیل میں بہار آئی اور چلی گئی اور پھر تابان و درخشان خزاں اپنے سنہری بخارات اور جادو بھرے ارغوانی سایوں کے ساتھ آن پہنچی ؂

پھر غیر متوقع طور پر ایسا ہُوا کہ منگ آئی کا باپ اپنے بیٹے کے آقا کو چینگ تُوئی میں مِلا اور اُس نے پوچھا "کیا یہ ضروری ہے کہ تمہارا بیٹا ہر رات شہر میں جایا کرے، اب جب کہ سردیاں

بھی ان پہنچی ہیں؟ راستہ کافی طویل ہے، اور جب وہ صبح کے وقت آتا ہے، تو تکان سے چور ہو چکتا ہے اس برفانی موسم میں کیوں نہ تم اُسے یہیں سونے کی اجازت دے دو۔" منگ آئی کا باپ سخت متحیر ہو کر بولا" جناب، میرا بیٹا تو کبھی شہر نہیں گیا، اور نہ گرمیوں کے اِس تمام موسم میں وہ گھر آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُس نے بُری عادات اختیار کر لی ہیں اور وہ اپنی راتیں کسی بُری مجلس میں گزار رہا ہے۔ شاید وہ قمار خانوں میں جاتا ہے، یا سفینۂ گل کی عورتوں کے ساتھ مے نوشی میں محو رہتا ہے۔" لیکن حاکمِ اعلےٰ نے کہا:۔

"نہیں، ایسا گمان نہ کرو، میں نے اس لڑکے میں کبھی کوئی برائی نہیں دیکھی اور ہمارے گرد و نواح میں قمار خانے یا سفینۂ گل کی عورتیں کہیں نہیں ہیں، اور نہ کہیں کوئی عیاشی کا اڈہ ہے مجھے پورا یقین ہے کہ منگ آئی کو کوئی ہمجولی مل گیا ہے، جس کے ہاں وہ روز رات بسر کرتا ہے اور اس خیال سے کہ میں اُسے جانے کی اجازت نہ دوں گا میرے سامنے اُس نے جھوٹ بول دیا ہے، جب تک میں اِس بھید کا سُراغ نہ نکال لوں تم اُس سے کچھ نہ کہنا۔ اور آج ہی رات میں اپنے ملازم کو اُس کے پیچھے روانہ کر دوں گا، تاکہ وہ معلوم کرے کہ وہ کہاں جاتا ہے۔"

پیلوؤ فوراً اس تجویز کو مان گیا، اور اگلی صبح کو پھر آنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر چلا آیا، رات کے وقت جب منگ آئی" چینگ" کے مکان سے نکلا تو ایک نوکر بھی چپکے چپکے اس سے کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔ لیکن جب وہ سڑک کے سب سے زیادہ غیر آباد حصے میں پہنچے تو منگ آئی نظر سے اِس طرح یک لخت غائب ہو گیا جیسے اُسے زمین نگل گئی۔ بہت سی بے سُود تلاش کے بعد ملازم سخت حیرانی میں غرق گھر پہنچا، اور جو کچھ گذرا تھا بیان کر دیا، چینگ نے اُسی وقت ایک قاصد پیلوؤ کو بلانے کے لئے بھیج دیا۔

اس اثنا میں منگ آئی جب اپنی محبوبہ کے گھر میں داخل ہوا تو اُسے روتے ہوئے دیکھ کر

سخت پریشان اور مضطرب ہوا۔ سی نے اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور سسکیاں لیتے ہوئے بولی "پیارے، ہم ہمیشہ کے لئے جدا ہونے والے ہیں، ایسے وجوہ کی بنا پر جو میں تمہیں بتا نہیں سکتی، مجھے ابتدا ہی سے معلوم تھا کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ مگر اس وقت مجھے یہ مصیبت ایسی تکلیف دہ اور ناگہاں معلوم ہوئی کہ میں اپنے آپ کو رونے سے نہ روک سکی۔ آج رات کے بعد ہم کبھی ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں گے، پیارے، مجھے معلوم ہے کہ تم زندگی بھر مجھے نہ بھول سکو گے۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم ایک عظیم الشان عالم بنو گے، اور عزت و دولت تم پر بارش کرے گی اور ایک حسین اور محبت کرنے والی عورت تمہارے لئے میرے نقصان کا نعم البدل ہوگی۔ آؤ، اب ہم رنج والم کا ذکر چھوڑ دیں، اور اپنی آخری رات مسرت کے ساتھ گزار دیں، تاکہ میری یاد تمہارے لئے تکلیف دہ نہ ہو۔ اور تم بجائے میرے آنسوؤں کے میرے قہقہوں کو یاد رکھ سکو۔

اُس نے اپنے چمکدار آنسو پونچھ ڈالے۔ اور شراب، نغموں کی کتابیں، اور سات ریشمیں تاروں والی خوشنوا "کن" اُٹھا لائی۔ اور منگ آئی کو آنے والی جدائی کے متعلق ایک لفظ تک نہ کہنے دیا، اور اُس نے موسم گرما کی اُن جھیلوں کے سکون کے متعلق ایک قدیم گیت گایا جن میں سے صرف آسمان کے نیل کا انعکاس ہوتا ہے اور دل کے سکون کے متعلق بھی قبل اس کے کہ مصائب اور غم کے بادل اُس کی ننھی سی دنیا کو تاریک کر دیں۔ جلد ہی وہ شراب اور نغمے کی مسرت میں تمام غم و الم کو بھول گئے۔ منگ آئی کے لئے یہ آخری ساعتیں اُن کی پہلی پر مسرت ملاقات سے بھی زیادہ مسرت آگیں تھیں۔

لیکن صبح کی زرد اور خو[illegible] روشنی کے رُونما ہوتے ہی اُن کے غم بھی لوٹ آئے اور وہ رو پڑے۔ سی ایک دفعہ پھر اپنے محبوب کے ساتھ چبوترے کی سیڑھیوں تک آئی اور جب اُس نے اُس کا آخری بوسہ لیا تو ایک نشانی اُس کے ہاتھ میں دے دی یہ سنگِ یشب کی بنی ہوئی

ایک چھوٹی سی ڈبیا تھی جو قدیم صناعی کا ایک حیرت انگیز نمونہ تھی اور وہ آنسو بہاتے ہوئے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے *

لیکن اَب بھی منگ آئی کو یقین نہ آتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اُس سے رخصت ہو رہا ہے، اس نے سوچا" نہیں میں کل پھر آؤں گا۔ کیوں کہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور مجھے یقین ہے، کہ وہ مجھے آنے سے نہ روکے گی " انہیں خیالات میں وہ چینگ کے گھر پہنچا، اور دیکھا کہ اُس کا آقا اور اُس کا باپ ڈیوڑھی میں کھڑے ہیں۔ وہ ایک لفظ بھی بولنے نہ پایا تھا کہ" پیلاؤ" نے پوچھا:۔

"بیٹے، تو اپنی راتیں کہاں گزارتا رہا ہے "

یہ دیکھ کر کہ اُس کا جھوٹ ظاہر ہو گیا ہے۔ منگ آئی کچھ جواب نہ دے سکا اور اپنے باپ کے سامنے سر جھکائے چپکا ہو رہا۔ تب پیلاؤ نے اپنی چھڑی کے ساتھ زور سے لڑکے کو مارا اور حکم دیا کہ فوراً تمام بھید کہہ ڈالے۔ اور آخر کار کچھ باپ کے خوف سے اور کچھ اُس قانون کے ڈر سے جو کہتا ہے کہ" جو بیٹا اپنے باپ کا حکم نہ مانے اُسے بانس کی ایک سو ضربیں لگائی جائیں" منگ آئی نے اپنی محبت کا تمام ماجرا کہہ سُنایا *

لڑکے کی کہانی سُن کر چینگ نے غصہ سے رنگ بدل لیا اور کہا" لڑکے، پنگ نام کا میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ جس عورت کا ذکر تم کر رہے ہو، میں نے کبھی اُس کا نام بھی نہیں سُنا، میں نے کبھی اُس گھر کا ذکر بھی نہیں سُنا جس کے متعلق تم بیان کرتے ہو، لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم اپنے معزز باپ کے سامنے جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس تمام معاملے میں کوئی عجیب غلط فہمی ضرور ہے "

تب منگ آئی نے وہ تحفے جو سی نے اُسے دیئے تھے نکالے، عقیق کا شیر اور یشب کی ڈبیا، اور اُس حسینہ کے کہے ہوئے اشعار کے چند اصلی مسودے۔ اَب دونوں حیران رہ گئے، اُنہوں

نے دیکھا کہ یہ دونوں چیزیں اُن اشیاء کا نمونہ ہیں جو صدیوں سے زیر زمین مدفون ہیں اور جن کی نقل اتارنا موجودہ زمانے کے کسی انسان سے ممکن نہیں، اور نظمیں شاعری کے وہ شاہکار تھے جنہیں شعرائے تھینگ کی طرز پر لکھا گیا تھا۔

حاکمِ اعلےٰ نے کہا "دوست پیلاؤ، آؤ ہم ابھی لڑکے کے ساتھ وہاں چلیں، جہاں سے اُس نے یہ عجیب وغریب چیزیں پائی ہیں اور اپنے حواس کو اس بھید کی عقدہ کشائی میں صرف کریں، اِس میں کچھ شک نہیں کہ لڑکا سچ بول رہا ہے لیکن تب بھی یہ معاملہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" چنانچہ تینوں سی کے گھر کی طرف چل دیئے۔

لیکن جب وہ جنگل کے سب سے گنجان حصے میں پہنچے جہاں خوشبو سب سے زیادہ شیریں اور پتے سب سے زیادہ سبز تھے، جہاں جنگلی شفتالو کے پھل سب سے زیادہ سُرخ تھے تو درختوں کے جھنڈوں میں سے جھانک کر منگ آئی کی حالت متغیر ہوگئی اور اس کے منہ سے خوف وہراس سے ایک چیخ نکل گئی۔ جہاں ارزقی رنگ کی اینٹوں کا چھت کھڑا تھا وہاں اب صرف ہوا کا نیلگوں خلا نظر آتا تھا۔ سبز اور سنہری گلکاری کے بجائے خزاں کی سنہری روشنی میں درختوں کے پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور جہاں فراخ چبوترہ کھڑا تھا وہاں صرف ایک کھنڈر تھا۔ ایک قبر اِس قدر پُرانی اور کائی سے ایسی اٹی ہوئی کہ اُس کی لوح پر سے نام بھی نہ پڑھا جاتا تھا سی کا گھر غائب ہوچکا تھا۔

دفعتہً حاکمِ اعلیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیشانی کو پیٹ لیا، اور پیلاؤ کی طرف مخاطب ہوکر قدیم شاعر چینگ کوُ کا یہ مشہور شعر پڑھا۔

"بے شک سی تھاؤ کی قبر پر شفتالو کے پھول کھلتے ہیں"

چینگ نے سلسلہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا "دوست پیلاؤ" جس حسینہ نے تیرے بیٹے کو مسحور کیا وہ اس کے سوا کوئی نہیں جس کی قبر کے کھنڈر ہمارے سامنے موجود ہیں، کیا اُس نے کہا نہ

تھا کہ وہ پنگ خانگ سے بیاہی گئی تھی ؟ اس نام کا کوئی خاندان نہیں ہے، بلکہ پنگ خانگ شہر کی ایک کشادہ گلی کا نام ہے، اُس نے تمام باتیں عجیب معنوں میں کہی ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو مؤن ہیباؤ کی سی" کہا۔ لیکن اس نام کا کوئی انسان نہیں، اور نہ یہ کسی بازار کا نام ہے لیکن اگر ان چینی الفاظ "مؤن" اور "ہیدیاؤ" کو ملا دیا جائے۔ تو "کیاؤ" کا لفظ بنتا ہے۔ سفو، پنگ خانگ کی گلی "کیاؤ" کے بازار میں واقع ہے جہاں "تھنیگ" کی رنڈیاں رہا کرتی تھیں۔ کیا اُس نے "کاؤ بین" کے اشعار نہ گائے تھے ؟ اور کیا اُس ڈبیا اور شیر پر جو اُس نے تمہارے بیٹے کو دیئے ہیں یہ الفاظ نہیں ہیں "صناعی کا بہترین نمونہ جو فوہائی کے باشندے کاؤ کی ملکیت ہے"۔ وہ شہر اب مٹ چکا ہے۔ لیکن "کاؤ بین" کی یاد ابھی تک باقی ہے۔ کیوں کہ وہ "زیچوئن" کا حاکم اور ایک عظیم المرتبت شاعر تھا، اور جب وہ "چاؤ" میں رہتا تھا تو کیا ایک حسین عورت "سی تھاؤ" اُس کی معشوقہ نہ تھی ؟ جو اس زمانے میں اپنے حسن کی مثال نہ رکھتی تھی۔ یہی تھا جس نے اشعار کے یہ مسودے اسے تحفتہً دیئے تھے اور اسی سے صنعت کے یہ بے مثال نمونے اُسے حاصل ہوئے تھے "سی تھاؤ" اس طرح نہیں مری جس طرح دوسری عورتیں مر جاتی ہیں۔ اس کے اعضا خاک ہو چکے ہوں گے۔ لیکن وہ اب تک ان گھنے جنگلوں میں زندہ ہے اور اس کی روح اب تک اس کے سایوں میں گھومتی نظر آتی ہے"۔

چینگ خاموش ہوا تو تینوں پر ایک عجیب سا خوف طاری ہو گیا۔ صبح کی ہلکی کہر سے دُور کا سبزہ دُھندلا نظر آنے لگا، اور جنگل کی خوب صورت ویرانی میں اور اضافہ ہو گیا۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا پاس سے گذر کر پھولوں کی خوشبو سے فضا کو معطر کر گیا۔ مرجھاتے ہوئے پھولوں کی آخری ہلکی سی خوشبو سے۔ اور جب یہ گذرا تو درختوں کے پتوں سے ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے "سی تھاؤ"!

"پیلاؤ" اپنے لڑکے کے لئے سخت فکر مند ہو گیا اور اُس نے اُسے فوراً "کوانگ چوفو"

میں بھیج دیا - جہاں بعد میں منگ آئی نے اپنی قابلیت کے بل پر اعلیٰ عہدے اور عزتیں حاصل کیں،
اُس نے ایک ذی رتبہ خاندان میں شادی کی، جس سے اُس کے لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوئیں جو اپنی
نیک خصائل اور اوصاف کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے - وہ "سی تھاؤ" کو کبھی نہ بھول سکا اور یہ بھی
کہا جاتا ہے کہ اُس نے کبھی اس کا ذکر نہ کیا، وہ اُس کا ذکر اپنے بچوں سے بھی نہ کرتا جو اکثر اُس سے
ان دو خوب صورت چیزوں کے متعلق پوچھتے جو اس کی لکھنے کی میز پر پڑی رہتی تھیں، زرد عقیق
کا شیر اور یشب کی ڈبیا ×

نا معلوم

پندرھویں صدی عیسوی یا اس سے قبل

جاپان

گودی[1]
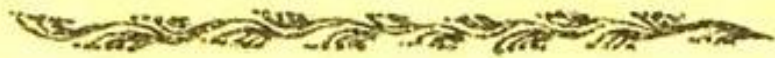
گودی طویل ہے ——— بہت طویل ———

گاڑی کی پٹڑی کی چار لائنیں آہنی پل کے شہتیروں کو سیدھی اور ترچھی کاٹتی ہوئی اِس طرح گزرتی ہیں کہ چھوٹی بڑی گیلیوں سے بچوں کی جل ترنگ کی سی شکل بن گئی ہے۔ کٹڑیوں کی درزوں میں جوتوں اور کھڑاؤں کی ایڑیاں پھنس پھنس کر رہ جاتی ہیں۔ سورج کی کرنیں ان درزوں میں سے چھن چھن کر سمندر کی تاریک لہروں پر چمک رہی ہیں۔

آسمان صاف اور گہرا نیلا نظر آرہا ہے۔ گاڑی کے ڈبے میں جہاں وہ اپنے آج ہی رخصت ہو جانے والے خاوند کے ساتھ بیٹھی تھی اُسے خیال تک نہ تھا کہ باہر تیز ہوا چل رہی ہے۔

جن رکشا سے نکل کر، جس میں وہ یوکوہاما کے سٹیشن پر سوار ہوئی اور اس گودی پر کھڑے ہوکر اُسے معلوم ہُوا کہ مارچ کی پانچویں تاریخ کی ہوا ابھی تک بدن کو کاٹتی ہوئی اور اُس کے ازومافرغل کے دامن کو اڑاتی ہوئی چل رہی ہے۔

ایک ڈھیلا ڈھالا سیم رنگ ازومافرغل اس کے بدن کو ڈھانپ رہا ہے، وہ بدن جو اس کے آج ہی سفر پر روانہ ہو جانے والے خاوند کے بچےّ کا حامل ہے، آج، وہ دن جو اس کے خلوت گزینی کے مہینے سے بہت قریب ہے۔ اُس کے بال سوکوسٹسو میں چھپے ہُوئے ہیں اور اُس کا گلوبند سفید ریشم

[1] لوہے یا لکڑی کی وہ تعمیر جو نیچے سے کھلی ہوتی ہے اور خشکی سے جہاز تک پہنچتی ہے۔

کا ہے۔ وہ ہلکے سبز رنگ کی پھندنے دار چھتری لئے ہوئے اپنی چار پانچ خادماؤں میں گھری ہوئی چلی جا رہی ہے۔

گودی طویل ہے ——— بہت طویل ———

بڑے بڑے جہاز گودی کے دائیں اور بائیں لنگر انداز ہو رہے ہیں۔ جن میں سے بعض پر سیاہ اور بعض پر سفید روغن کیا گیا ہے۔ یہ جہاز ہوا کے لئے روک بن گئے ہیں۔ جب کبھی وہ جہازوں کے درمیانی خلا کے پاس سے گذرتی ہے، ہوا کا ایک تیز جھونکا اُس کے ازو ما فرغل کے دامن اُڑانا شروع کر دیتا ہے۔

دو سال ہوئے اُس کے رئیس شوہر نے یونیورسٹی سے ادب کی اعلیٰ سند حاصل کرنے کے فوراً ہی بعد اس سے شادی کی تھی۔ پچھلے سال اس کا پہلا بچّہ پیدا ہوا تھا — ایک ہیرے جیسی خوبصورت شہزادی۔ سال کے آخر میں اُس کا خاوند شاہی دربار میں حاکم دستور مقرر ہوا اور اب وہ سرکاری کام پر لندن جا رہا ہے۔

بھورے رنگ کا نیا اوورکوٹ پہنے اور رخمدار دستے والا بید گھماتے ہوئے اُس کا شوہر گودی سے جلد جلد گزر رہا ہے۔ اُس کا نائب بھی جو اُس کے ہمراہ جا رہا ہے اور جس کا سر اُس کے قد سے نکلتا ہوا ہے اُسی قسم کا لباس پہنے اُس کے پہلو پر تیز تیز چل رہا ہے۔

وہ فرانسیسی جہاز جس پر اُس کا شوہر سفر کرنے والا ہے گودی کے انتہائی سرے پر دائیں جانب ٹھیرا ہوا ہے۔

ایک بلند سی چوکی گودی پر بنی ہے۔ اِس چوکی کو ایک تختے کے ذریعہ سے جہاز کے ساتھ ملایا گیا ہے۔

وہ اُن کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ چلی [illegible] ہے۔ اُس کا شوہر اور شوہر کا رفیقِ سفر اب تختے

کوٹے کر کے جہاز میں داخل ہو رہے ہیں۔

بہت سے لوگ جن کی نظریں انہیں کی جانب اٹھ رہی ہیں گودی پر جا بجا کھڑے ہیں۔ تقریباً یہ سب کے سب وہ لوگ ہیں جو اُس کے شوہر اور اُس کے نائب کو الوداع کہنے آئے ہیں شاید اس جہاز میں سفر کرنے والے لوگوں میں اتنی اہم شخصیت اور کسی کی نہیں ہے اور نہ کسی اور کی طرف اتنی آنکھیں لگ رہی ہیں۔

بعض لوگ اس بلند سی چوکی کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے رفقا کا انتظار کرتے ہیں بعض اس جگہ کھڑے ہیں جو چوکی کے ذرا سامنے واقع ہے اور جہاں رسّے اور میخیں پڑی ہیں۔ ان لوگوں میں وہ بھی ہیں جن سے اُس کے شوہر کے بڑے اچھے مراسم ہیں، اور وہ بھی ہیں جن کو اس سے تھوڑی بہت شناسائی ہے لیکن اس صاف اور روشن فضا میں اُن کے چہرے مرجھائے ہوئے سے کیوں ہیں؟ یا یہ صرف اُس کی بیوی کا اپنا خیال ہے۔

گودی طویل ہے ——— بہت طویل ———

آہستہ آہستہ اُسکے پیچھے جاتے ہوئے اچانک اُس کی نگاہ داہیں طرف اُٹھ جاتی ہے جہاں جہاز کی بہت سی گول گول کھڑکیاں نظر آ رہی ہیں ایک کھڑکی میں سے کچھ عورتوں کے چہرے اور سینے نظر آ رہے ہیں۔ تین ان میں سے تیس سے چالیس برس کی عمر کی ہیں، اور سب کے سینے سفید کپڑے سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ یہ ضرور جہاز کی خادمائیں ہونگی۔ یہ اس جہاز کی خادمائیں ہیں جس پر اُس کا شوہر سفر کر رہا ہے اس خیال سے ان ادنیٰ درجے کی عورتوں پر بھی اُسے رشک ہوتا ہے۔

ایک عورت جہاز کے کنارے پر کھڑی گودی کی طرف دیکھ رہی ہے اُس نے ایک بڑی سی ٹوپی پہن رکھی ہے جس پر سفید کپڑے کا پٹکا ہے اور اُس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک چھوٹا سا بیگ ہے۔ اُس کی خمدار ناک کے اُوپر اور شکن در شکن چہرے میں دو چمکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں

ہیں جو کسی تصویر میں سیاہی کے دو دھبوں کی طرح نظر آ رہی ہیں۔ وہ کوئی بہو دن معلوم ہوتی ہے
وہ بھی غالباً کوئی مسافر ہے جو اسی جہاز پر کہیں جا رہی ہے۔ اس پر بھی اُسے رشک ہوتا ہے۔

گودی طویل ہے ——— بہت طویل ———

آخر کار وہ بھی تختے کے قریب پہنچ جاتی ہے وہ بڑی احتیاط سے اپنے جسم کو لے جا رہی ہے جو از دما فر غل کے نیچے اُس کے شوہر کے دوسرے بچے کا حامل ہے۔ اور وہ اس بڑے سیاہ جہاز کے عرشے پر اترتی ہے۔ وہ اپنی چھتری ایک خادمہ کے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔

اُن لوگوں کے ساتھ جو الوداع کہنے آئے ہیں اور جو پہلے ہی سے عرشے پر موجود ہیں وہ جہاز کے کنارے کنارے چل کر اس کی پیشانی کی طرف پہنچتی ہے۔ راستے کے خاتمے پر مسافروں کے کمرے واقع ہیں، جن کی تعداد ستائیس سے بڑھ کر اب انتیس ہو چکی ہے۔

اُس کے شوہر کا نائب دروازے پر کھڑا ہے اور اس سے کہتا ہے "یہ کمرہ ہے! محترم خاتون"

وہ کمرے میں نظر ڈالتی ہے تو اُسے دو پلنگ نظر آتے ہیں جن کے نیچے وہ صندوق اور اسباب پڑا ہے جس سے اُس کی نظریں خوب آشنا ہیں۔ ایک پلنگ کے سامنے اُس کا شوہر کھڑا ہے۔

"دیکھ لو، محترم خاتون، اس طرح کا کمرہ ہے"

ہاں، اس کمرے کا اسے اچھی طرح معائنہ کرنا چاہئے۔ اُس کے شوہر کے طویل سفر میں یہی کمرہ ہے جہاں اُس کے خواب آیا جایا کریں گے۔

ایک شخص جو بظاہر کپتان معلوم ہوتا ہے اگر اُس کے شوہر سے فرانسیسی زبان میں مخاطب ہوتا ہے اور اُسے جہاز کے سیلون کی طرف لے جاتا ہے وہ بھی اپنے شوہر اور اُس کے نائب کے پیچھے پیچھے جاتی ہے اور کمرے میں داخل ہو جاتی ہے۔

یہ ایک وسیع اور خوبصورت کمرہ ہے۔ جا بجا میزیں لگائی گئی ہیں، اور ہر میز پر پھولوں کی ایک

ٹوکری رکھی ہے .... رفتہ رفتہ وہ سب لوگ جو الوداع کہنے آئے ہیں کمرے میں جمع ہو جاتے ہیں۔

اُس شخص کے حکم سے جو بظاہر کپتان معلوم ہوتا ہے ایک خادم گلابی رنگ کی بہت سی پیالیاں لے کر آتا ہے، اور، اُن میں شمپین ڈال کر تمام لوگوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک اور خادم اس قسم کے کیک ایک رکابی میں رکھ کر لاتا ہے جیسے ملائی کی برف کے ساتھ دیئے جاتے ہیں اور اُن کو سب لوگوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

لوگ پیالے لے کر یکے بعد دیگرے چلے جاتے ہیں اور اُس کے شوہر اور شوہر کے رفیق سفر کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر "یہ سفر تمہیں مبارک ہو" کہہ کر چڑھا جاتے ہیں۔

میز کے پاس ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھی ہوئی وہ اس وقت کا انتظار کر رہی ہے جب مبارکبادوں کا سلسلہ ختم ہو۔ ان مصروف لمحوں میں کبھی کبھی اُس کا شوہر آنکھ اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھ لیتا ہے۔ لیکن اتنے لوگوں کے سامنے وہ اس سے اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور وہ بھی اتنے لوگوں کے سامنے کون سی بات ہے جو کہہ سکتی ہے۔

گھنٹی بجتی ہے۔ اُس کے شوہر اور اُس کے ہم سفر کو لوگ الوداع کہہ کر ایک ایک کر کے باہر نکل رہے ہیں۔ وہ بھی اپنے شوہر اور اُس کے رفیق کو سلام کر کے لوگوں کے پیچھے پیچھے چلی آتی ہے۔ اب پھر خطرناک تختے سے گزر کر وہ گودی پر اترتی ہے۔ خادمہ سے اپنی ہلکی سبز رنگ کی چھتری لے لیتی ہے اور اسے کھول لیتی ہے۔

اُس کا شوہر اور شوہر کا ہم سفر جہاز پر کھڑے اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ بھی اپنی چھتری کے نیچے سے اُن کی طرف دیکھ رہی ہے۔ جب وہ اوپر کو تکتی ہے تو اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کی آنکھیں بڑی ہوتی جا رہی ہیں۔

پھر گھنٹی بجتی ہے۔ چند فرانسیسی ملاح تختے سے رسّی باندھ رہے ہیں۔ ایک جاپانی مزدور اُس

اونچی سی چوکی پر کھڑا ہے اور تختے کو چوکی پر سے اتارنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اُس رسّی سے لٹک کر جسے جاپانی مزدور کھینچ رہا ہے آخر تختہ جہاز سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔

شہر ٹوکیو کی دوپہر کی توپ گونجتی ہے۔ اِس کے ساتھ ہی جہاز جس کے پیٹ میں سے کچھ دیر سے ایک شورِ عظیم اُٹھ رہا تھا خاموشی سے حرکت کرنے لگتا ہے۔

دو بوڑھے یورپین جو میاں بیوی معلوم ہوتے ہیں جہاز کی حد کے قریب کھڑے ہیں۔ وہ اس سفید مُو آدمی سے کوئی خوش آیند بات کر رہے ہیں جو گودی پر کھڑا ہے اور جس کا ایک پاؤں اس آلہ پر ہے جس سے رسّی لپیٹی جاتی ہے۔ اُنہیں جدائی کا کوئی غم معلوم نہیں ہوتا۔

یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جہاز حرکت کر رہا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گودی حرکت کر رہی ہے۔ وہ مقام جہاں اُس کا شوہر کھڑا ہے اُس مقام سے جہاں وہ کھڑی ہے اسے دور بہت دور معلوم ہو رہا ہے۔ اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کی آنکھیں بڑی ہوتی جا رہی ہیں۔

جو لوگ انہیں رخصت کرنے آئے تھے اُن میں سے بعض کچھ دیر اَور اُن سے قریب رہنے کے لئے دوڑ دوڑ کر گودی کے کنارے کی طرف جا رہے ہیں۔ مگر وہ ایسی خلافِ حیا حرکت نہیں کر سکتی یکایک کوئی سفید سی چیز جہاز سے لہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک رومال تھا اور اُسے وہی عورت ہلا رہی تھی جس نے سفید ٹِکلے سے سجی ہوئی بڑی سی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ایک لمبا آدمی گودی کے کنارے پر کھڑا ہے۔ اُس نے سرخ واسکٹ اور کمائے ہوئے چمڑے کی جُوتی پہن رکھی ہے۔ وہ بھی ایک سفید رومال ہلا رہا ہے۔ غالباً یہ بھی متاہل زندگی کی جدائی ہی کا ایک نظارہ ہے۔

ان دونوں کی طرف دیکھ کر اب ہر طرف سے رومال ہل رہے ہیں۔ جو لوگ اُس کے رئیس شوہر کو رخصت کرنے آئے ہیں وہ بھی سفید رومال ہلا رہے ہیں۔ اُس کے پاس بھی اپنا باریک رومال ہے جسے وہ اپنی آستین میں ڈال کر لائی ہے لیکن وہ یہ خلافِ حیا حرکت نہیں کر سکتی۔

جہاز نے گودی کی حدود سے نکل کر اپنا رُخ ذرا دائیں طرف موڑا۔ وہ جگہ جہاں اُس کا شوہر اور شوہر کا رفیقِ سفر کھڑے تھے آخر اب نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ پھر بھی اسے دنبالۂ جہاز پر پندرہ یا سولہ سال کا ایک لڑکا نیلا لباس پہنے نظر آ رہا ہے۔ آہ، فرانس میں وہ کون سی ماں کی آنکھوں کو روشن کرنے جا رہا ہے؟ یا اُس کے ماں باپ موجود ہی نہیں؟ وہ یہاں کھڑا کس چیز کی طرف دیکھ رہا ہے؟

آہستہ سے وہ مڑی اور اپنی خادماؤں سمیت چل پڑی۔

گودی طویل ہے —— بہت طویل ——

اُس جگہ جہاں ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی سیاہ رنگ جہاز کھڑا تھا زرد دھوپ کی شعاع پڑ رہی ہے اور پانی فلوسِ ماہی کی طرح چمک رہا ہے۔

موری اوگوائی